بیتے پل کا سایہ

ہما کوکب بخاری

ول ———— ۲۰۰۷ء
ع ———— یوایند می پرنٹرز، لاہور
وزنگ ———— عاطف کمپوزر۔ لاہور
ت ———— ۲۵۰ روپے

ISBN 978-969-517-256-8

اسٹاکسٹ
علی بُک سٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور

پیش لفظ

''جیتے پل کا سایہ'' میرا دوسرا شائع شدہ ناول ہے۔ اس کے کردار آپ کو اپنے اردگرد چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ میں سے خود کوئی اس ناول کا کردار ہو۔

ہم میں سے بیشتر لوگوں کو یہ گلہ رہتا ہے کہ ہمیں کوئی سمجھ نہیں پاتا لیکن یہی گلہ کرنے والے ہم میں سے بیشتر لوگ خود بھی کسی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ دھوکے، فریب یا وقتی جذباتیت کا شکار ہو کر ہم کسی کی زندگی تباہ کر کے آگے چل پڑتے ہیں اور بھول کر بھی پلٹ کر نہیں دیکھتے کہ جس کی زندگی کو ہم نے اپنے ہاتھ سے تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا، اس کے ساتھ کیا بیتی۔ ہاں، ہم بھول جاتے ہیں لیکن قدرت کبھی نہیں بھولتی اور گزرا وقت ایک روز اچانک ہی ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ گزرے وقت کی یہ آمد ہمارے زوال پر مہر ثبت کر دیتی ہے

یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ ایک ایسی عورت کی بھی کہانی ہے جو محبت کے نام پر دھوکے اور فریب کا شکار ہو کر ساری زندگی آزمائشوں میں مبتلا رہی۔ یہ ایک ایسے مرد کی بھی کہانی ہے جو عقل کو دل کے پاس کبھی گروی نہیں رکھتا؛ جسے زندگی میں آگے بڑھنا ہوتا ہے اور اس کے لئے محبت تو کیا وہ کسی بھی چیز کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتا۔

یہ ایک ہی کہانی ہے، ایک ہی زندگی کی کہانی ہے لیکن اس میں بہت سے کردار ہیں اور ایک ہی واقعہ کو دیکھنے کا ہر ایک کا زاویہ مختلف ہے۔ زاویہ نظر کا یہ فرق اس کہانی کی بنیاد ہے۔

ایک معصوم سی لڑکی جس کے لئے ''ناجائز اولاد'' ہونے کا انکشاف اس کے حواس معطل کرنے کے لئے کافی ہے' اور پھر اپنے دل میں اپنے والدین سے نفرت لئے وہ ان کی تلاش

ی کھڑی ہوتی ہے۔ان میں سے کون کتنا گناہگار ہے اور کتنا مظلوم' یہ سب اس کے لئے
یاتیں ہیں۔اس کے لئے اہم ہے تو بس یہ کہ وہ اپنے ماں باپ کو ڈھونڈ کر ان سے گلہ کر
ں پر اپنی نفرت کا لاوا بہا کر اپنے بے چین دل کو سکون دے سکے کیونکہ اس کے نزدیک
نی پُرسکون زندگی میں لوٹنے کی یہی ایک صورت ہے۔

وہ عورت، جو محبت کے نام پر لوٹ لی گئی' جسے دربدر بھٹکنے کے بعد ایک پناہ گاہ میسر آئی'
بھری چادر اس کے سر پر رکھی گئی' ایک گھر ملا، چاہنے والے شوہر کا ساتھ نصیب ہوا' لیکن
بیٹی کو ایک لمحے بھر کو بھی نہ بھول پائی جسے اس نے اس کی پیدائش کے ساتھ ہی کسی کے
ے کر دیا تھا۔ ہر خوشی ملنے کے باوجود اس کے اندر سکون کا ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکا۔اور پھر
وز بیتا کل اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

وہ مرد جو ہمدردی کو محبت سمجھ بیٹھا۔جس نے وقتی جذبات کا شکار ہو کر لوٹا اور آگے بڑھ
زندگی کسی ایک حماقت کی وجہ سے تباہ کر دینا کون سی عقل مندی ہے؟ اسے آگے بڑھنا
ت آگے پھر بھلا ان چند لمحوں کی حیثیت ہی کیا تھی؟ سو وہ بہت آگے نکل گیا۔ اعلیٰ
ی نوکری' خوبصورت بیوی' من پسند طرزِ زندگی لیکن آخر زندگی میں وہ سکون کیوں نہیں تھا
ب سے اہم تھا؟ اسے خبر نہیں تھی کہ اس بے سکونی کی جڑیں تو ماضی کے ان چند لمحوں میں
ں جن پر وقت کی گرد نے بہت سی تہیں ڈال دی تھیں' لیکن پھر ایک روز بیتا کل ایک
بن کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

یہ کہانی میں نے بہت پہلے خواتین ڈائجسٹ میں قسط وار صورت میں لکھی تھی۔
ت میری اب تک لکھی ہوئی کہانیوں میں سے یہ آخری کہانی ہے۔ میں علی میاں پبلی
ی مشکور ہوں جنہوں نے میرے تمام تخلیقاتی کاموں کو جمع کر کے انہیں شائع کرنے کا
م کیا ہے۔

ہما کوکب بخاری

انتساب

اپنی امی جان کے نام!

اللہ ان کا محبت بھرا سایہ ہمیشہ ہم سب پر قائم رکھے! (امین)

جو زندگی کی تاریکیوں میں میرے لئے ہمیشہ روشن مینار کی صورت رہیں،
جنہوں نے زندگی کی ہر کٹھنائی اپنے اوپر برداشت کی لیکن مجھ پر کبھی آنچ نہ آنے
دی، جنہوں نے سخت دھوپ سہی لیکن مجھ تک کبھی تپش نہ پہنچنے دی۔

ہما کوکب بخاری

میں ایک عورت ہوں۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر کنگھی میں پھنسے بالوں کے گچھے میں چاندی کا تار دیکھتی ہوں تو عام لوگوں کی طرح مجھے عمر بیتنے کا کوئی غم نہیں ہوتا بلکہ میرے اندر اطمینان اُتر آتا ہے۔ جیسے جیسے میرے بالوں میں چاندی اُترتی ہے بھیڑیے مجھ سے دور ہونے لگے ہیں۔ میں جو گرتی سنبھلتی رہی ہوں' اب دو گھڑی کہیں سانس لینے کو بیٹھ سکتی ہوں۔

میرا کبھی کوئی نام نہیں رہا۔ مگر فقط ایک عورت جسے آدم کی خوشی کے لیے تخلیق کیا گیا تھا۔ اس کا جی بہلانے' اسے تنہائی سے بچانے کے لیے۔ اتنے برسوں میں نے یہی کام کیا ہے اور ہمیشہ یہی کرنا ہوگا۔

اس سفر میں' میں نے بہت سے مرد دیکھے ہیں محسوس کیے ہیں' ہر روپ میں۔

تب جب میں نے آنکھ کھولی تھی' تب جب پہلی مرتبہ خود کو اوڑھنی سے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ تب جب پہلی مرتبہ اچانک دل میں گھنٹیاں سی بجی تھیں۔ تب جب تاریک راتوں کا سفر شروع ہوا' تھا تب جب اُجالوں نے میرا ہاتھ تھاما تھا اور اب تب تک دیکھتی رہوں گی جب تک آنکھ میں روشنی کی کرن اور جسم میں آخری سانس باقی ہے۔

لیکن کبھی بالکل اچانک کرسی پر جھولتے ہوئے میں رُک جاتی ہوں۔ روئی کے گالوں کی طرح گورا' نرم' ننھا منا بے لباس جسم میری نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ رونے کی وہ آواز مجھے جکڑ لیتی ہے جو شاید اپنے اس دنیا میں آنے کا ماتم کر رہی تھی۔

مگر اگلے ہی لمحے میں اپنا سر جھٹک دیتی ہوں۔ کچھ باتیں بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔

☆======☆======☆

میں مرد ہوں جس کے لیے دنیا تخلیق کی گئی۔ جس کی راحت اور خوشی کے لیے صنفِ نازک کو بنایا گیا۔ میرا کوئی نام نہیں' مگر فقط ایک مرد۔

یہ دنیا خوبصورت ہے اور میں طاقتور۔ میں ہر خوبصورتی سے حصہ وصول کر سکتا ہوں کہ یہ میرا حق ہے۔ کائنات میرے لیے ہی وجود میں آئی تھی۔ میں ہر چیز فتح کر سکتا ہوں کہ مجھ میں طاقت ہے۔

برسوں سے میرے گرد میلہ سا لگا ہے۔ رنگین آنچلوں کی ہوا' رنگ و بو کا سیلاب اور قہقہوں کے جلترنگ۔

مگر ان سب کے درمیان کبھی بالکل اچانک میں چونک جاتا ہوں۔ کچھ دُھندلے دُھندلے سے عکس نگاہوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔

''کیا وہ خوبصورت' انوکھی رات وہیں تمام ہو گئی۔ یا اس کا کوئی نشان باقی ہے۔'' میں سوچتا ہوں۔

پھر سر جھٹک دیتا ہوں۔ اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔

کیونکہ میں مرد ہوں۔

☆======☆======☆

میں اولاد ہوں۔ ایسی اولاد جسے نہ ماں قبول کرتی ہے نہ باپ۔ جس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ مگر فقط ایک ''ناجائز'' جو مرد اور عورت کے لمحاتی تعلق سے وجود میں آتی ہے اور ان کے گناہ کا ثبوت بن کر رہ جاتی ہے۔

فقط گناہ کا ثبوت۔ تعلق کو رشتے میں بدلنے کے لیے تین کاغذ اور دو بول کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھے دنیا میں لانے والوں کے بیچ کاغذ اور بول کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ میں چند سیاہ لمحوں کی نشانی ہوں۔ اس سے آگے کچھ بھی نہیں۔

☆======☆======☆

''مہر نگار۔''

''رومیو کو بسکٹ کھلاتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ممی گیراج میں کھڑی تھیں۔

''جی ممی!'' میں نے وہیں سے کہا۔

''میں جا رہی ہوں۔ شاید کچھ دیر ہو جائے۔ تم گیٹ سے باہر نہیں نکلو گی۔'' انہوں نے

اپنے پرس میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے مجھے ہدایات دیں۔

میں ان کے قریب چلی آئی۔

''ممی! آپ میری فکر بالکل مت کیا کریں۔ میرے ساتھ رومیو ہوتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں ہو سکتی کہ میرے قریب سے گزر بھی سکے۔'' میں نے فخر سے اپنے پاس کھڑے رومیو کی طرف دیکھا۔

''میں تم سے کیا کہہ رہی ہوں۔ گیٹ سے باہر نہیں نکلنا۔'' انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور دوبارہ اپنے پرس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''آل رائٹ۔'' میں نے با دلِ نخواستہ کہا۔

ممی نے اپنے پرس سے کار کی چابی برآمد کی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر ہدایات جاری کیں۔

''اب اندر جاؤ اور فیکٹو رائزیشن والا چیپٹر ریوائز کرو۔ میں واپس آ کر ٹیسٹ لوں گی۔''

''ممی! باہر لان میں بیٹھ کر ریوائز کر لوں۔''

''تم ایک مرتبہ بات کیوں نہیں سمجھتی ہو؟ کتنی بار کہا ہے کہ باہر لان میں تم میرے یا اپنے پاپا کی موجودگی میں ہی نکل سکتی ہو۔ اب میرے سامنے اندر جاؤ۔ اسکول سے چھٹی کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پڑھائی کی بھی چھٹی ہو گئی۔ اور خدا کے لیے اس کتے کو باندھو۔ سارے گھر میں دندناتا پھرتا ہے۔'' انہوں نے کار اسٹارٹ کی۔

''جی ممی۔'' میں نے پھر با دلِ نخواستہ کہا۔

رومیو کو باندھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہی تو میرا سب سے اچھا دوست تھا۔ اپنے ساتھ میں اسے بھی اسٹڈی میں لے آئی۔ شیشے کی دیوار کے پار سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی اور ممی کی کار بھی ان میں شامل ہو چکی تھی۔ میں نے گہرا سانس لے کر رومیو کی طرف دیکھا۔

''رومیو مجھ سے میتھس نہیں پڑھا جاتا پھر بھی پتا نہیں ممی کیوں مجھے نیوٹن بنانا چاہتی ہیں۔ جاتے جاتے ٹی وی بھی اسٹور میں بند کر گئی ہیں۔ دیکھو یہ ہوتا ہے اس گھر میں میرے ساتھ' پتا نہیں اس کمبخت آرکیٹیکٹ کو بھی کیا سوجھی تھی کہ لاؤنج کے ساتھ ہی اسٹور بنا دیا۔''

میں نے کتاب کھولی۔

''اب یہی دیکھو' کیا یہ کوئی انسانی زبان ہے؟'' میں نے کتاب رومیو کے منہ کے

نے کر دی اور وہ زبان نکالے تیز تیز سانس لیتا ہوا اس صفحے کو دیکھے گیا جس پر فیکٹورائزیشن
سوال لکھے نہیں بلکہ بکھرے ہوئے تھے۔

''کیا فائدہ۔'' میں نے کتاب بند کر کے میز پر پھینک دی۔ ''یوں بھی مجھے یہ چیپٹر نہیں
۔ ابھی پڑھ لیا تب بھی نہیں آئے گا۔ پھر کیا فائدہ مغز ماری کرنے کا' لیکن رومیو تم خود بتاؤ'
ب جو اس گھر میں میرے ساتھ ہوتا ہے' کیا یہ انصاف ہے؟
ایک ایک دوست کا شجرہ کھنگالا جاتا ہے۔ کسی کا فون آ جائے تو بات نہیں کر سکتی۔ کسی کو
کرلوں تو جواب طلبی ہو جاتی ہے۔ میتھس میں ذرا سا فیل ہو جاؤں تو دل کا دورہ پڑنے لگتا
۔ باہر لان میں نکلوں تو طوفان آ جاتا ہے۔ یار' اسکول اور گھر کے علاوہ بھی تو زندگی ہوتی
ہے ناں۔ قسم سے تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو اب تک میں پاگل ہو چکی ہوتی۔''

وہ ممنونیت سے میرے پاؤں چاٹنے لگا۔

''کتنا مذاق بنتا ہے فرینڈز میں۔ اتنی مزے مزے کی باتیں کرتی ہیں لڑکیاں اور
ے پاس بتانے کو اس کے علاوہ کچھ ہوتا ہی نہیں ہے کہ کل رات کا کھانا میری پسند کا نہیں
ور ممی نے میرے آنسوؤں کی پروا کیے بغیر زبردستی مجھے بینگن ہی کھلوائے' ظاہر ہے اس
پر تو سب ہنستے ہی ہیں ناں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا سعدیہ فوراً کہتی ہے۔

''تم گھر بیٹھ کر بینگن ہی کھایا کرو۔ ہمارے درمیان تمہارا کیا کام؟''

ویسے یہ تو مجھے پتا ہے کہ سعدیہ مجھ سے بہت جلتی ہے۔ سب فرینڈز نے بھی مجھے بتایا
۔ فرینڈز کہتی ہیں کہ مہر نگار تم خوبصورت ہو' اسی لیے سعدیہ تم سے جلتی ہے اور ایسی باتیں
تی ہے۔ اصل میں وہ جس لڑکے سے دوستی کرنا چاہتی ہے' اسے میں زیادہ اچھی لگی۔ مگر
یں تو معلوم ہے ناں رومیو کہ مجھے صرف وہی اچھا لگے گا اور میں صرف اسی لڑکے سے دوستی
وں گی جو تمہارے ساتھ ٹھہر سکے۔ وہ بیوقوف سالز کا تمہیں دیکھتا تو اس کا ہارٹ فیل ہو
۔ بھلا میں ایسے لڑکے کو کہاں گھاس ڈالتی ہوں لیکن سعدیہ بہت گھنی ہے اس نے دل میں
یہ بات رکھ لی ہے۔

بدلہ تو خیر میں نے بھی اس سے لیا تھا۔ جب وہ اپنے بوائے فرینڈ کی تصویریں سب کو
رہی تھی تو کیسا معصوم سا منہ بنا کر پوچھا تھا۔

''سعدیہ اپنے بھائی کی تصویریں لائی ہو؟ کتنی شکل ملتی ہے تم سے۔''

سب لڑکیاں تو ہنس پڑی تھیں لیکن خود سعدیہ کو کتنا تاؤ آیا تھا۔

''تم اپنی ممی کے آرڈرز پر بینگن کھاؤ کیونکہ تم صرف یہی کر سکتی ہو۔'' اس نے تصویریں سمیٹیں اور غصے سے پاؤں پٹختی کنٹین کی طرف چلی گئی۔

حالانکہ ایک ہی مرتبہ میں نے بینگنوں والی بات کہی تھی لیکن سعدیہ نے تو یہ بات پکڑ ہی لی۔ تم نے تو اسے دیکھا ہے ناں رومیو۔ تم بتاؤ' اسی لیے وہ ایسی باتیں کرتی ہے ناں کیونکہ مجھ سے جلتی ہے۔ ہیں ناں؟

اچھا میرے ساتھ آؤ۔'' میں اسٹڈی سے نکل کر بھاگتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں پہنچی اور باتھ روم کا دروازہ کھول کر ڈریسنگ روم کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ رومیو بھی میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''مجھے خود کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ بس اگر بال کٹ جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے۔ کتنا شوق ہے مجھے بال کٹوانے کا۔ ممی کٹوانے ہی نہیں دیتیں۔ میں کہنا چاہتی ہوں کہ ممی بال میرے ہیں آپ کے تو نہیں۔ اپنے تو اتنے اچھے اچھے کٹوا لیتی ہیں کبھی میں نے روکا؟ یہ بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے لیکن مجھے پتا ہے کہ میں نے ذرا بھی زبان کھولی تو بس خیر نہیں۔

میری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ ایسا نیلا رنگ تو ہالی وڈ کی فلموں کی ہیروئنوں کی آنکھوں کا بھی نہیں ہوتا۔ شکر ہے اتنی خوبصورت ناک میں ڈائمنڈ کی لونگ ڈالنے کی اجازت تو دی۔ یہ بھی ممی کب اجازت دیتی تھیں۔ بھلا ہو پاپا کا کہ کہیں تو ممی کے سامنے ان کی زبان بھی کھلی ورنہ ممی تو کچھ بھی کرتی رہیں میرے ساتھ' پاپا کندھے اچکا کر اُٹھ جاتے ہیں۔

پتا نہیں لپ اسٹک لگانے کی کب اجازت ملے گی۔ ممی کہتی ہیں پڑھائی کے بعد۔ مجھے یقین ہے کہ پڑھتے پڑھتے ہی میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔ ممی تو مجھے اتنا ہی پڑھانا چاہتی ہیں۔ اس مصیبت سے میری جان نہیں چھوٹے گی۔

''آؤ رومیو! چپکے سے ممی کے ڈریسنگ روم سے لپ اسٹک لے آئیں۔''

میں نے باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بُرکتے کہیں دکھائی نہیں دی۔ وہ بہت ہی چغل خور تھی۔ اس کی نظر سے بچ کر میں ممی پاپا کے بیڈ روم میں داخل ہوئی اور رومیو کے آنے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔

"سنو رومیو! تم نے بیڈ پر نہیں چڑھنا' نہ ہی صوفے پر بیٹھنا ہے۔ بس میرے ساتھ ساتھ رہنا۔ ایک تو ممی کو ضرور پتا چل جاتا ہے جب تم ان کے بیڈ روم میں آتے ہو۔ اتنی ڈانٹ پڑتی ہے کہ مہر نگار' گھر کا کوئی کونہ تو چھوڑ دو جہاں نماز پڑھی جا سکے۔ اس لیے تم نے ممی کی نماز والی جگہ پر نہیں جانا۔ بس میں لپ اسٹک لگا لوں۔ شاید آئی لائنر اور مسکارا بھی لگا لوں۔ تم دھیان رکھنا۔ کوئی دروازہ کھولے تو بھونک کر خبردار کر دینا۔ باہر گیلری سے گزرے تو پلیز خاموش ہی رہنا۔ خواہ مخواہ شامت آ جائے گی۔"

اس نے دُم ہلا کر مجھے یقین دلایا کہ وہ میری ہدایات پر عمل کرے گا۔ میں ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

مجھے ممی پر رشک آ رہا تھا۔ ان کے پاس کاسمیٹکس کا اتنا ذخیرہ تو ضرور تھا جتنا پاٹ پوری میں کاسمیٹکس کا سیکشن۔

"کیا ہو جائے اگر ممی ایک آدھ لپ اسٹک مجھے بھی دے دیں۔ مر مر کے ایک پرفیوم لے کر دیا ہے وہ بھی سونگھ سونگھ کر استعمال کرنا پڑتا ہے کیونکہ ممی کا حکم ہے کہ نیا پرفیوم چھ مہینے کے بعد ملے گا۔" میں نے کڑھتے ہوئے سوچا۔

لپ اسٹک کے انتخاب میں مجھے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ کتنے دن سے میرا دل چاہ رہا تھا وہ شیڈ لگانے کے لیے۔ ارتھ ٹونز تو یوں بھی مجھے بہت پسند تھے۔ بہت احتیاط سے میں نے تہہ ہونٹوں پر جمائی پورا چہرہ جگمگ جگمگ کرنے لگا۔ پھر سوچا کہ لائنر اور مسکارا بھی لگا لینا چاہیے۔ پریکٹس تو نہیں تھی لیکن احتیاط سے لگانے کی وجہ سے لائنر کی لائن بہت اچھی آئی۔ پلکوں پر مسکارا لگاتے ہوئے میں نے مسکرا کر رومیو کی طرف دیکھا۔

"دیکھو کیسی لگ رہی ہوں؟"

اس نے دُم ہلائی اور میرے پاؤں پر اپنا چہرہ رکھ دیا۔

"تھینک یو رومیو۔"

اسے تھپتھپا کر میں اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ آئینے میں اچھی طرح اپنا جائزہ لیا۔ بال کھولے اور مسکرا دی میں واقعی بہت حسین تھی۔

باہر پاپا کے آفس کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ میں بھاگ کر کھڑکی کے پاس پہنچی۔

پک اَپ میں پاپا کے آفس کا نائب قاصد بیٹھا ہوا تھا۔

"ارے ہو نہ ہو' یہ وہ پارسل لایا ہو گا جو پاپا کے کہنے پر انکل نے لندن سے بھجوایا تھا۔" میں چیخی۔

میری سویٹریں آنا تھیں۔ کچھ اور کپڑے تھے۔ بہت منت کر کے ممی سے کچھ جیولری منگوانے کی اجازت لی تھی کتنے دن سے اس پارسل کا انتظار تھا مجھے۔ انکل نے اپنے جس رشتے دار کے ہاتھ چیزیں بھجوائی تھیں' وہ کہیں کراچی میں ہی اٹک گیا تھا۔ آ ہی نہیں رہا تھا۔ کل شام ہی پاپا نے بتایا تھا کہ ایک دو دن میں پارسل آ جائے گا۔

میں باہر بھاگی۔ رومیو بھی میرے ساتھ نکل آیا۔

"تم نے اندر ہی رہنا ہے۔ پاپا کا یہ والا قاصد اتنا ڈرتا ہے تم سے کہ پارسل دیے بغیر گاڑی بھگا لے جائے گا۔" میں نے رومیو کو ہدایت دی اور خود گیٹ کھول کر باہر نکل گئی۔

شکر ہے بُرکتے اپنے کوارٹر میں تھی ورنہ ہارن سن کر سر پر پہنچ جاتی۔ نائب قاصد اچھی طرح یہ تسلی کر کے اترا کہ رومیو گیٹ سے باہر نہیں نکلے گا۔

"بی بی! یہ صاحب نے بھجوایا ہے۔" اس نے دو بڑے بڑے پیکٹ میرے حوالے کیے۔

"تھینک یو۔" میں خوش ہو گئی۔ پھر پیکٹ الٹتے پلٹتے پوچھا۔ "پانی منگواؤں؟"

"نہیں جی شکریہ۔"

وہ چلا گیا۔ میں پیکٹ لان چیئر پر چھوڑ کر گیٹ بند کرنے آئی۔ سامنے سڑک کے دوسرے کنارے پر بائیک سے ٹیک لگا کر دو لڑکے کھڑے ہوئے تھے اور دونوں ہی میری طرف متوجہ تھے۔ ان کے جسم پر اسکول کا یونیفارم تھا۔ ابھی چھٹی نہیں ہوئی تھی۔ یقینی طور پر وہ دونوں بھگوڑے تھے۔ میں نے ذہن پر زور دیا کہ کیا پہلے بھی وہ وہیں کھڑے تھے مگر یاد نہیں آیا۔ میں تو اپنے کپڑوں اور جیولری کی خوشی میں اتنی منہمک تھی کہ مجھے کسی اور طرف توجہ دینے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔

اتنے میں وہ دونوں میری طرف بڑھے۔ میں بھی گیٹ بند کرتے کرتے رُک گئی۔

دیکھنے میں وہ دونوں ہی بہت اچھے تھے۔ ان میں سے ایک بائیک گھسیٹ رہا تھا اور دوسرا اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ ان کا یونیفارم بتا رہا تھا کہ وہ ہمارے ہی اسکول کی لڑکوں کی برانچ میں پڑھتے تھے جو ہمارے گھر کے بالکل قریب تھا۔

سڑک اتنی چوڑی نہیں تھی۔ چند لمحوں میں ہی وہ میرے قریب تھے۔

''مسافروں کو پانی مل جائے گا؟'' اس نے کہا جو بائیک والے کے ساتھ چل رہا تھا۔

میری آنکھوں میں شرارت اُتر آئی۔ میں جانتی تھی کہ اچانک مسافروں کو پانی کی ضرورت کیوں پڑ گئی تھی۔

''ملے گا' ضرور ملے گا۔'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر آواز دی۔ ''رومیو۔''

رومیو اندر سے دوڑ کر باہر نکلا۔ ان دونوں لڑکوں کے لیے شاید وہ زندگی کا سب سے بڑا شاک تھا۔ اتنا بڑا سا السیشن ان کے سر پر کھڑا غرا رہا تھا۔ بائیک والے نے تو آؤ دیکھا نہ تاؤ' اپنی بائیک کو کک کیا اور یہ جا وہ جا۔ دوسرا الحاقی شاک سے فوراً باہر نکل آیا۔

''ہیلو رومیو' تھوڑے سے آداب میزبانی اپنی جیولٹ کو بھی سکھا دو۔ مسافر نے پانی مانگا تھا۔''

''شٹ اَپ!'' میں چیخی۔ ''میں جیولٹ نہیں ہوں وہ بھی اس رومیو کی۔''

''مجھے کیا خبر' آواز تو اتنے ہی پیار سے دی تھی۔ اتنی شیرینی رومیو کے لیے صرف جیولٹ کی زبان میں ہی ہو سکتی ہے۔''

اسی وقت میری نظر ممی کی کار پر پڑی میری ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''ممی! چلو رومیو فوراً اندر۔'' میں نے اسے اندر بلا کر جلدی سے گیٹ بند کر دیا۔

''اللہ میاں جی۔ ممی نے نہ دیکھا ہو۔ پلیز اللہ میاں جی۔ میں نے کچھ کہا تو نہیں ہے ناں' کسی سے دو باتیں کر لینے میں کیا حرج ہے۔''

اسی وقت باہر ہارن کی آواز سنائی دی۔ ممی اندر آئیں تو غصے میں بھری ہوئی تھیں۔

''گیٹ پر تم کیا کر رہی تھیں؟''

''ممی' وہ اصل میں پاپا نے آفس سے بندہ بھجوایا تھا پارسل دے کر۔ وہ لینے گئی تھی۔'' میں نے بہت ہمت کر کے کہا۔

''نوکر مر گئے تھے کہ تم گیٹ پر گئیں۔ خیر انہیں تو میں بعد میں پوچھوں گی۔ میں نے منع نہیں کیا تھا کہ تم کو باہر نہیں نکلنا۔''

اس بات کا میرے پاس کیا جواب تھا؟ سو خاموشی سے سر جھکائے کھڑی رہی۔

''اور وہ لڑکا کون تھا؟''

''ممی پانی مانگ رہا تھا۔'' میں نے سر کو جھکائے جھکائے جواب دیا۔

''پوری سڑک پر یہی ایک گھر تھا جہاں سے پانی مل سکتا تھا؟ اور منہ اوپر کرو۔ یہ میک اَپ کیوں کیا ہوا ہے تم نے؟''

میرا سر اور جھک گیا۔ آنکھوں میں سچ مچ کے آنسو آ گئے۔

''ممی خود بھی تو میک اَپ کرتی ہیں۔ میں نے کبھی کچھ کہا۔ بس ہر وقت میرے ہی پیچھے پڑی رہتی ہیں۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''بال کیوں کھولے ہیں؟''

اب میں انہیں کیا بتاتی کہ میرا دل چاہ رہا تھا بال کھولنے کے لیے۔ اتنے خوبصورت سنہری مائل بھورے بال ہر وقت باندھ کر رکھنے کے لیے تو نہیں تھے۔ کٹوانے تو دیتی نہیں تھیں۔ کھولنے کی ہی اجازت دے دیتیں۔ وہ بھی نہیں دیتی تھیں۔

''ایک منٹ میں منہ دھو کر آؤ اور کپڑے تبدیل کرو۔ اتنی تیز خوشبو والا پرفیوم لگا رکھا ہے۔''

مجھے فلورل پرفیوم لے دیا۔ خود اپنے پاس اتنے اچھے پرفیوم ہیں۔ پڑے پڑے بکھر جائیں وہ انہیں منظور ہے۔ بیٹی تھوڑا سا اسپرے کر لے تو زمین آسمان ایک کر ڈالتی ہیں۔ اب کیا میں اچھی لگتی ہوں بچوں والے پرفیوم استعمال کرتے ہوئے۔ منہ دھوتے ہوئے میں روتی بھی جا رہی تھی اور سوچ بھی رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی تو ممی کی انکوائری شروع ہوئی تھی۔ میں منہ ہاتھ دھو کر ان کے پاس پہنچی تو ڈانٹ ڈپٹ کا دوسرا مرحلہ شروع ہونا تھا۔ رومیو کو بھی انہوں نے بندھوا دیا تھا۔

اور وہی ہوا جس کا مجھے اندازہ تھا۔ میرے ممی کے پاس پہنچنے کی دیر تھی کہ وہ نوکروں کو ڈانٹنا بھول کر مجھے لیونگ روم میں لائیں اور وہیں ایک ایک بات پر اس قدر جھاڑا کہ میں زور زور سے رونے لگی۔ انہیں پھر بھی ترس نہیں آیا۔

''آج آنے دو اپنے پاپا کو۔'' انہوں نے آخری دھمکی دی۔

''پاپا ہوتے تو اچھا ہی ہوتا۔ شاید ممی کو درمیان میں ڈانٹنے سے روک ہی دیتے۔'' میں نے ٹشو پیپر سے ناک پونچھتے ہوئے سوچا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

بر کتے دوپہر کے کھانے کا پوچھنے آئی۔ میں نے انکار کر دیا۔

''صاحب کہہ رہے ہیں کہ کھانا نہیں کھانا تب بھی آ کر بیٹھ جائیں۔'' وہ دوبارہ پیغام
ئی۔

''کہہ دو میں سو رہی ہوں۔'' میں نے منہ پھلا لیا۔

پاپا کے ساتھ تو میں یہ سب نخرے دکھا سکتی تھی ناں اور ایسے ہر موقعے کا بھرپور فائدہ
ٹھایا کرتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی چند لمحوں میں پاپا آ جائیں گے' اس لیے جلدی سے
تے اتار کر دور پھینکے اور بستر پر لیٹ کر سوتی بن گئی۔ وہی ہوا۔ ابھی مجھے آنکھیں بند
یے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ پاپا آ گئے۔

''کیا ہو گیا ہماری بیٹی کو۔ کھانا اسی وقت چھوٹتا ہے جب موڈ آف ہوتا ہے اور آج تو
ڈ آف ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ جونہی میرے پاس پارسل پہنچے میں نے فوراً ہی گھر بھجوا
یے تاکہ میری بیٹی خوش ہو جائے اور میں گھر آؤں تو مجھے اپنی بیٹی کا خوشی سے چمکتا ہوا چہرہ
ر آئے۔'' انہوں نے میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں چاہیے کچھ۔'' ایک لمحے میں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ارے کیوں نہیں چاہیے؟ بھئی یہ سب کچھ آپ کا ہی تو ہے۔'' انہوں نے پیار سے
ہا۔

''میرا ہے؟ کیا ہے اس گھر میں میرا؟ آپ لوگوں کے پاس بیڈ روم میں بھی ٹی وی ہے
ر مجھے لیونگ روم والے ٹی۔ وی پر بھی کچھ دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ آج بھی جاتے
ئے ممی اسٹور روم میں ٹی وی بند کر کے گئی تھیں۔ باہر لان میں بھی نہیں نکل سکتی میں۔ ایک
یو ہے اسے دیکھنا بھی ممی کو گوارا نہیں ہے۔ کوئی کام اپنی مرضی سے کرنے کی اجازت نہیں
ہے۔'' آنسو تو اتر سے بہنے لگے تھے۔

''اچھا کھانا کھا کر اس بارے میں آپ کی ممی سے بات کریں گے۔'' انہوں نے اُٹھتے
ئے کہا۔

''مجھے نہیں کھانا کھانا۔'' اسی وقت باہر ممی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے دل
یں سوچا کہ خود تو کڑھ رہی ہوں۔ تھوڑا سا ممی کو بھی جلانا چاہیے اس لیے فوراً اضافہ کیا۔ ''یوں
ی کھانے کو بینگن ہی ملیں گے ناں۔ چلو بینگن نہ ہوئے ٹنڈے ہو گئے۔ مجھے تو لگتا ہے' ممی

میری اصلی ممی نہیں ہیں۔ کوئی سگی ماں اپنی اکلوتی اولاد کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتی جیسے ممی
میرے ساتھ کرتی ہیں۔''

ممی جو دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئی تھیں' تیزی سے آگے بڑھیں اور مجھے اپنے
سینے سے لگا لیا۔

''کیا کہا تم نے کہ میں تمہیں سگی ماں نہیں لگتی؟ پھر کبھی ایسے مت کہنا۔'' انہوں نے مجھے
بے تحاشا چومتے ہوئے کہا۔

میں ایک دم حیران رہ گئی۔ اس قسم کا پیار انہوں نے برسوں بعد مجھے کیا تھا۔ جیسے جیسے
میں بڑی ہوتی گئی تھی' ممی کی سختی...... بڑھتی گئی تھی یہاں تک کہ جب میں کیمبرج کے داخلے
کے امتحان میں فیل ہو گئی تو ممی نے ہفتہ بھر مجھ سے بات تک نہیں کی۔ اب اچانک نہ جانے
کیوں انہیں مجھ پر پیار آیا تو میں نے سوچا کہ مجھے بھی یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

''میری سب فرینڈز کی امیاں دس دس بچوں کی موجودگی میں ان سے اتنا پیار کرتی ہیں
اور میں اکلوتی ہوں تب بھی آپ ہر وقت غصے ہوتی رہتی ہیں۔ میری فرینڈز بھی یہی کہتی ہیں
کہ تمہاری سگی ممی نہیں ہوں گی۔'' میں نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

''میری گڑیا' جو لوگ ایسے کہتے ہیں وہ تمہارے دوست نہیں ہیں۔ تم دیکھنا ہنسی میں
شریک ہونے والے بے شمار لوگ ہوتے ہیں' لیکن جب تم دکھی ہو گی تو تمہارا درد بانٹنے کے
لیے کوئی دوست نہیں آئے گا۔ اس وقت صرف تمہارے ممی پاپا ہوں گے جو تمہارا سہارا بنیں
گے۔

آج تمہیں لگتا ہے کہ میں تم سے دشمنی کر رہی ہوں کیونکہ تم بہت محدود دائرے میں دیکھ
سکتی ہو' ذرا سمجھدار ہو گی تو احساس ہو گا کہ یہ دشمنی نہیں تھی' اسی میں تمہاری بہتری تھی۔ جو
آزادیاں تم ابھی چاہتی ہو وہ سب تمہیں ملیں گی لیکن وقت آنے پر۔ ابھی تم بہت چھوٹی ہو' اپنا
اچھا برا نہیں جان سکتیں۔ جس عمر سے تم ابھی گزر رہی ہو۔ یہی انسان کو بناتی بھی ہے اور
بگاڑتی بھی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کوئی نقصان اُٹھائے کیونکہ میرے لیے میری
مہر نگار ہی سب کچھ ہے اور میں اپنی بیٹی کی ہنسی کی ہی نہیں دکھ کی بھی ساتھی ہوں۔''

ممی نے بہت محبت اور رسان کے ساتھ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

مجھے ممی کی باتوں سے بہت اختلاف تھا۔ بھلا بینگن' ٹنڈے کھانے میں میری کیا

بھلائی؟ سمجھدار بھی میں کافی تھی۔ ممی نہ مانیں تو اور بات۔ اور میری سہیلیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ اتنی تو ہمدردی کرتی تھیں میرے ساتھ بروقت۔ اس روز جب اسکول میں میرا ناخن ٹوٹا تھا اور اس سے خون بہنے لگا تھا تو کیسے سمیرا اور ناہید مجھے جلدی سے ڈسپنسری لے گئی تھیں۔ پٹی بھی کروائی تھی اور پیپسی بھی خود ہی پلوائی تھی وہ تو سعدیہ ہی جلتی ہے کہ کہنے لگی۔

"میں سب سمجھتی ہوں کہ یہ فزکس کے ٹیسٹ سے بچنے کا بہانا ہے۔"

اب میں بھلا جان کر فزکس کا ٹیسٹ کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ ممی کے ہاتھوں مرنا تھا مجھے؟ اور پھر اتنا اچھا رٹا لگایا تھا کہ رات کو خواب میں بھی کتاب ہی نظر آرہی تھی۔ اور جب وہ میرے متعلق غلط اندازہ لگا سکتی تھی تو سمیرا اور ناہید کے متعلق اس کا اندازہ کیسے درست ہوسکتا تھا۔

مگر یہ سب میں نے ممی سے نہیں کہا۔ یہی کافی نہیں تھا کہ برسوں بعد میں نے ان کا پیار بھرا لمس محسوس کیا تھا۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا یہ سب پتا نہیں کس بات نے ممی پر اثر کیا تھا۔ میرے رونے نے تو نہیں کیا ہوگا کیونکہ میں تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر روپڑتی تھی اور اس وجہ سے دن میں کم از کم بیس مرتبہ روتی تھی اور پہلے کبھی میرے آنسوؤں نے ممی کو موم نہیں کیا تھا۔

خیر اتنا سوچ کر مجھے لینا بھی کیا تھا۔ اس واقعے سے اتنا فائدہ ضرور ہوا تھا کہ نہ صرف لندن سے بھجوائی جانے والی سب چیزیں ممی نے فوراً مجھے استعمال کرنے کے لیے دے دی تھیں بلکہ... شام کے وقت مجھے خود شاپنگ کے لیے لے کر گئی تھیں اور میری مرضی کا پرفیوم خرید کر دیا تھا بلکہ آئس کریم پارلر میں آئس کریم بھی کھلائی تھی۔

میں بہت خوش تھی اور اپنی ساری خریداری پاپا کو دکھانا چاہتی تھی مگر وہ گھر پر نہیں تھے۔ سومی کے کہنے پر بادلِ نخواستہ اسٹڈی میں آنا پڑا۔ کتاب کھول کر میں آج کے واقعات کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔

"آج کا دن تو بہت فائدہ مند رہا۔ ڈانٹ تو روز ہی پڑتی تھی لیکن اس کا صلہ کبھی اتنا اچھا نہیں ملا۔ ایسی ڈانٹ تو میں ہر روز کھانے کے لیے تیار ہوں۔ وہ کپڑے اور جیولری کتنی اچھی ہے جو انکل نے بھجوائی ہے۔ خیر بھجوائی انہوں نے ہے لیکن خریدی تو پاپا نے ہی تھی۔ کتابیں بھی بس اچھی ہی ہیں۔ اب مصیبت پڑھنی بھی پڑیں گی لیکن آج کا سب سے دلچسپ واقعہ تو وہ تھا۔ جب وہ لڑکا رومیو کو دیکھ کر بائیک بھگا کر لے گیا تھا۔

ہاں وہ دوسرا لڑکا بہت بہادر تھا۔ رومیو کو دیکھ کر حیران ہوا تھا مگر ذرا بھر بھی نہیں ڈرا

تھا کہنے لگا تھا۔

"ہیلو رومیو تھوڑے سے آدابِ میزبانی اپنی جیولٹ کو بھی سکھا دو۔ مسافر نے پانی مانگا تھا۔"

اس وقت تو مجھے غصہ آیا تھا۔ اب ہنسی آرہی ہے۔ کل فرینڈز کو قصہ سناؤں گی۔ سعدیہ تو جل کر کباب ہوجائے گی۔ بس یہ کسی کو نہیں بتاؤں گی کہ اس نے مجھے رومیو کی جیولٹ کہا تھا ورنہ تو بہت مذاق بنے گا۔ کچھ خود سے ہی گھڑ کر سنادوں گی۔ کتنے طنز سے سعدیہ نے کہا تھا۔

"تمہاری زندگی میں جو رومیو لکھا تھا' وہ تمہیں مل چکا ہے۔"

میں نے بھی اچھا جواب دیا تھا۔ "تمہارے رومیو سے بہت بہتر ہے۔ تمہارے والا میرے رومیو کو دیکھ لے تو اس کی گھگھی بندھ جائے۔"

کل اور جلاؤں گی سعدیہ کو۔

لیکن ابھی تک پاپا نہیں آئے؟ کتاب چھوڑ کر میں نے پردوں سے باہر جھانکا۔ پاپا کی کار کھڑی ہوئی تھی۔

میں جلدی سے اپنی اسٹڈی سے باہر نکلی۔ خواب گاہ سے شاپنگ کا سامان اٹھایا اور لیونگ روم کی طرف بڑھی۔

"اس کے ذہن میں یہ بات کس نے ڈالی کہ میں اس کی سگی ماں نہیں ہوں۔" ممی پاپا سے مخاطب تھیں ان کے لہجے میں اضطراب تھا۔

میں رک گئی۔ "ذرا پتا تو چلے کہ ممی پر میری باتوں کا کتنا اثر ہوا۔ کہیں کل تک زائل تو نہیں ہوجائے گا؟ کیا پتا کل پھر پہلے والی ممی بن جائیں اور لندن سے آئی ہوئی جیولری اور آج خریدا ہوا پرفیوم اپنے پاس رکھ کر کہیں۔

"مہرنگار! یہ تمہاری ہی چیزیں ہیں اور میرے پاس امانت ہیں۔ مگر تمہیں ابھی نہیں ملیں گی۔" میں نے سوچا۔

"اس کے ذہن میں یہ بات کون ڈالے گا۔ کہیں کسی سہیلی نے مذاق میں کہہ دی ہوگی۔ دوستوں کے درمیان سو طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔" پاپا نے لاپروائی کا مظاہرہ کیا۔

"میں ایسی دوستیوں کی قائل نہیں ہوں۔ یہ کوئی دوستی نہیں ہوتی۔ اس سے بڑھ کر دشمنی کیا ہوگی کہ ماں اور بیٹی کے درمیان کی محبت ختم کرنے کی کوشش کی جائے اور مجھے تو شک پڑ

ہا ہے کہ آپ کی آپا جان جو تین دن پہلے تشریف لائی تھیں ان کے منہ سے مہر نے کچھ سنا ہے۔ انہیں ویسے بھی فالتو باتوں کی عادت ہے۔"

"کمال کرتی ہو تم بھی۔ مہر کو تو ان کی شکل بھی یاد نہیں ہوگی۔ تم کسی رشتے دار سے اسے ملنے بھی کب دیتی ہو۔ تمہارے رویے کے باعث کسی رشتے دار نے ہمارے گھر آنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ جونہی کوئی آتا ہے' مہر کو اسٹڈی یا خواب گاہ میں بند کر دیتی ہو۔" پاپا کو غصہ آ گیا۔

"کیونکہ میں برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی میری بیٹی کے کانوں میں ایسا زہر اتارے س سے وہ نہ زندوں میں رہے اور نہ مُردوں میں۔"

"کب تک دنیا سے چھپا کر رکھو گی اسے؟ کوئی لمحہ تو آئے گا ناں جب اسے برا بھلا رداشت کرنا ہوگا۔ تم اسے یوں ہر وقت دنیا سے چھپا کر رکھو گی تو وہ کبھی بھی فائٹ نہیں کر سکے گی۔ اسے حقیقتوں سے اس قدر دور مت رکھو۔ وہ ماشاء اللہ ذہین ہے۔ آہستہ آہستہ اسے حقیقتوں سے خود روشناس کراؤ گی تو وہ انہیں مان بھی لے گی اور قبول بھی کر لے گی۔ باہر کبھی نہیں اچانک کسی حقیقت کا سامنا کرنا پڑا تو وہ وہیں ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔" پاپا نے سمجھانے لے انداز میں کہا۔

"میں کیا کروں' میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سوچ سوچ کر میرے سر میں درد رہنے لگا ہے۔" ممی آزردہ ہو گئیں۔

"اسے تھوڑی سی آزادی دو' سانس لینے کی گنجائش چھوڑو اس کے لیے۔ اور کچھ نہیں تو ھانا ہی اس کی پسند کا پکوا دیا کرو۔ اس کے کتے کی وجہ سے ہر وقت اسے جھڑکا مت کرو۔ رے یا اپنے ساتھ کلب جانے کی اجازت دے دو۔ باہر لان میں نکلتی ہے تو نکلنے دیا کرو۔ ر چھوٹی چھوٹی سی خواہشیں اس کی پوری کرو گی تو وہ تمہاری بڑی بڑی خواہشیں پوری کرے ا۔"

"میں اسے ڈسپلن سکھانا چاہتی ہوں۔ زندگی میں نظم و ضبط بہت ضروری ہوتا ہے۔"

"یہ ڈسپلن نہیں ہے جو تم اسے سکھا رہی ہو۔ بدلتے وقت کے ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ اس بات کو قبول کرو۔ وہ گھٹن کا شکار ہو جائے گی۔ تم سے بدظن ہو جائے گی۔ ممکن ہے وت پر آمادہ ہو جائے۔ کہیں سختی کی ضرورت ہوتی ہے تو کہیں نرمی بھی ضروری ہوتی ہے۔ طرح تو وہ خود اعتمادی سے محروم ہو جائے گی۔ آج تم نے اسے اس لیے اسکول نہیں بھیجا

کیونکہ واپسی پر تم اسے پک نہیں کر سکتی تھیں۔ تو کیا فرق پڑتا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ بھی آ سکتی تھی۔"

"بہت فرق پڑتا ہے۔ میں اپنے یا آپ کے علاوہ کسی پر اعتماد نہیں کر سکتی۔ ڈرائیور کتنا بھی اچھا ہو' ملازم اور غیر ہی ہوتا ہے۔ میں کب چھٹی کراتی ہوں مہر کو۔ آج بہت مجبوری تھی کہ میں اسے کہیں لانے لے جانے کے معاملے میں کسی پر اعتماد نہیں کر سکتی۔"

ان کی باتیں سن کر میں بور ہونے لگی تھی۔ بس اس بات کا شکر تھا کہ میری غیر موجودگی میں ہی سہی پاپا نے میری طرف داری تو کی تھی۔ میں احتیاط سے چند قدم پیچھے ہٹی اور پھر یوں لیونگ روم کی طرف بڑھی جیسے ابھی ابھی وہاں آئی ہوں۔ مجھے آتے دیکھ کر ممی پاپا ایسے بن گئے جیسے ابھی ان کے درمیان کوئی اخلاقی موضوع زیر بحث ہی نہیں تھا۔

وہ دن میرے لیے یادگار بن گیا تھا کیونکہ اس روز کے بعد سے ممی نے میرے ساتھ کافی نرمی برتنی شروع کر دی تھی۔ اب وہ مجھے بینگن کھلانے پر اصرار نہیں کرتی تھیں۔ کھانے میں میری پسند کا خیال رکھا جانے لگا۔ رومیو بھی ہر وقت ان کے عتاب کا شکار نہیں رہتا تھا۔ میں لان میں ان کے بغیر بھی نکل سکتی تھی۔ یوں بھی باڑھ کافی اونچی تھی' باہر سے کچھ نظر نہیں آتا تھا' چار دیواری بھی تھی۔ گھر میں مَیں جیولری بھی پہن سکتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے ممی اپنے ساتھ سروسز کلب بھی لے جاتی تھیں۔ وہیں میں نے دوسری مرتبہ اسد کو دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا بھگوڑا...... دوست بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دور دور سے شرارت سے مسکرا دیتا تھا لیکن ممی کی وجہ سے قریب نہیں آتا تھا۔ تعداد میں وہ پانچ لڑکے تھے۔ کبھی کبھار ان کے ساتھ دوسرے لڑکے بھی مل جاتے تھے مگر اصل گروپ انہی پانچ کا تھا۔ مجھے وہ اچھے لگتے تھے ایزی گوئنگ لوگ۔ زندگی کو انہوں نے مسئلہ نہیں بنا رکھا تھا۔ ہنستے کھیلتے تھے۔ خوش رہتے تھے۔ میرا بھی اسی طرح رہنے کو دل چاہتا تھا۔

پھر یقیناً پاپا نے ممی کو قائل کیا ہوگا' ورنہ ممی کے ذہن میں یہ خیال آ ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے پاس آ کر کہنے لگیں۔

"ٹی وی اور اس قسم کی دوسری تفریحات سے بہتر ہے کہ تم کوئی کھیل' کھیل لیا کرو۔"

"ممی! میں رومیو کے ساتھ کھیلتی تو ہوں۔"

"خدا کے لیے ہر بات میں اس کتے کو مت گھسیٹا کرو مہر نگار۔ میں کسی ڈھنگ کے

کھیل کی بات کر رہی ہوں۔"

"مثلاً؟" میں ہمہ تن شوق ہوگئی۔

"مثلاً ٹینس۔ کل شام میں تمہیں ناکنگ کرتے دیکھ رہی تھی تو مجھے خیال آیا کہ تم ٹھیک ٹھاک ٹینس کھیل سکتی ہو۔"

میں نے ذہن پر زور دیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ کبھی کسی زمانے میں پاپا کے پاس ٹینس کا ایک ریکٹ ہوتا تھا۔ وہ تو کھیلتے نہیں تھے۔ کبھی میں اسے اٹھا کر بال دیوار پر مارتی رہتی تھی اور اس کام کی مجھے کافی مہارت تھی لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ ممی ہر مرتبہ ہی مجھے ایسے کرتے دیکھتی تھیں۔ پتا نہیں یہ خیال انہیں پہلے کیوں نہیں آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس بات کا خیال انہیں پاپا نے دلوایا ہوگا۔

"جی ممی۔ ٹینس ٹھیک رہے گا۔" میں خوش ہوگئی۔ یہ بات کتنی دلچسپ تھی کہ میں باقاعدگی کے ساتھ کوئی کھیل' کھیل سکوں گی لیکن میرے ذہن میں یہ بھی موجود تھا کہ اسد بھی ٹینس کھیلا کرتا تھا۔

یوں ممی نے مجھے ٹینس سکھانے کا بندوبست کیا۔ اپنے ساتھ لے جا کر میرے لیے دو ریکٹ خریدے۔ گیندوں کے ڈبے لیے۔ اور میں کورٹ میں اتر گئی۔ یہ کام میرے لیے بالکل مشکل نہیں تھا اس سے پہلے میں ناکنگ کرتی ہی رہتی تھی۔ شاید مجھ میں صلاحیت بھی تھی۔ مارکر بھی بہت اچھا تھا سو چند ہی دنوں میں ممی کی کڑی نگاہوں کے حصار میں مَیں نے کافی اچھا کھیلنا شروع کر دیا۔

تب تک میں صرف اسد کے نام سے ہی واقف تھی۔ وہ بھی اس طرح کہ دوست پکارتے تھے اور یوں مجھے خبر ہوگئی تھی۔ ہاں وہ کھیلتا بہت اچھا تھا اور دور بیٹھ کر میں اسے بغور دیکھا کرتی تھی۔ ہر پوائنٹ پر وہ فخریہ انداز میں میری طرف دیکھتا تھا۔ میرے ہونٹوں پر حوصلہ افزائی کی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ وہ گیند لے کر پھر کھیل میں مگن ہو جاتا تھا پھر نظروں اور مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ ممی البتہ اس تمام بات سے بے خبر تھیں۔ وہ میری طرف توجہ تو بہت دیتی تھیں لیکن کلب میں ان کی بہت سی سہیلیاں بھی آیا کرتی تھیں اور وہ سب گروپ بنا کر بیٹھ جاتی تھیں۔ یوں ہمیں کم از کم اس قدر موقع ضرور مل جاتا تھا کہ منہ سے ایک بھی لفظ نکالے بغیر ہم ایک دوسرے کو اپنے تاثرات سے آگاہ کر دیا کرتے تھے۔

اس روز میں اور ممی گھر کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ممی نے مجھے ٹیسٹ دے رکھا تھا۔ ٹینس کی بھی چھٹی تھی۔ اور میں ٹیسٹ میں دیئے گئے سوالات پر سوچنے کے بجائے اسد کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب میں کھیلتی تھی تو وہ نظروں ہی نظروں میں میری تعریف کرتا تھا اور جب وہ کھیلتا تھا تو میں بھی ہاتھ سے یہ موقع جانے نہیں دیتی تھی۔ کتنا دلچسپ مشغلہ تھا۔

"کل میں کون سا ڈریس پہن کر کلب جاؤں؟" بظاہر رف ورک کرتے ہوئے میں سوچ رہی تھی۔ "مجھے لگتا ہے کہ اسد کو مجھ پر نیلا اور سیاہ رنگ اچھا لگتا ہے ٹھیک ہے کل میں سیاہ ٹی شرٹ اور سیاہ ٹائٹس پہن کر جاؤں گی۔"

اسی وقت باہر سے بائیک کی تیز آواز آئی۔ یہ آواز اکثر شام ڈھلے آیا کرتی تھی۔ میں اپنی کاپی پر جھکی رہی لیکن چند ہی لمحوں میں بائیک ہمارے گھر کے ادھ کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ میں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔ اسد اور اس کا دوست ہمارے گھر میں تھے۔ ممی بھی اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ اسد نے جلدی سے گیٹ بند کر دیا۔ میں پریشان ہو کر کھڑی ہوئی تو کاپی نیچے گھاس پر گر گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"یہ دونوں یہاں کیوں آ گئے؟ آج تو میری بالکل خیر نہیں۔ انہوں نے کچھ کہہ دیا تو ممی میری ہڈیوں کا بھی سرمہ بنا ڈالیں گی۔" میں نے خوفزدہ ہو کر سوچا۔ اس سے قبل کہ ممی کچھ کہتیں' اسد نے ممی کو جلدی سے سلام کر دیا۔

"السلام علیکم آنٹی۔"

"وعلیکم السلام۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" ممی نے کہا۔

"آنٹی! دراصل ہم انکل سے ملنے آئے تھے یہ کرنل ریٹائرڈ اقبال حسن کا گھر ہے ناں؟"

"میں ابھی انہیں بلواتی ہوں۔ آپ بیٹھیں۔" ممی نے کہا اور برکتے کو آواز دی۔

وہ قریب ہی لان چیئرز پر بیٹھ گئے۔ میرا خوف کے مارے برا حال تھا۔ میں نیچے جھک کر اپنی کاپی اور پین اٹھانے لگی۔ اسی وقت باہر سے پولیس موبائل کی آواز آئی اور گاڑی ہمارے گھر کے سامنے سے ہوتے ہوئے آگے چلی گئی۔ میں نے کن اکھیوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا تھا۔

"ہوں تو پولیس سے چھپ کر یہاں آئے ہیں لائسنس نہیں ہوگا ناں پاس۔" ایک لمحے میں ہی میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔

اسی وقت پاپا بھی اندر سے آ گئے تھے۔ وہ دونوں جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پاپا کو سلام کیا۔

"جی بیٹا' آپ لوگ مجھ سے ملنے آئے تھے؟"

"جی انکل' ڈیڈی نے کہا تھا کہ اگر یہاں سے گزر ہو تو سلام کرتے جائیں۔" اسد نے جلدی سے کہا۔

میں جو کاپی پر سر جھکائے بیٹھی تھی' میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ممی ان کے سامنے مجھے کچھ کہہ تو نہیں سکتی تھیں' بس گھور کر رہ گئیں۔

"وعلیکم السلام لیکن آپ اپنے ڈیڈی کا تعارف کروانا پسند کریں گے؟" پاپا نے کہا۔

"ہاں ڈیڈی' تعارف ... جی وہ میرے ڈیڈی یعنی کرنل سفیر۔" اسد نے جلدی جلدی کہا۔

"اچھا کرنل سفیر کے فرزند ہیں آپ۔ آج دوپہر کا کھانا ہم نے اکٹھے کھایا تھا۔" پاپا نے کہا۔

اسد کا دوست عامر تو اچھل ہی پڑا۔

"جی انکل' ڈیڈی اسی کھانے کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے بہت اچھا تھا۔ چلو شعیب۔"

وہ دونوں مزید ایک بھی بات کیے بغیر تیزی سے بائیک بھگا کر لے گئے۔ میری ہنسی چھوٹی تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

"ان لڑکوں کو کیا ہوا تھا؟" ممی نے دور ہوتی ہوئی بائیک کی آواز پر کان لگائے ہوئے تھے۔

"مہر بیٹا! آپ اندر جائیں۔" پاپا نے کہا۔

میں نے اپنی کتابیں کاپیاں سمیٹیں اور اندر چلی گئی۔ افسوس مجھے یہ خبر نہ ہو سکی کہ ممی اور پاپا کا اسد کے بارے میں کیا خیال تھا البتہ یہ بات مجھے کافی محظوظ کر رہی تھی کہ وہ ایک لمحے میں با آسانی کہانی گھڑ لیتا تھا۔

رات کھانے کے بعد ممی اور پاپا حسبِ معمول سیر کے لیے نکلے تو اس کا فون آ گیا۔

"ہیلو نگی! فون مت بند کرنا' میں اسد بول رہا ہوں۔"

حیرت کے مارے میں تو کچھ بولنا ہی بھول گئی۔

"ہیلو' سن رہی ہو نگی؟" اس نے کہا۔

"مگر میں نگی تو نہیں ہوں۔ میرا نام مہر نگار ہے۔"

میں نے اپنی حیرت پر قابو پا لیا تھا۔

"لاحول پڑھنے کو دل چاہ رہا ہے اس وقت۔ اتنا لمبا نام' وہ بھی اس قدر مشکل' میرے منہ پر نہیں چڑھتا۔"

"مگر تمہیں میرا فون نمبر کس نے دیا؟"

"ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ یہ تو ایک ذرا فون نمبر ہے اور کوئی بھی فون نمبر معلوم کرنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" وہ اترایا۔

"اور کتنے فون نمبر ہیں تمہارے پاس؟"

"یہ تو سیکرٹ بات ہے پھر بھی تمہیں بتا دیتا ہوں کہ کافی سارے ہیں لیکن جس دن سے تمہیں دیکھا ہے اور کسی میں کشش ہی نہیں رہی۔"

اس کی بات سن کر میں ہنس پڑی۔

"تمہاری ہنسی بھی تمہاری طرح خوبصورت ہے۔" اس نے کہا۔

میرے گرد دھنک کے سب رنگ بکھر گئے۔ میں نے لوگوں کی نگاہوں میں اپنے لیے ستائش دیکھی تھی۔ بہت سی لڑکیوں اور خواتین نے انتہائی فیاضی کے ساتھ میرے حسن کی تعریف بھی کی تھی لیکن اب سے پہلے صنفِ مخالف کے کسی فرد کے منہ سے میں نے یوں بلا واسطہ اپنی تعریف نہیں سنی تھی۔ یہ ان سب تعریفوں سے کتنی مختلف تھی۔ کتنی انوکھی' کتنی سحر انگیز' کتنی سرور آگیں۔

"کچھ بولو گی نہیں نگی؟"

"ہوں۔" میں چونکی پھر ہنس پڑی اور ہنستی ہی چلی گئی۔

"کل کلب آ رہی ہو ناں؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔

''اپنی اماں کو گھر چھوڑ کر آنا۔ کیا ضروری ہے کہ ہر وقت ایک تھانیدار تمہارے ساتھ ہو۔ کبھی اماں کبھی کتا۔''

''تم میری ممی اور رومیو کو ایک ساتھ ملا رہے ہو؟'' مجھے بہت برا لگا تھا۔

''میں تمہارے محافظوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ تمہاری اماں تو یوں بیٹھی ہوتی ہیں کہ کسی نے تمہاری طرف دیکھا بھی تو اس کی تکا بوٹی کر ڈالیں گی۔ صحیح پوچھو تو میں تمہاری اماں اور تمہارے کتے سے یکساں ڈرتا ہوں۔''

''شٹ اپ۔'' میں نے غصے سے فون بند کر دیا۔

ممی چاہے مجھ پر غصہ ہوتی تھیں۔ چاہے سختی کرتی تھیں' چاہے بال نہیں کٹوانے دیتی تھیں مگر تھیں تو میری ممی۔ یہ تو نہیں ہو سکتا تھا ناں کہ میں ان سے محبت کرنا چھوڑ دیتی۔ یا کوئی ان کے متعلق ایسی باتیں کرتا تو میں ٹال دیتی۔ ان سے زیادہ پیارا تو مجھے کوئی بھی نہیں تھا۔

وہی تو تھیں جو میری بیماری میں ساری ساری رات پلک نہیں جھپکتی تھیں۔ میرے سرہانے بیٹھی رہتی تھیں۔ اگر حقیقت دیکھی جاتی تو انہوں نے مجھے اس سے کہیں زیادہ دیا تھا جو والدین عموماً اپنی اولاد کو دیتے ہیں۔ کتنے برسوں سے ایسا ہو رہا تھا کہ ہر گرمیوں کی چھٹیوں سے قبل وہ مجھ سے پوچھا کرتی تھیں کہ اس بار میں کس ملک کی سیر کرنا چاہوں گی اور میں جس ملک کا نام لیتی تھی' پاپا اور ممی پورے ایک مہینے کے لیے مجھے وہاں لے جاتے تھے۔ وہاں سے میں اپنی پسند سے خریداری کرتی تھی۔ ممی نے کبھی میرا ہاتھ نہیں روکا تھا۔ ہاں کچھ چیزیں ایسی ہوتی تھیں جو وہ امانتاً اپنے پاس رکھ لیتی تھیں۔ یہ کہہ کر کہ جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو انہیں استعمال کر سکوں گی۔

یہاں بھی انہوں نے تعلیم کے لیے بہت سازگار ماحول دے رکھا تھا' وہ خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اور میری پڑھائی کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ یہ اور بات کہ مجھے پڑھنے کا شوق نہیں تھا۔ اس کے بجائے مجھے خود کو سنوارنا اور گھر کو سجانا زیادہ پسند تھا۔ شاید ممی اسی لیے پاپا سے کہہ رہی تھی کہ مہر نگار کو ہومکس (ہوم اکنامکس کالج) میں داخلہ دلوائیں گے۔

بہر حال یہ طے تھا کہ ممی سے کتنے بھی اختلاف سہی ہم ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ باقی روز مرہ کے شکوے شکایات تو چلتے ہی رہتے تھے۔

رات کو ممی' پاپا واپس آئے تو ممی کا مزاج بگڑا ہوا تھا لیکن وہ اس لیے خاموش تھیں کیونکہ

میرے سامنے پاپا کے ساتھ وہ کبھی کوئی اختلافی موضوع نہیں چھیڑا کرتی تھیں۔

نہ جانے یہ بات سبھی اکلوتی اولادوں میں ہوتی ہے یا مجھ میں ہی تھی کہ کئی خاص مواقع پر میں ممی اور پاپا کی گفتگو پر کان لگا دیا کرتی تھی۔ ہمیشہ نہیں کبھی کبھی جب ان کے چہرے بتا رہے ہوتے تھے کہ ان کے درمیان کوئی خاص موضوع زیر بحث ہے۔ اصل میں میرے ساتھ گھر میں بات کرنے والے وہی تو تھے یا پھر اماں بَرکتے' باقی ملازمین کے ساتھ میں ضرورتاً ہی بات کرتی تھی کیونکہ یہ ممی کو پسند نہیں تھا۔ بَرکتے میری بچپن کی ملازمہ تھی اور اس نے مجھے گود میں کھلایا تھا۔ ایسے میں مَیں چاہتی تھی کہ ممی اور پاپا مجھے بھی اپنے مسائل میں شریک کریں۔ میں اتنی بڑی تو تھی کہ ان کی پریشانیوں کا حل چاہے نہ پیش کر سکتی لیکن انہیں شیئر تو کر سکتی تھی۔ پھر کچھ تجسس کا مادہ بھی تھا۔ اس رات کچھ ایسا ہی ہوا۔ ممی نے میرے سامنے گفتگو نہیں کی لیکن چونکہ میں سننا چاہتی تھی لہٰذا ان کی گفتگو سننا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

''میں نے منع بھی کیا تھا آپ کو' پھر وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی۔'' ممی غصے میں بھری بیٹھی تھیں۔

''آپا بیمار تھیں' کیا اب انہیں دیکھنے بھی نہ جاتا؟'' پاپا بھی ان سے اُلجھ رہے تھے۔

ایک تو ممی اور پاپا کے رشتے داران کے اکثر جھگڑوں کا باعث ہوا کرتے تھے۔ درمیان میں خواہ مخواہ مجھے بھی گھسیٹ لیا جاتا تھا۔ پاپا کو شکوہ ہوتا تھا کہ ممی مجھے کسی بھی رشتے دار سے ملنے نہیں دیتیں۔ ویسے مجھے بھی اپنے رشتے دار کچھ زیادہ پسند نہیں تھے۔ میرا اپنا دل بھی نہیں چاہتا تھا ان سے ملنے کے لیے۔ عجیب عجیب نظروں سے مجھے دیکھا کرتے تھے۔ میں شائستگی سے سلام کرتی تھی۔ تب بھی اوّل تو کوئی جواب نہیں دیتا تھا اور کوئی دے دیتا تو یوں جیسے میرے سر میں ہتھوڑا مار رہا ہو۔ شروع میں تو میں سوچتی ہی رہ جاتی تھی کہ آخر مجھ سے ایسا کون سا قصور سرزد ہوا تھا جس کی سزا ایسے رویے کے ساتھ دی جا رہی تھی۔ اب میں بھی ان کی پروا نہیں کرتی تھی۔

''جانا تھا تو مجھے بھی لے کر جاتے۔ سیدھے آفس سے چلے گئے۔ وہاں کوئی کچھ بھی کہتا رہے آپ سن کر آ جاتے ہیں۔ آپ کو اکیلا دیکھ کر گھیر لیتے ہیں۔ میں ساتھ ہوتی تو دیکھتی کون میری بیٹی کا حصہ مانگتا ہے۔ آپ انتظام کریں' میں کل ہی یہ مکان مہر کے نام کرواتی ہوں۔ یہ

سب کچھ میری بیٹی کا ہے۔ جسے دیکھو مکان' بینک بیلنس اور کاروبار پر نگاہیں جمائے بیٹھا ہے۔' ممی کہہ رہی تھیں۔

''آپا بیچاری بھی مشکل میں ہیں۔ ناصر کا داخلہ ہو گیا ہے اور ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے کہ اسے باہر بھجوا سکیں۔ کچھ نہ کچھ تو دینا ہی ہوگا۔'' پاپا کا لہجہ کمزور سا تھا۔

''آپ کی آپا کسی جھونپڑی میں رہ رہی ہوتیں تو میں ایک مرتبہ بھی انکار نہ کرتی۔ ہم سے بڑا ان کا مکان ہے۔ چار گاڑیاں ہیں' درجنوں سونے کے سیٹ ہیں۔ پیٹ بھر بھی جائے ان کی نیتیں نہیں بھرتیں۔ ہم کیوں پچیس لاکھ کا انتظام کریں ان کے لیے؟ میاں کے کاروبار میں نقصان ہو رہا ہے تو دو ایک گاڑیاں اور سونے کے سیٹ بیچ دیں مگر وہ کہاں بیچیں گی' زکوۃ تک تو دیتی نہیں ہیں۔''

''ہمیں کیا پتا زکوۃ دیتی ہیں یا نہیں۔ کیوں سنی سنائی بات دہراتی ہو۔'' پاپا کو عادت تھی سب کا پردہ رکھنے کی۔

''جانے دیں' اب ایسا بھی نہیں کہ ہم بالکل بے خبر ہوں۔''

''آپا کے ہاتھ میں ہے بھی کچھ نہیں۔ میاں پوچھتا نہیں ہے۔ منت کر کر کے سونا پہننے کو ملتا ہے۔ خاندان میں کہیں دینے دلانے کی بات ہو تو دونوں میاں کی خوش آمد کرتی ہیں۔''

''اب ایسا بھی نہیں ہے۔ انہیں مظلوم بننے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے اور جو پچیس سال میں بھی میاں کو اپنا نہ بنا سکے۔ اس کے ساتھ جو ہو' وہ کم ہے۔ یوں بھی ہم نے کسی کی اولاد کا ٹھیکہ نہیں اُٹھا رکھا۔ سب کچھ مفت خوروں میں بانٹ کر اپنی بیٹی کو ..... بے یار و مددگار چھوڑ دیں۔''

روپے پیسے میں میری دلچسپی برائے نام تھی پھر بھی میں ممی کی باتوں سے خوش ہو رہی تھی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ مسلسل میری طرف داری کے حوالے سے بات کر رہی تھیں۔ ورنہ تو عموماً پاپا ہی میری سائیڈ لیا کرتے تھے اور مجھے ممی کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

''لیکن ممی آخر ہیں تو میری ہی ممی' صرف اور صرف میری' جن کی تمام تر محبت' شفقت اور توجہ میرے لیے ہے۔ ٹھیک ہے ذرا سی جلاد صفت ہیں لیکن اتنا بھی مجھے یقین ہے کہ ان سے اور پاپا سے بڑھ کر اس دنیا میں کوئی مجھ سے محبت نہیں کر سکتا۔'' میں نے فخر سے سوچا۔

لیکن یہ لحاتی سوچ پاپا کے جواب سے ایک دم بکھر گئی۔

''کسی کی اولاد کا ہی تو ٹھیکہ اُٹھا رکھا ہے ورنہ بات کی جائے تو میرے بھتیجوں اور بھانجوں کا حق بڑھ کر ہے۔'' پاپا کا لہجہ عجیب سا تھا۔

میں چونک گئی۔ یہ کیا بات کی تھی پاپا نے؟ اس کا کیا مطلب تھا۔ کسی کی اولاد؟ وہ کیا کہنا چاہتے تھے؟ یا پھر میں نے ہی غلط سنا تھا۔ یا شاید یونہی غصے میں ایک بے معنی بات منہ سے پھسل گئی تھی۔

پاپا کی بات سن کر ممی کا ردِعمل بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ وہ تو اچھل ہی پڑی تھیں۔

''کیا؟ کیا کہا؟ مہر نگار میں عیب ڈھونڈا آپ نے؟ میری معصوم بیٹی کے لیے ایسے الفاظ نکالے؟ ناشکر گزاری کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کا پردہ رکھا ہوا ہے تو آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ آپ کسی کا پردہ کھولیں؟ میں نے برسوں تک طعنے سنے' تکلیفیں برداشت کیں لیکن آج تک اس بارے میں کیا کبھی ایک لفظ بھی کسی سے کہا؟ میں اللہ تعالیٰ کی رضا میں راضی رہی مگر مجھے افسوس ہے کہ آپ کا ظرف اتنا سا ہے۔ یاد رکھیں بالآخر یہی بیٹی ہمارے مرتے وقت ہمیں پانی پلائے گی۔ آپ کا کوئی بھتیجا یا بھانجا نہیں آئے گا۔'' اب ممی نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔

پاپا دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے تھے۔

''میں دیکھتی ہوں کیسے اس جائیداد کا ایک ٹکا بھی ان مفت خوروں کو ملتا ہے۔ میں نے کبھی اپنے لیے کوئی حق طلب نہیں کیا لیکن یہ ممکن نہیں کہ اس موقع پر میں خاموش رہوں۔ یہ سب کچھ میری بیٹی کا ہے اور اسی کو ملے گا۔''

میں خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اندھیرے میں اپنے بستر پر لیٹ کر سوچنے لگی کہ یہ سب کیا تھا؟ ممی اور پاپا کیا باتیں کر رہے تھے؟ اس سے پہلے ایسی باتیں میں نے نہیں سنی تھیں یا ممکن ہے میرے کان میں پڑی بھی ہوں لیکن میں نے انہیں قابلِ توجہ نہ سمجھا ہو اور بھول بھال گئی ہوں۔

جو گفتگو ان دونوں کے بیچ میں ہوئی تھی' اسے بار ہا میں نے دل ہی دل میں دہرایا۔ پھر بھی کچھ نہ جان پائی تھی۔ ممی مجھ سے متعلق کس عیب کی بات کر رہی تھیں جو پاپا نے مجھ میں ڈھونڈا تھا؟ اللہ تعالیٰ نے کس بات میں پاپا کا پردہ رکھا ہوا تھا؟ اور پاپا کو کس کا پردہ رکھنا چاہیے تھا؟ میرے اس عیب کا جس کی طرف اس گفتگو میں اشارہ ہوا تھا' لیکن مجھ میں کیا

عیب تھا؟

عجیب گورکھ دھندا تھا۔ جیسے بے شمار ڈوریں اُلجھی ہوئی ہوں اور ایک گرہ کو کھولنے کی کوشش میں کتنی اور گرہیں سامنے آ جائیں۔ ایسے ہی سوال پر سوال نکل رہے تھے اور کتنے سوالوں کے بعد پھر پہلا سوال سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔ یوں جیسے دائرے کا سفر ہو۔

انہی سوچوں میں اُلجھی نہ جانے کس وقت میں نیند کی وادی میں اُتر گئی۔ صبح جاگتے ساتھ ہی میرے ذہن میں پھر رات والی گفتگو اور سوال تازہ ہو گئے۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ ناشتے کی میز پر ممی اور پاپا کے درمیان کیسی صورتِ حال ہوتی ہے۔ میرا اسکول جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن چونکہ چھٹی کرنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہو گئی۔

ناشتے کی میز پر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ پاپا ناشتے میں مصروف تھے اور ممی انہیں اخباروں کی خاص خاص سرخیاں سنا رہی تھیں اور ایسا کرتے ہوئے حسبِ معمول ان کی چائے ٹھنڈی ہوئی جا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ پاپا بھی مختلف خبروں پر تبصرہ کر رہے تھے۔

میں نے حیرت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ رات والی جنگ وجدل' بحث اور غصے کا کہیں نام ونشان تک نہیں تھا۔

''مہر' کیا ہوا بیٹا' وہاں کیوں کھڑی ہو۔ ناشتا نہیں کرنا کیا؟'' پاپا نے مجھے دیکھ کر ہمیشہ والی شفقت اور محبت کا مظاہرہ کیا۔

میں نہیں جانتی تھی کہ رات والی گفتگو میں میرا ذکر کس حوالے سے تھا لیکن اتنا تو میں سمجھ سکتی تھی کہ پاپا نے میرے حق میں بات نہیں کی تھی بلکہ اپنے بھتیجوں اور بھانجوں کا حق مجھ سے بڑھ کر بتایا تھا۔ اس لیے میں ان سے خفا تھی۔

''ممی! میں ناشتا نہیں کروں گی۔ آپ ناشتے سے فارغ ہو جائیں تو پلیز مجھے جلدی سے اسکول چھوڑ دیں میں لاؤنج میں بیٹھ رہی ہوں۔'' میں نے پاپا کی بات کو یکسر نظر انداز کر کے ممی کو مخاطب کیا۔

''کیوں بیٹا! ناشتا کیوں نہیں کرنا؟'' پاپا نے پوچھا۔ انہیں شاید میری خفگی کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

''میری مرضی کیا اپنے گھر میں مَیں اس بات کا فیصلہ بھی نہیں کر سکتی کہ مجھے ناشتا کرنا

ہے یا نہیں؟ یا پھر یہ میرا گھر ہی نہیں ہے؟'' میرے لہجے میں خود بخود تلخی آ گئی۔

ممی اور پاپا کے لیے شاید یہ بہت بڑا شاک تھا۔ ایک تو میں کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیتی تھی اور اگر کبھی کسی بات کا جواب دینا ہی پڑتا تو انداز تلخی اور خفگی کے بجائے وضاحتی ہوتا۔ جبکہ آج نہ صرف میں نے ہمیشہ سے مختلف لہجہ اپنایا تھا بلکہ 'یا پھر یہ میرا گھر ہی نہیں ہے' کہہ کر اُلجھی ڈوروں کا ایک سرا اپنے ہاتھ میں بھی لے لیا تھا۔

''کیسی فضول باتیں کر رہی ہو۔ بڑوں سے اس انداز میں بات کرتے ہیں۔'' ممی نے مجھے جھڑکا۔

لیکن ان کی جھڑکی مجھے بری نہیں لگی۔ کل رات کے بعد وہ میرے لیے ہمیشہ سے زیادہ اہم ہو گئی تھیں۔ میں جان گئی تھی کہ ان سے بڑھ کر اس دنیا میں مجھ سے کوئی شخص بھی محبت نہیں کرتا۔ ان کی جھڑکیاں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔

''اور یہ کیڑا کس نے تمہارے دماغ میں گھسایا کہ یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے تمہارا گھر تو پھر کون سا گھر ہے تمہارا؟ منہ سے بات سوچ سمجھ کر نکالنی چاہیے۔ ادھر آؤ اور ناشتا کرو۔ ناشتا نہیں بھی کرنا تو دودھ کا گلاس ضرور پینا ہوگا۔''

میری آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی اُتر آیا۔ میں ممی سے کہنا چاہتی تھی کہ رات کو پاپا نے بھی تو سمجھے سوچے بغیر منہ سے بات نکالی تھی اور اس بات پر ممی کو غصہ بھی آیا تھا مگر میں یہ سب ان سے کیسے کہہ سکتی تھی۔

پاپا جو پہلے ہی چھری کانٹا چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو چکے تھے' اپنی کرسی دھکیل کر اُٹھے اور میرے پاس آ گئے۔

''لگتا ہے' ہماری بٹیا کچھ ناراض ہے۔ کیا آج اسکول جانے کا موڈ نہیں ہے؟''

میں خاموش رہی۔ پاپا مجھے بہت پیار کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل کے قریب لے آئے۔

''چلو بیٹھو اور ناشتا کرو۔'' ممی نے ہمیشہ کی طرح حکم دیا۔

میں چپ چاپ بیٹھ کر ناشتا کرنے لگی۔ پاپا نے خود مجھے سیب کاٹ کر دیا۔ دودھ کے گلاس میں چینی بھی ملائی اور میرے ان سے سب شکوے ایک دم سے دور ہو گئے۔ میں نے اُٹھ کر ان کے گلے میں بازو ڈال کر انہیں پیار کیا اور بولی۔

''آئی ایم سوری پاپا' میں نے بہت بدتمیزی کی تھی۔''

"بھول جائیں، تکلیف دہ باتوں کو بھول جانا ہی اچھا ہوتا ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"مہر نگار آج تم اسکول نہیں جاؤ گی۔" ممی نے اخبار تہہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں ممی؟"

"آج ہم تینوں کو کچھ کام کرنے ہیں، بینک وغیرہ کے۔" انہوں نے یوں کہا جیسے یہ کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔

میں چونک گئی۔ ان کی بات کا یہی مطلب تھا کہ انہوں نے پاپا سے اپنی بات منوالی تھی۔ اور اس کا یہ مطلب بھی تھا کہ خود پاپا کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ انہوں نے بغیر سوچے سمجھے محض غصے میں جو بات کہی تھی، وہ اچھی نہیں تھی لیکن پھر انہوں نے ہی تو مجھے یہ سبق بھی سکھایا تھا کہ تکلیف دہ باتوں کو بھول جانا ہی اچھا ہوتا ہے۔

پھر بھی کچھ سوال اپنی جگہ موجود ہی تھے۔ جنہیں نہ جانے میں کبھی حل کر سکتی یا نہیں؟

ہمارا وہ دن بہت مصروفیت کے عالم میں گزرا۔ پتا نہیں ممی پاپا کیا کچھ میرے نام کر رہے تھے۔ البتہ اتنی مجھے خبر ہو گئی تھی کہ کم عمری کی وجہ سے کسی جگہ ممی اور کسی جگہ پاپا میرے نگران تھے۔ یہ سب کچھ اٹھارہ سال کی عمر میں پہنچ کر ہی میرا ہو سکتا تھا۔ پھر ایک وہی نہیں تین چار دن ہم اسی قسم کے کاموں میں مصروف رہے۔ ہر قسم کے دفتری امور پاپا اور ممی ہی نمٹا رہے تھے۔ میں ان دونوں کے ساتھ ہر جگہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھی رہتی تھی۔ کہیں کوئی دستخط کرنے کو کہتا تو کر دیتی اور بس۔ میرا صرف اسی قدر کام تھا۔

اس شام کو خالہ کو ملنے کے لیے گھر آنا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اتنے دن سے میں نہ اسکول جا سکی تھی اور نہ ہی کلب۔ اب بھی ممی مجھے اسٹڈی اور میری خواب گاہ تک محدود کر کے خود خالہ کے ساتھ مصروف ہو جائیں گی۔ رومیو کو بھی میرے پاس نہیں آنے دیں گی۔ پھر کتنی بور ہوں گی میں۔

ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اسد کا فون آ گیا۔ شکر ہے کہ ممی لان میں مالی کو ہدایات دے رہی تھیں۔

"اتنے دن سے کہاں غائب ہو۔ نہ اسکول میں نہ کلب میں آ رہی ہو۔ خیریت تو ہے، کہیں بیمار تو نہیں ہو گئیں؟"

مجھے اس کا فون آنے کی بہت خوشی تھی۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ اس روز میں نے غصے میں فون بند کر دیا تھا۔

"نہیں، میں بیمار نہیں تھی۔ کچھ مصروفیت تھی اس لیے نہ اسکول جا سکی اور نہ کلب لیکن یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ میں اسکول نہیں گئی؟"

"نجومی ہوں میں، اس لیے خبر ہو گئی۔ اب یہ بتاؤ کہ آج کلب آ رہی ہو ناں؟"

"بہت مشکل ہے، آج میری خالہ آ رہی ہیں۔ ممی ان کے ساتھ بیٹھیں گی۔ وہ مجھے کلب نہیں لا سکیں گی۔" میں نے اسے بتایا۔

"تمہاری ممی خالہ کے ساتھ بیٹھیں گی۔ تھینک گاڈ پھر تو بہت اچھا وقت ہے کہ تم کلب آ جاؤ۔"

"مگر میں کیسے آ سکتی ہوں۔ ممی جو نہیں ہوں گی۔"

"یہی تو اچھا موقع ہے، چند باتیں کر لیں گے۔ بس تم کسی طرح آ جاؤ، چاہے ضد کر کے ہی۔" وہ بولا۔

"میں نہیں آ سکتی، بھلا میں ممی سے ضد کر سکتی ہوں میری ممی بہت سخت ہیں۔ ابھی میں نے ضد کرنی شروع بھی نہیں کی ہو گی کہ مجھے ڈانٹ کر پڑھنے کے لیے بھجوا دیں گی۔" میں نے اپنے قدموں میں بیٹھے رومیو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم پتا نہیں اپنی ممی سے اتنا ڈرتی کیوں ہو۔ بس میں کچھ نہیں سن رہا۔ تمہیں آج کلب آنا ہی ہو گا۔"

اس نے اتنا اصرار کیا تھا اور مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ ممی کے سامنے ضد کرتی۔ بڑی مشکل سے ہمت مجتمع کر کے لان میں ان کے پاس آئی تھی۔

"ممی۔" میں نے انہیں مخاطب کیا۔

"ہوں۔" وہ مالی سے بات کرتے کرتے بے توجہی سے بولیں۔

"ممی میں نے ناہید سے فون پر اسکول کا کام لے لیا تھا اور وہ پورا کر بھی لیا ہے۔" میں نے کہا۔ یہی صورت ہو سکتی تھی کلب جانے کے لیے راہ ہموار کرنے کی کہ پہلے انہیں اپنی کارکردگی سے آگاہ کیا جاتا۔

"اچھی بات ہے۔" وہ پھر پودوں اور پھولوں میں اُلجھ گئیں۔

ان کی عدم توجہی نے مجھے مزید بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہاں سے میں سیدھی پاپا کے پاس پہنچی جو اپنی خواب گاہ والے ٹی وی پر بی بی سی لگائے بیٹھے تھے۔

''پاپا پلیز' مجھے کلب جانا ہے۔ میں اتنے دنوں سے کھیلنے نہیں گئی۔ پلیز پاپا' ممی سے اجازت لے دیں۔'' میں نے ان کے گلے میں بازو ڈال کر کہا۔

''ممی کیوں نہیں لے جا رہی ہیں؟''

''خالہ آ رہی ہیں ناں' وہ پھر مجھ سے کہہ دیں گی کہ اپنے بیڈ روم میں جاؤ' یا اسٹڈی میں جاؤ۔ پاپا میں بہت بور ہوگئی ہوں۔ میرا رونے کو دل چاہ رہا ہے۔''

''رونے کی کیا بات ہے۔ تم تیار ہو جاؤ۔ میں لے جاتا ہوں۔''

میں ایک دم خوش ہوگئی۔ ''تھینک یو پاپا۔'' پھر اچانک خیال آیا۔ ''ممی اجازت دے دیں گی؟''

''میں آپ کو اکیلے تو نہیں بھیج رہا۔ خود اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ کیا میری اجازت کافی نہیں ہے۔'' وہ مسکرائے۔

''نہیں' ایسی بات نہیں ہے۔ اصل میں ممی کہتی ہیں ناں کہ آپ اپنے فرینڈز میں گم ہو جاتے ہیں اور میرا خیال نہیں رکھتے۔'' میں نے وضاحت کی۔

''آپ کی ممی آپ کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھتی ہیں۔ میں اتنا خیال رکھتا ہوں جتنا کہ رکھنا چاہیے۔ اب جائیں' جلدی سے تیار ہو جائیں۔ ممی کچھ نہیں کہیں گی۔'' پاپا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

ممی نے مجھے ہزار نصیحتوں کے ساتھ روانہ کیا۔ مجھے ہی نہیں' ڈھیر ساری ہدایات پاپا کو بھی ملی تھیں جن میں سے سب سے اہم یہی تھی۔

''بچی کا دھیان رکھنا' آپ دوستوں میں پہنچ کر بالکل بے پروا ہو جاتے ہیں۔''

اور پاپا نے انہیں یقین دلایا تھا کہ وہ میرا پورا خیال رکھیں گے۔

اسد نے مجھے آتے دیکھا تو کِھل اُٹھا۔ مسکراہٹوں کا تبادلہ کرنے کے بعد میں کورٹ کی طرف بڑھ گئی۔ ابھی کھیل ہی رہی تھی کہ وہ میرے قریب آ گیا۔

''چلو نگی ڈرنک لیتے ہیں۔'' اس نے یوں کہا جیسے اس وقت ڈرنک لینا برسوں

سے ہمارا معمول ہو۔

میرا رنگ اُڑ گیا۔ پہلے اِدھر اُدھر پاپا کو ڈھونڈنے کی کوشش کی' گھبراہٹ میں کچھ دکھائی ہی نہ دیا۔

''کیا کر رہے ہو۔ پاپا میرے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔'' میں نے نیچی آواز میں کہا اور آگے بڑھنے لگی۔

''وہ اس وقت بلیرڈ روم میں بلیرڈ کھیل رہے ہیں۔ کوئی شک ہو تو بے شک وہاں جھانک آؤ۔ ان کی اور میرے ڈیڈی کی ابھی ابھی بیسٹ آف تھری شروع ہوئی ہے۔'' اس نے مزے سے بتایا۔

میں شش و پنج میں پڑ گئی۔ ''پھر بھی مجھے اجازت تو نہیں ہے ناں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ سامنے نہیں ہیں۔''

وہ ایک دم ناراض ہوگیا۔ ''آئندہ مجھ سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

میں کہنا تو چاہتی تھی کہ اس سے قبل بھی کبھی میں نے خود سے اس سے بات نہیں کی تھی لیکن اس لیے نہ کہہ سکی کیونکہ وہ اور زیادہ ناراض ہو سکتا تھا اور میں کسی کو اپنے سے ناراض نہیں کر سکتی تھی۔

''اچھا پلیز خفا مت ہو۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ۔''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میں نہ تم سے بات کر رہا ہوں اور نہ تمہاری بات سننا چاہتا ہوں۔''

''آل رائٹ میں آ رہی ہوں لیکن بس پہلی اور آخری مرتبہ۔'' میں نے کہا۔

''تم ایک مرتبہ آؤ تو۔'' وہ ہنس کر بولا۔

اس کے ساتھ چلتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ خواہ ممی میرے ساتھ کچھ بھی سلوک کریں لیکن میں ان سے یہ بات نہیں چھپاؤں گی بلکہ انہیں یہ بھی بتا دوں گی کہ میں اسد کے ساتھ فون پر بھی بات کرتی ہوں اور وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

''ہاں' اچھا لگتا ہے۔'' میں نے سوچا۔ ''اچھا نہ لگتا تو میں کیوں اس کا فون سنتی اور اب کیوں اس کے ساتھ کولڈ ڈرنک لینے جاتی۔''

میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ممی کو کیسے بتاؤں گی اور جو کچھ سلوک وہ میرے ساتھ کریں گی اس کا سامنا کیسے کروں گی مگر یہ طے تھا کہ مجھے انہیں سب کچھ بتانا تھا۔ اس سوچ نے مجھے بہت ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ میں چپس اور پیپسی لیتے ہوئے آرام کے ساتھ اسد سے باتیں کر رہی تھی۔

’’میرا خیال تھا شاید آج تمہارا رومیو تمہارے ساتھ آئے۔‘‘ وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

میں ہنس پڑی۔ ’’میرا رومیو آجائے تو اس کا سامنا یہاں کوئی نہ کر سکے۔ کلب خالی ہو جائے۔‘‘

’’خیر اب ایسا بھی نہیں۔ آخر ہم نے نہ صرف سامنا کیا تھا بلکہ حال احوال بھی دریافت کیا تھا۔‘‘ وہ مزے سے بولا۔

’’ہاں تمہیں مان گئی۔ میں نے سوچا تھا کہ صرف اسی لڑکے سے دوستی کروں گی جو رومیو کا سامنا کر سکے گا اور اسے دیکھ کر بھاگے گا نہیں۔ اب تک تم وہ واحد لڑکے ہو جو اس شرط پر پورے اُترے ہو۔ مجھے صرف بہادر لڑکے پسند ہیں۔‘‘

اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ’’اگر تم یہ کہہ دو کہ ہماری دوستی پکی ہے تو تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔‘‘

راز کی بات کا سن کر میرا تجسس بڑھ گیا۔ ’’ہاں ہماری دوستی بالکل پکی ہے۔‘‘ میں نے جلدی سے کہا۔

’’سچی بات تو یہ ہے کہ بھاگنا میں بھی چاہتا تھا لیکن وہ کم بخت ناصر میرا انتظار کیے بغیر بائیک بھگا لے گیا۔ اب مرتا کیا نہ کرتا۔ اس کے علاوہ کوئی چارا نہیں تھا کہ بہادری دکھاتا۔‘‘ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

’’تو تم سچ مچ کے بہادر نہیں ہو؟ تمہیں بھی رومیو سے ڈر لگتا ہے؟‘‘ مجھے افسوس ہوا۔

’’نہیں خیر ڈر تو نہیں لگتا لیکن اب کتوں کے منہ کون لگے۔‘‘ اس نے اطمینان سے کہا۔

اس کی بات سن کر میں بے ساختہ ہنس پڑی۔

’’اب میں چلتی ہوں۔ اس پیپسی اور چپس کا بہت شکریہ۔‘‘ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

’’لیکن تمہارے پاپا تو ابھی بلیرڈ کھیل رہے ہیں۔‘‘

’’می پاپا نے مجھے یہاں صرف ایک گھنٹے تک رہنے کی اجازت دی ہوئی ہے۔ ابھی میرا پڑھائی کا وقت ہونے لگا ہے۔ پاپا اور معاملوں میں تو سختی نہیں کرتے البتہ پڑھائی کے وقت وہ بھی بہت سخت ہو جاتے ہیں۔ وہ گیم چھوڑ کر آتے ہوں گے چاہے مجھے چھوڑ کر واپس یہاں آجائیں لیکن مجھے ضرور بروقت اسٹڈی میں پہنچائیں گے۔‘‘

میرا خیال بالکل درست تھا۔ کلب سے ہمارا گھر کچھ دور نہیں تھا۔ پاپا مجھے گھر چھوڑ کر واپس چلے گئے ہمارے آنے تک خالہ بھی آچکی تھیں اور ممی کے ساتھ باہر لان میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں انہیں اور ممی کو سلام کر کے آگے بڑھنے لگی تھی کہ خالہ نے روک لیا۔

’’تمہاری ممی نے تو تمہیں بالکل چھپا کر رکھا ہوا ہے میں تو تمہاری شکل ہی بھول گئی تھی۔‘‘ وہ بولیں۔

میں نے ممی کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ واضح طور پر بتا رہا تھا کہ انہیں میرا وہاں رکنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

’’جی مجھے پڑھنا ہے۔ ایکسکیوزمی۔‘‘ میں نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

’’ہو بہو اپنی ماں پر ہے، ہیں ناں۔ وہ کمبخت بھی بہت ہی خوبصورت تھی۔‘‘

جاتے جاتے میرے کانوں میں خالہ کی آواز آئی۔

’’آپ کو معلوم ہے بجیا کہ میں اس موضوع پر ایک لفظ بھی نہیں سننا چاہتی۔‘‘ ممی کہہ رہی تھیں۔

انہوں نے اس کے علاوہ بھی کچھ کہا لیکن میں سن نہیں سکی اور اندر آگئی۔

’’خالہ کس کی بات کر رہی ہیں؟‘‘ میں نے سوچا پھر کتاب کھولتے ہوئے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ خیر مجھے کیا ممی خود ہی کہتی ہیں کہ خالہ کے پاس شکل وصورت اور کپڑوں زیور کے علاوہ بات کرنے کے لیے کوئی موضوع ہوتا ہی نہیں ممی

نے تنگ آ کر ہی انہیں منع کیا ہوگا کہ وہ اس موضوع پر کچھ نہیں سننا چاہتیں۔

میرا مسئلہ تو اس وقت یہ ہے کہ ممی کو اسد کے متعلق بتاؤں۔ یہ تو طے ہے کہ انہیں اول سے آخر سب کچھ بتانا ہوگا' مگر کیسے؟ پتا نہیں ممی کو کتنا غصہ آئے۔ بہرحال جتنا بھی آئے' برداشت تو مجھ ہی کو کرنا ہوگا۔ ایک ترکیب آئی۔ میں کتاب بند کر کے بھاگتے ہوئے رومیو کے پاس پہنچی۔

''سنو رومیو! بہت پرابلم ہوگئی ہے۔ چلو میرے ساتھ اندر آؤ۔'' میں نے اس کی زنجیر کھولی۔

وہ میرے پیچھے دُم ہلاتا ہوا آیا۔ ہم دونوں اسٹڈی میں آ گئے تو میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔

''مجھے ممی کو اسد کے متعلق بتانا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے بتاؤں۔ دیکھو اب میں تمہارے ساتھ ریہرسل کروں گی۔ تم مجھے بتانا کہ کون سا طریقہ سب سے بہتر ہے' ٹھیک؟''

وہ میرے پاؤں چاٹنے لگا۔ مجھے رومیو کی یہ بات بہت پسند تھی۔ وہ میری ہر بات بغور سنا کرتا تھا اور مجھ سے اختلاف بھی نہیں کرتا تھا۔

''میں یوں کہنا شروع کروں گی کہ ممی میں نے آپ کو بہت اہم بات بتانی ہے۔ آپ کہتی ہیں ناں کہ میں ہر فرینڈ کا آپ سے تعارف ضرور کرایا کروں لیکن چند دن سے میں نے اپنے ایک نئے دوست کا آپ سے تعارف نہیں کروایا۔ اس کا نام اسد ہے اور وہ بہت اچھا ہے۔''

میں خود ہی رک گئی۔ ''یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں یوں کہوں گی کہ ممی آپ پلیز غصے مت ہونا۔ مجھے اس وقت سے ڈر لگ رہا ہے' میں نے آپ سے کچھ چھپایا ہے لیکن میں اب آپ کو سب بات بتا دینا چاہتی ہوں۔''

کتنی دیر تک میں ممی سے بات کرنے کا طریقہ سوچتی رہی۔

''یوں خواہ مخواہ خود سے الجھتے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جو کچھ منصوبہ بناؤں گی' ڈائیلاگ یاد کروں گی وہ یوں بھی ممی کے سامنے سب بھول جائیں گے۔ بہتر یہ ہوگا کہ سیدھے سیدھے ان کے پاس جاؤں اور اس وقت جو باتیں ذہن میں آئیں

کہہ دوں۔ اللہ میاں جی یہ زندگی کس قدر مشکل ہے اور میری تو کچھ زیادہ ہی مشکل ہے۔ رومیو تم بھی میری ایک پیس میں واپسی کی دعا کرنا' میں بھی فنگرز کراس کر کے جاؤں گی۔ وِش می آل دی بیسٹ۔''

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ میرے اندازے کے مطابق اب تک خالہ کو واپس جا چکا ہونا چاہیے تھا۔ پاپا کا تو مشکل ہی تھا کہ کلب سے واپس آئے ہوتے یہ موقع اچھا تھا۔ ممی اکیلی تھیں۔ میں لیونگ روم کی طرف بڑھی ساتھ ساتھ گھر کا بھی جائزہ لیتی جا رہی تھی۔ ملازمین کچن یا اپنے کوارٹرز میں تھے۔ خالہ واقعی جا چکی تھیں اور پاپا بھی گھر پر نہیں تھے۔ میں نے ہمت باندھی لیکن لیونگ روم کے قریب پہنچ کر احساس ہوا کہ وہاں ممی تنہا نہیں تھیں۔ آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ پھوپھو بھی ان کے ساتھ تھیں اور دونوں ہی کچھ خوشگوار موڈ میں نہیں تھیں۔

ایک دم سے میرے ذہن میں چند دن پہلے کی وہ رات گھوم گئی جب ممی اور پاپا کی لڑائی کے دوران بہت سے سوالات نے مجھے گھیر لیا تھا۔ میں نے کمرے کے قریب ہو کر لیکن اوٹ میں رہتے ہوئے کان اندر سے اُبھرنے والی آوازوں پر لگا دیئے۔

''دیکھیں آپا بات مت بڑھائیں۔ جو کچھ ہمارا ہے اسے کسی کو دینا یا نہ دینا ہماری مرضی پر منحصر ہے۔ آپ آتی ہیں ہم آپ کی عزت کرتے ہیں لیکن یہ بھی یاد رکھیں کہ اپنی پسند کے مطابق فیصلہ کرنے کا ہمیں اختیار ہے۔'' ممی کو غصہ تو آیا ہوا تھا مگر وہ پھر بھی تحمل سے کہہ رہی تھیں۔

''میرے بھائی کا گھر ہے تم مجھے آنے سے روک بھی نہیں سکتیں۔ میرے بھائی کی دولت ہے۔ اس نے کمائی ہے۔ میرا اس پر پورا حق ہے۔ تم بہن بھائی کے بیچ آنے والی کون ہوتی ہو۔'' پھوپھو کے لہجے میں تیزی تھی۔

''آپ کا پہلا حق اپنے میاں کی دولت پر ہے۔ اس سے جا کر حق مانگیں۔ بھائی پر آپ کا جو حق ہے آج تک میں نے اسے روکا ہے اور نہ درمیان میں آئی ہوں لیکن جہاں آپ اپنے حق سے بڑھ کر میری بیٹی کا حق غصب کرنے لگیں گی وہاں میں چپکی نہیں بیٹھوں گی۔'' ممی نے اب بھی غصہ دبایا ہوا تھا۔

''ارے کون سی تمہاری بیٹی؟ کہاں سے پیدا کر لی تم نے بیٹی؟ بنجر زمین میں بھی کبھی پھول کھلا ہے؟ اولاد وہی ہوتی ہے جو اپنی کوکھ سے پیدا ہو۔''

میں جو مزے سے یہ تمام گفتگو سن رہی تھی' ایک لمحے کو تو کچھ نہ سمجھ سکی۔

''خاموش ہو جائیں آپا' مہرنگار میری بیٹی ہے۔ پھر آئندہ آپ نے یہ بات کی تو بہت برا ہوگا۔'' اب کے ممی بھی پھٹ پڑیں۔

''کیا برا ہوگا۔'' پھوپھو تنک کر بولیں۔ ''کیا کر لو گی تم؟ دھکے مار کر نکالو گی گھر سے؟ اس گھر میں تمہاری اہمیت ہی کیا ہے۔ میرے بھائی کو اولاد تک کی خوشی تو دے نہیں سکیں۔ یہ شکر نہیں کرتیں کہ ہم میں سے کسی نے تمہیں دھکے مار کر یہاں سے نہیں نکالا' ورنہ اتنا کون سسرال برداشت کرتا ہے۔ اولاد نہ دے سکیں چلو اللہ کی رضا سمجھ کر صبر شکر کر لیا لیکن تم تو شیر ہو گئیں۔ اٹھا لائیں اس بدچلن عورت کی ناجائز اولاد کو اس گھر میں اور شامل کر لیا اس خاندان میں۔''

''چپ ہو جائیں آپا۔'' ممی چلائیں۔

''ارے کیوں چپ ہو جاؤں' کون پکڑ سکتا ہے میری زبان کو' وہ ناجائز ہی رہی۔ بدچلن ماں کی آوارہ بیٹی' آج خود ناصر نے اسے کلب میں ایک لڑکے کے ساتھ ملاقات کرتے دیکھا ہے۔ یہ بھی وہی گل کھلائے گی جو اس کی ماں نے کھلایا تھا۔ اس کی ناجائز اولاد کو بھی نانی بن کر پالنا' ثواب کا کام ہے۔''

میرا سر چکرا رہا تھا۔ ایک ایک لفظ پگھلے ہوئے سیسے کی مانند میرے کانوں میں اتر رہا تھا۔ سماعت پر جیسے ہتھوڑے برس رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ ایک ہی لفظ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

''بدچلن ماں کی آوارہ بیٹی۔''

میں نہیں جانتی کہ وہ سیاہ لمحے کیسے بیتے۔ بس یوں لگا۔ جیسے ایک اندھا کنواں ہے جس کی تہہ نہیں ملتی اور میں اس میں نیچے ہی نیچے جاتی جا رہی ہوں چاروں اور تاریکی ہے گھٹن ہے۔ دور دور تک نہ روشنی کی کوئی کرن' نہ کوئی محبت بھرا لمس۔ بس سیاہی اور وجود کو رگڑتی چھیلتی سپاٹ ٹھنڈی دیواریں۔

یک دم سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ سارا مان' اپنی ذات کا غرور' اعتماد' کچھ بھی باقی نہیں رہا

تھا۔ گندے بدبودار کیچڑ میں جیسے میری روح دھنستی جا رہی تھی۔ میں اس دنیا میں کتنی تنہا ہو گئی تھی۔ کہیں کوئی میرا اپنا نہیں تھا۔ وہ ماں کہاں تھی جس نے مجھے جنم دے کر کہیں پھینک دیا تھا۔ وہ باپ کہاں تھا جس کا خون میری رگوں میں گردش کر رہا تھا۔ میں کس کا گریبان پکڑتی۔ کس سے حساب مانگتی اس داغ کا جو مجھ سے کوئی قصور سرزد ہوئے بغیر ہی میرے ماتھے پر لگ گیا تھا۔

اگر اجالا ہونے اور تاریکی پھیلنے کو ہی وقت گزرنا کہتے ہیں تو نہ جانے کتنے دن رات بیت گئے تھے مگر میں اپنے آپ میں نہیں آتی تھی۔ مجھے دنیا کی ہر چیز سے نفرت ہو گئی تھی۔ بس میں خاموش رہنا چاہتی تھی۔ بالکل تنہا۔ اپنے گرد کسی کا وجود گوارا نہیں ہوتا تھا مجھ سے۔ اپنی سوچوں میں کتنی دور نکل گئی تھی۔ تصور میں مجھے سائے سے دکھائی دیتے تھے۔ دھند میں لپٹے ہوئے۔ اس عورت اور مرد کے سائے جو میری پیدائش کے ذمے دار تھے اور جن سے میری نفرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ میں ان پر الزام لگاتی تھی۔ ان سے جھگڑتی تھی۔ گالیاں دیتی تھی۔ چاقو کے پے در پے وار کر کے ان کے جسموں کو چھلنی کر دیتی تھی۔ پھر بھی نہ میرا غصہ ٹھنڈا ہوتا تھا اور نہ نفرت ختم ہوتی تھی۔ ہاں تھوڑی ہی دیر بعد جب وہ سائے پھر میری نگاہوں کے سامنے آ جاتے تھے تو اس غصے اور نفرت میں بے بسی کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

میرے اندر ہر وقت لاوا اُبلتا رہتا تھا' اور باہر ایک چپ تھی۔ ممی کا تمام تر وقت میرے ساتھ گزرتا تھا اور پاپا بھی اپنا زیادہ تر وقت میرے ساتھ ہی گزارتے تھے مگر مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنی ایک دنیا آباد کر لی تھی۔ زہر بھری دنیا' میں ان دونوں کی طرف دیکھتی تھی جنہیں میں نے ہمیشہ اپنے ماں باپ سمجھا تھا لیکن جو اجنبی تھے۔ وہ عورت جس نے مجھے پالا تھا۔ مجھے سمجھاتی تھی۔

''کیچڑ میں بھی کنول کھلتا ہے اور تم وہی کنول ہو۔ خوبصورت' شفاف۔''

اور میرا دل چاہتا تھا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ اور چلاؤں۔ ''میں وہ کنول نہیں' وہی کیچڑ ہوں۔ کنول بے شک کیچڑ میں جنم لیتا ہے لیکن کیچڑ سے پیدا نہیں ہوتا۔ کیچڑ سے صرف کیچڑ ہی پیدا ہوتا ہے۔''

مگر میں چپ رہتی تھی۔

اور کبھی وہ کہتی۔ ''تم مہرنگار ہو۔ چاند کا عکس۔''

اور میرے اندر کوئی استہزائیہ انداز میں ہنستا ''داغدار''

پھر کبھی میں آنکھیں موند کر لیٹی ہوتی تو وہ مجھے سوتا سمجھ لیتے۔

''کتنا زہر بھرا ہوا ہے لوگوں کی زبانوں میں کاش کوئی اتنا تو سوچ لیا کرے کہ چند الفاظ کسی کے معصوم دل پر قیامت بن کر اُتر سکتے ہیں۔'' وہ کہتی۔

''اسی لیے میں کہتا تھا کہ اسے چھپا کر مت رکھو' دنیا کا سامنا کرنے دو۔ کسی اور کے منہ سے کچھ سن لینے سے قبل اپنے منہ سے ہی سب کچھ بتا دو۔ ہم تم بتاتے تو اسے سنبھال بھی سکتے تھے۔ ہمارے الفاظ اور ہمارا لہجہ محبت بھرا ہوتا۔ یہ سمجھ جاتی اور قبول کر لیتی۔ منفی پہلو دیکھنے کے بجائے مثبت پہلو دیکھتی۔''

''میں نے تو اپنی طرف سے بہتر کیا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل میں یہ خیال آئے کہ میں اس کی ماں نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ میری کوئی سگی اولاد ہوتی تو میں اسے کیسے پالتی۔ کتنی محبت کرتی مگر مجھے یقین ہے کہ اس سے زیادہ نہ کرتی۔'' وہ رو پڑتی۔

یہ وہ عورت تھی جسے میں ہمیشہ ماں سمجھتی آئی تھی۔ اس نے مجھے محبت دی۔ پیار کیا یا ڈانٹا' میرے لیے یہ ماں ہی رہی۔ ایک محبت بھرا سایہ دار وجود۔ اب اچانک یہ عورت میرے لیے اجنبی ہو گئی تھی۔ میں اپنے دل کو ٹٹولتی تھی لیکن وہاں اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس عورت کے لیے جس نے اپنی راتوں کی نیندیں حرام کر کے مجھے پالا پوسا تھا۔ اور جواب بھی پل بھر کے لیے مجھے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی۔

آہستہ آہستہ میرے ذہن سے صدمے کا اثر ختم ہو رہا تھا۔ وہ صدمہ جو بالکل اچانک مجھے پہنچا تھا لیکن میرے اندر کے زہر' نفرت اور بے بسی کا کہیں انت نہیں تھا۔ وہ ہر روز پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ میرے اندر اپنی جڑیں پھیلا رہے تھے۔ نہ ہی اجنبیت کی وہ دیوار گرتی تھی۔ جو میرے اور میرے پالنے والوں کے درمیان حائل ہو چکی تھی۔ میں نے انہیں ممی اور پاپا کہنا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ میں نے تو ان سے بات کرنی بھی چھوڑ رکھی تھی۔ بس کبھی کسی ناگزیر ضرورت کے تحت چند الفاظ پر مشتمل فقرہ ہی میری زبان سے نکلتا تھا۔

اس روز جب وہ عورت صرف چند منٹ کے لیے میری خواب گاہ سے باہر نکلی تو میں بھی اپنی اسٹڈی میں چلی آئی۔ تھوڑی دیر میں مکمل تنہائی میں بسر کرنا چاہتی تھی۔ بہت کچھ سوچنا تھا

مجھے۔

اپنے کتنے ہی سوالوں کا جواب مجھے مل چکا تھا۔ وہ سب سوال جو اس واقعے سے قبل میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ وہ جب مجھے پالنے والی عورت نے کہا تھا کہ انہوں نے کسی کی اولاد کا ٹھیکہ نہیں اُٹھا رکھا اور جواب میں اس مرد کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔

''کسی کی اولاد کا ہی تو ٹھیکہ اُٹھا رکھا ہے ورنہ بات کی جائے تو میرے بھتیجوں اور بھانجوں کا حق بڑھ کر ہے۔''

اور میں کچھ بھی نہیں سمجھی تھی۔

ہاں اب سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ وہ بھی جو نہ جاننا اور نہ سمجھنا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔

لیکن اب نئے سوال اُٹھنے لگے تھے۔ یہ کہ میں کس عورت کے وجود کا حصہ تھی۔ یہ کہ میں کس شریف زادے کا گندا خون تھی؟

''ناجائز اولاد' بدچلن ماں کی آوارہ بیٹی۔''

یہ وہ الفاظ تھے جو میرے ذہن سے چپک کر رہ گئے تھے۔ اور تو جو انکشاف تھا سو تھا ان سے یہ پتا بھی ملتا تھا کہ مجھے گود لینے والے کم از کم میری ماں سے بے خبر نہیں تھے۔ مجھے اس عورت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جو میری ماں تھی' میں بس اس سے صرف چند سوال پوچھنا چاہتی تھی اس کے بعد چاہے وہ جہنم میں جاتی۔

راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے میں انہی خیالات میں گم تھی کہ زوردار آواز سے دروازہ کھلا اور مجھے پالنے والی عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر جیسے اس کی جان میں جان آئی۔

''اوہ مہرنگار' تم یہاں ہو۔'' اس نے سکون کا سانس لیا۔

میں نے اس کی جانب بغور دیکھا۔ اس نے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھام رکھا تھا۔

''چلو بیٹا! دودھ پی لو۔'' میرے قریب آ کر اس نے بہت پیار کے ساتھ کہا۔

میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر ایک طرف رکھ دیا اور مضبوط لہجے میں بولی۔

''بیٹھیے' مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔ کبھی پہلے اس لہجے میں میں نے اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ بہرحال خاموشی سے وہ وہیں رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی پر ٹک گئی۔

''میں اپنی ماں کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔''

اس کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہوئی۔

''تمہاری ماں وہی ہے جس نے اپنا آرام تمہاری خاطر حرام کر لیا ہے۔ جس نے تمہارے ساتھ راتیں جاگ کر گزاری ہیں' جس نے تمہیں چلنا' بولنا' لکھنا پڑھنا سکھایا ہے۔ جس نے تمہاری انگلی پکڑ کر تمہیں دنیا دکھائی ہے۔ جس نے اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا کر تمہیں کھلائے ہیں' جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ تمہارے لیے وقف کر دیا ہے' جس نے تمہیں محبت اور مامتا دی ہے۔ اس کے علاوہ تمہاری ماں کون ہو سکتی ہے؟''

''جو کچھ اس عورت نے کیا' وہ مہربانی تھی جس کے لیے میں اس کی شکر گزار ہوں۔ کچھ اس عورت کی اپنی غرض بھی تھی کہ اسے اپنا گھر قائم رکھنا تھا۔ اپنی ازدواجی زندگی کا پردہ رکھنا تھا۔ ماں بہرحال وہی ہوتی ہے جو جنم دیتی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

اس کے ہونٹ کانپے' آنکھیں جھلملائیں اور اس نے منہ پھیر لیا۔ چند ثانیے کے بعد اس نے میری جانب دیکھا تو وہ خود پر قابو پا چکی تھی۔

''ہاں مجھے اپنی ازدواجی زندگی کا پردہ رکھنا تھا لیکن بات صرف گود لینے کی ہوتی تو ایسے بچوں کی کمی تو نہیں جن کے ماں باپ مر جاتے ہیں اور وہ دنیا کی بھیڑ میں تنہا رہ جاتے ہیں۔ پھر تم ہی کیوں؟ تم میرا انتخاب تھیں اور مجھے تمہارے علاوہ کسی کو گود نہیں لینا تھا۔ ورنہ میری شادی کو تب تک سولہ برس بیت چکے تھے اور میں نے کبھی کسی بچے کو گود لینے کا نہیں سوچا تھا۔

بات انتخاب کی ہو تو ہر بچہ اپنے والدین سے سوال کر سکتا ہے' بدگمان ہو سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے والدین اسے اس لیے دنیا میں لائے کیونکہ انہیں اپنا گھر قائم رکھنا تھا اور اس بچے کو دنیا میں لاتے وقت وہ اس بات سے بھی بے خبر تھے کہ ان کی گود میں کون سا وجود آنے والا ہے۔ کوئی وجود آنے والا بھی ہے یا ان کا قرب محض وقتی خوشی ہے اور اس کے بعد انہیں تہی دامن رہ جانا ہے' پھر وہ کیسے اس پر حق جتا سکتے ہیں۔

مہر بیٹا چوائس تو انسان کے ہاتھ میں ہوتی ہی نہیں ہے۔ انتخاب کا حق تو سگے والدین کے پاس بھی نہیں ہے۔ وہ یہ تو شاید کبھی کہہ سکیں کہ انہیں بیٹا چاہیے یا بیٹی لیکن یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ انہیں مہر نگار کی جگہ رخسانہ چاہیے یا رخسانہ کی جگہ فرزانہ چاہیے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو

زندگی ہموار ہوتی۔ اس میں کوئی اونچ نیچ پیدا نہ ہوتی۔

لیکن باوجود اس کے کہ والدین کے پاس اولاد کے انتخاب کا حق نہیں ہوتا' وہ والدین ہی ہوتے ہیں اور اولاد پر ان کا حق ہوتا ہے۔ یہ حق کون دیتا ہے انہیں؟ یہ حق انہیں تب ملتا ہے جب وہ اولاد کے لیے جان مارتے ہیں۔ ان کی پرورش کی سب ذمے داریاں پوری کرتے ہیں۔ انہیں بہترین تعلیم و تربیت سے مزین کرتے ہیں اور تب یہ حق خود ان کی اولاد ان کو دیتی ہے۔ یہ والدین پر احسان نہیں ہوتا۔ ان کی برسوں کی محنت اور ریاضت کا پھل ہوتا ہے اور اچھی اولاد بلکہ سب اچھے انسان ان والدین کی' ان افراد کی قدر کرتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی انہی کے لیے وقف کر دی ہوتی ہے جنہوں نے ان کے ساتھ بھلائی کی ہوتی ہے۔ ان کے لیے تکلیفیں جھیلی ہوتی ہیں۔

ہاں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو سب کچھ جاننے اور ماننے کے باوجود بھی چشم پوشی کرتے ہوئے اپنی راہیں جدا کر لیتے ہیں تو ان سے اپنا حق مانگنا بے کار ہوتا ہے۔ محبت کی چیز محبت سے حاصل کی جاتی ہے لڑائی جھگڑے سے نہیں۔''

وہ خاموش ہو گئی' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ یوں لگا جیسے کہنے کے لیے اس کے پاس بہت کچھ ہو لیکن اب وہ کچھ کہہ نہ پا رہی ہو۔

میرے لیے یہ سب باتیں غیر اہم تھیں۔ میرا اب بھی یہی خیال تھا کہ اس عورت نے مجھے پال پوس کر مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ ان میاں بیوی کو ایک اولاد کی ضرورت تھی سو قرعہ فال میرے نام نکلا اور میں اس گھر میں آ گئی۔ مجھے پالنے میں ان کی اپنی غرض زیادہ تھی۔

''بہرحال ماں صرف اور صرف وہ عورت ہوتی ہے جو جنم دیتی ہے اور باپ صرف اور صرف وہ مرد ہوتا ہے جس کا خون اولاد کی رگوں میں گردش کرتا ہے۔ میں کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتی کہ جو کچھ آپ نے میرے لیے کیا وہ مجھ پر احسان تھا یا آپ کی کوئی غرض' میں صرف اور صرف اپنے ماں باپ کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ وہ کون ہیں اور کہاں ہیں؟''

وہ عورت شیشے کی دیوار کے پار دیکھتی رہی بہت دیر تک' پھر گہری سانس لے کر میری جانب مڑی۔

''تم جاننا چاہتی ہو اور میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔'' اس نے چند ثانیے کے لیے نکھیں موندیں اور جب کھولیں تو میرے چہرے پر جمے ہونے کے باوجود وہ مجھے نہیں دیکھ ہی تھیں' وہ آنکھیں' ماضی کی دُھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔ ''میری شادی کو بمشکل چند دن ہوئے تھے۔ میں اور اقبال امی کی طرف رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ باہر سردیوں کی بارش چھما چھم رس رہی تھی اور اندر ڈائننگ روم میں ہم سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تم نے وہ گھر نہیں یکھا' وہ پرانا گھر دریا کے بالکل کنارے پر واقع تھا۔ بہت بڑا اور بہت خوبصورت۔ بوندوں کی آواز میں جب دریا کی لہروں کی آواز بھی شامل ہو جاتی تھی تو ماحول کی دلکشی میں اور بھی ضافہ ہو جاتا تھا۔

ابھی ہماری باتیں جاری تھیں' بارش کا زور بھی تھا جب اچانک بیل بجنی شروع ہوئی۔ تیز اور مسلسل یوں لگتا تھا گویا کوئی گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ کر کھڑا ہو گیا ہو۔

''ارے یہ کون ہے؟'' امی نے کہا۔

''ممکن ہے' گھنٹی میں پانی پڑ گیا ہو۔ اس سے بھی بجنے لگتی ہے۔'' اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

''پھر بھی دیکھنا تو چاہیے' کہیں کوئی غریب بارش میں نہ بھیگتا رہے۔'' امی بولیں۔ پھر ملازمہ کو آواز دی۔ ''پروین ذرا دیکھنا تو کون آیا ہے۔''

''خدایا گھنٹی چیختی جا رہی ہے۔ میرے تو کان دُکھنے لگے ہیں۔'' مجھے اُلجھن ہونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد گھنٹی کی آواز آنا بند ہو گئی۔

''شکر ہے۔'' تقریباً سبھی کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

ہم سب ایک مرتبہ پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو چکے تھے جب پروین بدحواسی میں بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟''

''بیگم صاحب جی باہر ایک عورت بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ بہت بری حالت ہے اس کی سانس تو آ رہی ہے لیکن لگتا ہے بچے گی نہیں۔''

ہم سب ہی باہر کی طرف بھاگے۔ پروین نے ٹھیک کہا تھا۔ اس کی حالت بہت بری

تھی۔ نہ جانے کون تھی وہ اور کہاں سے آ رہی تھی۔ اس کے کپڑے اور بال پانی میں بھیگے ہوئے تھے اور ہونٹ نیلے ہو رہے تھے' جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ بات یہیں تک ہوتی تو بھی خیر تھی' مسئلہ یہ تھا کہ اس عورت کے ہاں کسی بھی وقت ولادت متوقع تھی۔

اسے اندر لا کر بستر پر لٹایا گیا۔ اس سے متعلق تمام تر معاملات خود بخود دادی اماں نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

''اللہ جانے کون ہے' کہاں سے آئی ہے لیکن ہے تو انسان۔ نہ جانے کس امید سے اس گھر کی گھنٹی بجائی ہو گی غریب نے۔'' ان کا خیال تھا۔

''اماں! کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ کیا پتا...... کون ہے' کس گھر کی ہے' کہیں گھر سے بھاگ کر تو نہیں آئی۔ الٹا پولیس کیس نہ بن جائے۔'' پھوپھو بولیں۔

''ارے پولیس والے کیا کریں گے' میرا بیٹا اتنا بڑا فوجی افسر ہے پھر کیا غریب بے سہارا عورت کو مرنے کے لیے باہر بارش میں چھوڑ دوں۔ قتل ہو گا یہ اور ایک بھی نہیں دو دو قتل۔'' وہ مُصر تھیں۔

گھر میں گاڑی نہیں تھی' ابا جی کام سے راولپنڈی گئے ہوئے تھے اور وہی گاڑی لے گئے تھے۔ باہر شدت کی بارش میں تانگہ ملنا بھی ناممکن تھا۔ لہٰذا گھر میں ہی اس کا علاج شروع ہوا۔

دادی اماں کے حکم پر سب ہی اس کی خاطرداری میں مصروف ہو گئے تھے۔ میری نئی نئی شادی تھی۔ شاید اسی کا خیال کر کے دادی اماں نے اپنے احکامات مجھ پر صادر نہیں کیے۔ ورنہ شادی سے پہلے اپنے اور گھر کے بھی تمام تر کاموں کے لیے وہ مجھے ہی دوڑائے رکھتی تھیں۔

میں قریب ہی بیٹھی بغور اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ عورت نہیں لڑکی تھی۔ بمشکل بیس بائیس سال کی' اس کا انداز' اس کے کپڑے بتا رہے تھے کہ وہ کسی غریب اور کم تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ دیکھنے میں وہ بے حد خوبصورت تھی۔ ہاں سردی اور بخار کی شدت کی وجہ سے اس کا حسن دبا دبا سا لگ رہا تھا۔

''تم اب اپنے بیڈروم میں جاؤ' اقبال انتظار کر رہا ہو گا۔'' امی نے مجھ سے کہا۔

''چلی جاتی ہوں۔'' میں نے کہا۔ میرا دل اس لڑکی کے لیے بوجھل تھا۔ نہ جانے کن حالات کا شکار ہو کر وہ یہاں تک پہنچی تھی۔

''چلی جاتی ہوں کیا مطلب' اُٹھو اور جاؤ۔ کیوں میاں کو انتظار کرواتی ہو۔'' دادی اماں نے گھورا۔

اس گھر میں دادی اماں کا سکہ چلتا تھا۔ یہ اور بات کہ انہوں نے کبھی اس بات کا ناجائز فائدہ نہیں اُٹھایا تھا۔ میرے لیے بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کی بات ٹال سکتی لہٰذا اُٹھ کر اپنے بیڈروم میں چلی آئی۔

صبح گھر میں افراتفری محسوس کر کے میں بیڈروم سے نکلی تو پتا چلا کہ وہ لڑکی صبح کے قریب ڈلیوری کے دوران فوت ہوگئی تھی جبکہ اس کی بچی زندہ تھی۔ ہم میں سے کسی کی اس کے ساتھ واقفیت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ ہم تو اس کا نام بھی نہیں جانتے تھے پھر بھی گھر کے سب افراد کو دکھ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ عورتوں میں یہ احساس کہیں زیادہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکی نے کتنی امید سے گھر کی گھنٹی بجائی ہوگی لیکن ہم اس کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ دادی اماں اور امی تو باقاعدہ رو رہی تھیں۔

وہ دن بہت عجیب تھا۔ ایک اجنبی عورت کی لاش ہمارے گھر میں پڑی ہوئی تھی اور اس کی زندہ بیٹی دادی اماں کی گود میں تھی۔ ہمیں کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی۔
جو چند ایک باتیں اس نے دادی اماں سے کی تھیں' وہ بھی اس کی شناخت کا ذریعہ نہ تھیں۔

''میں نے بہت دُکھ اُٹھائے ہیں' خدا کے لیے میرے بچے کو تنہا مت چھوڑنا' اسے دُکھ مت دینا۔ اگر اسے دُکھ ہی دینا ہے تو یہیں اسے ختم کر دینا' میرے وجود کے اندر۔'' اس نے کہا تھا۔ بہت بے ربط اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں۔

گھر کے مردوں نے پولیس کو خبر کی۔ انہوں نے ضروری کارروائی کی' لیکن لڑکی کے گھر والوں کا کچھ بھی پتا نہ چلا۔ بالآخر اس کی تدفین کی ذمے داری بھی ہمارے گھر والوں نے ہی اُٹھائی۔

بہت دنوں تک بحث ہوتی رہی کہ اس کی بیٹی کو کس کے حوالے کیا جائے۔ عورتیں اس معاملے میں بہت جذباتی ہو رہی تھیں' خاص طور پر دادی اماں کا کہنا تھا کہ وہ اس ننھی سی جان کو دنیا کی بھیڑ میں گم نہیں ہونے دیں گی۔ وہ مسلسل کہہ رہی تھیں۔

''اس کی ماں کی آخری خواہش تھی کہ اس کی اولاد سکھ اور خوشی سے زندگی کے دن گزارے۔ اسے کسی یتیم خانے میں دے آئے تو کیا خبر اس پر کیا بیتے۔''

''مگر اماں آخری خواہش پوری کرنا کوئی مذہبی فریضہ نہیں ہے۔'' ابا جی نے کہا۔

''اخلاقی اور انسانی فرض تو ہے ناں کہ یہ بھی نہیں ہے؟ تم اسے اپنے پیسوں کا نہ کھلانا۔ اس کی روٹی کا بندوبست میں کرلوں گی۔ میرے ہاتھ میں اور کچھ نہ رہا تو اپنی روٹی اسے کھلا دوں گی۔ تم فکر نہ کرو' تم پر یہ بوجھ نہیں بنے گی۔'' دادی اماں کو غصہ آ گیا۔

''اماں ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو یہ سوچ کر کہہ رہا تھا کہ اس میں بہت سی قباحتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ آخر یہ بچی بڑی ہوگی' اس کی تعلیم و تربیت شادی بیاہ اور سو طرح کے جھنجھٹ ہوں گے۔ وقت گزرنے کے ساتھ مشکلات بڑھتی جائیں گی' تب یہ بھی ممکن نہیں رہے گا کہ اسے کسی یتیم خانے میں داخل کرایا جاسکے۔'' ابا جی نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''تم نہ کرنا اس کی تعلیم و تربیت اور شادی بیاہ' میں اور میری بہو مل کر کر لیں گے۔ تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے میں نے بچے پالے ہی نہیں ہیں۔ ماشاءاللہ سات بچوں کی ماں ہوں۔ بیٹیاں بیاہ دی ہیں۔ اور بیٹے میری دعاؤں سے افسری کر رہے ہیں۔ کیا میں بچی ہوں جو اونچ نیچ نہیں سمجھ سکتی؟ میں جانتی ہوں کہ اسے کیسے پالا جائے گا۔'' انہوں نے دوٹوک بات کہہ دی۔

ہمارے ابا جی بھی اپنے والدین کے بہت فرمانبردار تھے۔ دادی اماں کے اصرار کے سامنے انہوں نے بھی گردن جھکا دی اور وہ خوبصورت بچی آسیہ کے نام سے ہمارے گھر میں پرورش پانے لگی۔

شادی کے بعد میرا میکے میں آنا جانا کم ہوگیا تھا۔ سسرال لاہور میں تھی اور میکہ جہلم میں۔ پھر اقبال کے ساتھ مجھے تو کبھی کہیں اور کبھی کہیں جانا پڑتا تھا۔

جب بھی میں جہلم جاتی تھی تو خاص طور پر آسیہ کا جائزہ لیتی تھی۔ وہ دن بدن پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوتی جارہی تھی۔ بچی تھی تو سارے گھر میں دوڑتی پھرتی تھی۔ دادی اماں اس پر صدقے واری ہوتی رہتی تھیں۔ امی البتہ اس پر سختی بھی کرتی تھیں۔

''اماں! میں نہیں سمجھتی کہ آسیہ کو گھر کے افراد میں شامل کیا جانا چاہیے۔ مجھے یہ مناسب نہیں لگتا۔'' امی دادی سے کہتیں۔

''اس میں غیر مناسب کیا ہے؟''

''یہ اسی کے لیے بہتر ہے کہ یہ اس ماحول سے خود کو جدا سمجھے۔ اسی ماحول کو اپنا سمجھنے لگی

توکل کو یہ بھی چاہے گی کہ اس کی شادی کسی ڈاکٹر، انجینئر یا آرمی افسر سے ہو۔ یوں مشکل ہو جائے گی۔'' امی کہتیں۔

''کیا مشکل ہو جائے گی۔'' دادی اماں کو غصہ آ جاتا۔ ''یہ کہ تمہاری بیٹیوں کا مقابلہ کرنے لگی ہے؟ کیا فرق پڑتا ہے اگر اس کی شادی بھی تمہاری بیٹیوں کی طرح کسی ڈاکٹر یا آرمی افسر سے ہو جائے؟ اپنے نصیبوں کا کھا رہی ہے اور کھاتی رہے گی۔ تم نہ بولا کرو درمیان میں۔''

''اماں ہر کوئی اپنے نصیبوں کا ہی کھاتا ہے، لیکن یہ بھی تو سوچیں کہ اردگرد دور تک سبھی جانتے ہیں کہ اس کی پیدائش کن حالات میں ہوئی تھی۔ نہ یہ علم کہ ماں کون تھی، نہ یہ خبر کہ باپ کون تھا۔ ایسے میں اسے اچھا سا رشتہ کہاں سے ملے گا؟ اور جو مل بھی گیا تو سسرال والوں کو کیا بتائیں گے؟ اچھے گھروں میں یونہی تو رشتے طے نہیں ہو جاتے۔ لڑکی ہی نہیں پورے خاندان کو دیکھا جاتا ہے۔ نیک نامی دیکھی جاتی ہے۔ اماں بہت مشکل ہو جائے گی پھر بجائے اس کے کہ تب اسے زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔ ابھی سے اس کی تربیت اس نہج پر کریں کہ بعد میں اسے کسی قسم کی دقت نہ ہو۔ اس کی شادی کسی عام سے خاندان میں، کسی عام سے شخص کے ساتھ ہو تب بھی یہ خوش اور مطمئن رہ سکے۔''

امی کی یہ بات تھی جس نے دادی اماں کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کا دل اب بھی نہیں مانتا تھا کہ آسیہ کو عام نوکرانیوں کا درجہ دے دیں۔ سو انہوں نے درمیان کا راستہ نکالا۔ اسے پڑھایا، لکھایا، سینا پرونا اور پکانا سکھایا۔ اس کی کچھ فرمائشیں پوری کیں اور کچھ کو رد کیا لیکن سب سے اہم کام یہ کیا کہ اس کی رہائش بدل کر اسے کوارٹر میں جگہ دے دی۔ ہمارے گھر کے عقب میں نوکروں کی رہائش کے لیے چند کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ آسیہ انہی میں سے ایک میں پروین کے ساتھ رہنے لگی۔

پروین بیوہ تھی اور اس کے دو بچے تھے۔ بیٹی کی وہ شادی کر چکی تھی اور بیٹا لاہور میں کہیں ملازم تھا۔ ہفتہ وار چھٹی پر وہ ہمیشہ گھر آیا کرتا تھا۔ خاص دنوں کی چھٹیوں میں بھی وہ ماں کے پاس ضرور آتا تھا۔ بیٹی بھی کبھی کبھار اپنے بچوں کے ساتھ رہنے آ جاتی تھی۔ وہ شادی کے بعد پنڈ دادنخان جا چکی تھی۔

یوں آسیہ متضاد صورتوں کے درمیان پرورش پانے لگی۔

مجھے ہمیشہ اس سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی تھی میں سوچتی تھی کہ اس قدر حسین لڑکی کا تعلق اگر کسی اونچے گھرانے سے ہوتا تو اس کے حلقۂ احباب میں اس کی دھوم ہوتی۔ وہ ذرا قد نکالتی تو اس کے لیے رشتوں کا ڈھیر لگ جاتا۔

میں جب بھی جہلم جاتی تھی، وہ بہت خوشی کے ساتھ میرا استقبال کرتی تھی۔ اپنی کتابیں، کاپیاں مجھے دکھاتی تھی۔ اپنی کاڑھی ہوئی چادریں اور کُرتے، قمیصیں میرے پاس لے آتی تھی۔ میرا کمرا بطور خاص سجا کر رکھتی تھی۔ کبھی میرے لیے دوپٹا اور کبھی قمیص کاڑھ کر مجھے تحفتاً دیا کرتی تھی۔ کبھی اپنے کمرے میں لے جاتی وہ پورا کوارٹر اس کی محنت سے چمکا ہوا نظر آتا تھا اور اس کا اپنا کمرا تو بہت خوبصورتی سے سجا ہوتا تھا۔ میں داد دیئے بنا نہ رہ پاتی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ آسیہ میٹرک میں آ گئی۔ کہتے ہیں کہ جوانی میں چڑیل بھی حسین ہو جاتی ہے وہ تو پھر حسن کا شاہکار تھی۔ شاید یہ اس کا حسن ہی تھا جس نے کسی کو اس کی جانب متوجہ کیا تھا۔ مجھے اس قدر علم ہے کہ ایک دن اچانک گھر والوں پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ پچھلے کافی دنوں سے وہ پریشان اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ یوں جیسے اپنے آپ میں نہ ہو، یوں جیسے کوئی غم اسے اندر ہی اندر کھا رہا ہو۔ گھر کے اور اتنے بکھیڑے تھے کہ کسی نے اس بات پر توجہ نہ دی۔ اس کے امتحان ہونے والے تھے۔ وہ بہت لائق تھی، لیکن امتحان کے نام سے ہمیشہ گھبراتی تھی۔ سب نے یہی سمجھا کہ اب بھی وہ امتحان سے گھبرا رہی ہو گی۔ زیادہ وقت وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر گزار دیا کرتی تھی۔

پھر جس دن یہ دھماکا ہوا دادی اماں تو چکرا کر گر ہی پڑیں۔ ضبط کی پوری کوشش کے باوجود آسیہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ دادی اماں کو ہوش آیا تو انہوں نے اسے بری طرح سے پیٹ ڈالا۔

''کون ہے وہ بدبخت؟ بتا دے ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔'' وہ اسے مارتے ہوئے چلا رہی تھیں۔

لیکن اس کے ہونٹوں پر تالے تھے اور یہ تالے پھر نہ کھلے۔

اگلے دن وہ صبح گھر پر نہیں تھی۔

مجھے خبر ہوئی تو میں فوراً جہلم پہنچی۔ دادی اماں اب تک اس صدمے سے سنبھل نہ سکی تھیں۔ میں پہنچی تو مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

''کہاں کمی چھوڑی میں نے اس کی تعلیم و تربیت میں' کیوں میرے ماتھے پر یہ داغ لگا گئی۔ کیوں ایسا کیا اس نے؟''

''اماں جانے دیں۔ اچھا ہوا دفع ہوگئی۔ کیا نہیں دیا ہم نے اسے' وہ سب بھی جو اس کا حق نہیں تھا۔ پڑھایا لکھایا' اس کی فرمائشیں پوری کیں۔ یہ صلہ دیا اس نے ہمیں۔ پتا نہیں اپنی ماں کی بھی جائز اولاد تھی یا نہیں۔'' امی کے انداز میں دکھ بھی تھا اور تلخی بھی۔

''امی! عورت اکیلی قصور وار نہیں ہوا کرتی۔ کہیں خود سے تو بچہ نہیں لے آئی تھی۔ وہ کوئی تو تھا جو اس جرم میں برابر کا شریک تھا۔ وہ اس گھر میں رہتی تھی۔ یہ آپ لوگوں کا فرض تھا کہ اس کی دیکھ بھال کرتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس حال کو پہنچا کر بے یار و مددگار چھوڑ دینے والا اسی چار دیواری میں رہنے والا کوئی فرد ہو۔'' میں نے غصے سے کہا۔

اب سے پہلے میں نے آسیہ کے لیے صرف ہمدردی محسوس کی تھی لیکن اس روز میں اس سے محبت محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ بہت پیاری' بہت معصوم لڑکی تھی' خود سے ایسا کوئی قدم اٹھانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا یقیناً کوئی شخص اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس مقام تک لایا تھا۔

یہ وہ مقام تھا جہاں آسیہ سے تمام تر محبت کے باوجود بھی دادی اماں بھڑک اُٹھیں۔

''اس چار دیواری میں رہنے والا کیوں؟ یہاں شریف اور خاندانی لوگ رہتے ہیں۔ میں پھر تمہارے منہ سے ایسی بے ہودہ بات نہ سنوں۔''

''شریف اور خاندانی لوگوں میں بھی رذیل نکل ہی آتے ہیں۔ اسے اس لیے کٹہرے میں لے جا کر کھڑا کر دیا کہ وہ عورت ہے' گناہ کا بوجھ اس کے وجود سے چھلکتا دکھائی دیتا ہے اور جس نے یہ بوجھ اس پر لادا' وہ بے قصور ہے کیونکہ وہ مرد ہے' رات کی تاریکی کا فائدہ اُٹھا کر بچ نکلا ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' امی مجھ سے بھی اونچی آواز میں بولیں۔ ''اپنے باپ بھائیوں پر کیچڑ اُچھالتے تمہیں شرم بھی نہیں آتی۔''

''میں کسی پر کیچڑ نہیں اُچھال رہی' جس نے ملا ہے خود اپنے منہ پر کیچڑ ملا ہے۔ آپ تو دادی اماں بہت انصاف پسند اور نرم دل بنتی ہیں کیا آپ نے پتا لگانے کی کوشش کی کہ اسے اس حال تک کس نے پہنچایا؟ نہیں' کیونکہ آپ کو ڈر تھا کہ اس غلیظ فعل میں اس شریف خاندان کے اعلیٰ خون والا کوئی فرد بھی شامل ہو سکتا ہے۔'' میں نے غصے میں کہا۔

''تم حد سے بڑھ رہی ہو۔'' امی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے تھپڑ کھینچ ماریں۔

''بس بس بہت ہوگئی۔ کیا میں سمجھ نہیں سکتی کہ وہ کس کا بچہ لیے پھر رہی تھی۔ ظاہر ہے ایک ہی کوارٹر تھا۔ پروین کا بیٹا ہر ہفتے آتا جاتا رہتا تھا۔ یہ کمی کمین لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کون ہو سکتا ہے'' دادی اماں تڑپ کر بولیں۔

اور میں اُن کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ میں کب جانتی تھی کہ آسیہ کس کے وعدوں پر اعتبار کر کے لٹی تھی۔ وہ گھر کی چار دیواری میں داخل ہونے والا کوئی بھی شخص ہو سکتا تھا۔ چاہے میرے میکے کا کوئی مرد ہو' چاہے پروین کا بیٹا' سو میں دادی اماں کو کیا جواب دیتی۔ انہیں آسیہ سے بہت محبت تھی' وہی تو تھیں جنہوں نے اس کی پرورش کی تھی۔ ان کے دل کو جو چوٹ لگی تھی' وہ مجھے نظر آ رہی تھی' لیکن جہاں اپنے خون' اپنے خاندان کی بات آئی' وہاں آسیہ بہت پیچھے رہ گئی۔ اس کا دکھ بہت دور چلا گیا۔ خود کو بہلانے کے لیے انہوں نے جو اندازہ لگایا تھا اپنے ذہن میں اتنی مرتبہ دہرایا کہ وہ شک سے یقین میں بدل گیا۔ ایسی باتیں کہاں چھپی رہتی ہیں۔ سو جو بھی آیا اسے انہوں نے پورے وثوق سے یہی بتایا۔

''پروین کے بیٹے سے منہ کالا کیا تھا آسیہ نے۔''

''کیا اس نے اپنے منہ سے بتایا؟'' آنے والا پوچھتا۔

''تو اور کیا میں یونہی کسی پر الزام دھر سکتی ہوں۔ یہی تو وجہ ہوئی کہ پروین' آسیہ کے بتانے سے ہفتہ دس دن قبل ہی بیٹے کے ساتھ لاہور چلی گئی۔ بس اُسے سن گن مل گئی ہوگی ورنہ کیا اب سے پہلے بیٹا کما نہیں رہا تھا۔ میرے پاس آ کر کہنے لگی کہ بیٹا کہتا ہے اماں اب تجھے کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ کب تک دوسروں کے برتن مانجھتی رہے گی۔ اب میں اس قابل ہوں کہ تجھے چارپائی پر بٹھا کر کھلا سکوں۔''

میں نے کہا بھی کہ پروین تیرا بیٹا کیا نیا نیا کمانے لگا ہے؟ ابھی تو زمین سے اُگا نہیں تھا کہ تُو نے اسے کام پہ لگا دیا تھا۔ میری بات سن کر کہنے لگی کہ بڑی بیگم صاحب! اب ہڈ پیر میں جان نہیں رہی۔ میں نے کہا پھر جا میں نے کون سا تجھے باندھ کر رکھا ہوا ہے۔

میری عقل پر پردے پڑ گئے کہ اسے یوں جانے دیا۔ اس وقت خبر ہوتی اس معاملے کی تو ماں بیٹے دونوں کو حوالات کی ہوا کھلاتی۔ آخر کو میرے بیٹے افسر ہیں۔''

آنے والے افسوس کرتے۔ سر ہلا ہلا کر کہتے کہ نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا اور چائے پی

کر اپنے گھروں میں چلتے بنتے اور میں ٹیرس پر بیٹھ کر دریا کی گھٹتی بڑھتی لہریں دیکھ کر سوچا کرتی کہ دادی اماں نے شریف خاندان کے سب شریف زادوں کو کتنی خوبصورتی سے بچا لیا تھا اور وہ بے سہارا لڑکی دنیا کی بھیڑ میں نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ جہاں نہ جانے اور کتنے بھیڑیے اس کے منتظر ہوں گے۔

''میں زیادہ دن وہاں نہیں رہی۔ کچھ تو مجھے غصہ تھا۔ امی اور دادی اماں بھی مجھ سے کھنچی کھنچی سی تھیں اسی دوران ہماری پوسٹنگ پشاور سے لاہور ہو گئی۔ ہم وہاں چلے آئے' لیکن وقت گزرنے کے باوجود بھی میں آسیہ کو بھول نہیں سکی تھی۔ انہی دنوں ہم نے کھیوڑہ کی کانیں اور کلر کہار کے پہاڑ دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ ہمارے ساتھ کچھ اور افسروں کی فیملیز بھی تھیں۔ ہمارا ارادہ وہیں پر لانگ ویک اینڈ گزارنے کا تھا۔ رہائش کا انتظام پنڈ دادنخان میں کیا گیا تھا۔

ہم کھیوڑہ کی نمک کی کانیں دیکھ کر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں میری نگاہ سڑک کے کنارے چلتی پروین کی بیٹی پر پڑی۔ وہ پیدل تھی اور ہم جیپ پر جا رہے تھے۔

''جیپ روکیں اقبال۔'' میں نے کہا۔

''کیا ہوا خیریت تو ہے؟'' انہوں نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

''مجھے لگ رہا ہے کہ وہ پروین کی بیٹی ہے۔'' میں نے کھڑکی سے اس جانب جھانکا جہاں سے وہ عورت چلتی آ رہی تھی۔ کافی عرصے بعد میں نے اسے دیکھا تھا اور اب یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ پروین کی ہی بیٹی تھی۔

''کمال کرتی ہو تم بھی۔ اب پروین کی بیٹی سے بھی علیک سلیک کرو گی' دفع کرو۔'' انہوں نے جیپ اسٹارٹ کی۔

''پلیز اقبال جیپ مت چلائیں۔ میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔'' میں نے کہا حالانکہ خود مجھے بھی علم نہیں تھا کہ میرا اس سے ملنا کیوں ضروری تھا۔

اقبال چاہتے تو نہیں تھے' لیکن میری ضد کے آگے انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اتنے میں وہ بھی قریب آ چکی تھی۔ اتنے عرصے میں وہ قدرے فربہ ہو چکی تھی۔ چہرے پر کچھ کرختگی بھی پھیل گئی تھی مگر اس میں شک نہیں کہ وہ پروین کی بیٹی ہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پہچان لیا تھا۔

''چھوٹی بی بی آپ یہاں کہاں؟'' وہ حیران تھی۔

میں نے مختصراً اسے اپنے وہاں آنے کے متعلق بتایا پھر پروین کے بارے میں پوچھا۔

''وہ تو صادق کے ساتھ لاہور ہی ہوتی ہے۔ دو ایک مہینے میں صادق کی شادی بھی کرنے والی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تم مجھے اس کا پتا دے سکتی ہو؟'' میں نے اقبال کے چہرے پر پھیلنے والی بیزاری کو نظر انداز کر دیا۔ میں خود بھی نہیں جانتی تھی کہ آخر مجھے پروین سے مل کر کیا کرنا تھا۔ شاید یہ فطری تجسس تھا جو آسیہ کے اوپر ہونے والے ظلم کا کھوج لگانے پر اُکسا رہا تھا۔

اس کی بیٹی نے کافی لمبی کہانی سناتے ہوئے مجھے پروین کا پتا بتایا۔ اقبال کا صبر بھی جواب دے رہا تھا' اس لیے میں اس سے مزید کچھ نہ پوچھ سکی۔

لاہور میں پہلی فرصت میں' میں دیئے ہوئے پتے پر جا پہنچی۔ یہ گلبرگ کے اندر واقع ایک کچی آبادی کا پتا تھا۔ جگہ ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں ہوئی کیونکہ پروین کی بیٹی خاصی تفصیل کے ساتھ مجھے علاقے کا نقشہ سمجھا چکی تھی۔

چھوٹے سے اس کچے گھر کے باہر پانی جوہڑ کی صورت میں کھڑا ہوا تھا۔ مکھیوں اور مچھروں کی بہتات تھی۔ وہیں پر بطخیں بھی دانا دنکا چن رہی تھیں۔ لکڑی کا شکستہ دروازہ کھلا ہوا تھا اور سامنے ٹاٹ کا پیوند لگا پردہ جھول رہا تھا۔ کچھ دیر باہر کھڑے ہو کر میں سوچتی رہی کہ گھر والوں کو کس انداز میں اپنے آنے سے مطلع کروں۔ پھر پردہ اُٹھا کر اندر جھانکا۔ سامنے صحن میں بچھی چارپائی پر پروین اپنے گیلے بال سلجھا رہی تھی۔ میں بلا جھجک اندر داخل ہو گئی۔ اسی لمحے پروین کی نگاہ بھی مجھ پر پڑی۔

''بی بی جی آپ؟'' وہ اچانک مجھے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''آئیں یہاں.... یہاں پر بیٹھیں۔'' اُس نے جلدی سے اُٹھ کر پہلے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ پھر شاید اسے میرے لیے غیر مناسب سمجھ کر قریب پڑی کین کی کرسی کو اپنے دوپٹے سے جھاڑنے لگی۔

''اس گھر کے بھاگ کھل گئے بی بی آپ کیسے آئیں؟''

وہ میرے سامنے بچھی جا رہی تھی اور میں اس کی پُرخلوص مہمان نوازی دیکھ کر شرمندہ ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں اسے اصل موضوع پر لائی۔

''پروین! سنا ہے بیٹے کی شادی کر رہی ہو۔ اللہ مبارک کرے۔ کون سی لڑکی پسند کی بہو بنانے کے لیے؟'' میں نے چائے کی پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔ کہیں اندر نہ جانے کیوں میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ وہ آسیہ کی وجہ سے اپنے بیٹے کی شادی کرنے کی جلدی میں ہے اور اب جب کہ آسیہ بھی غائب ہے' کیا خبر وہ پروین اور اس کے بیٹے کے پاس چلی آئی ہو اور پروین اسی کو بہو بنانے والی ہے۔

''بس جی ہم نے کون سے بڑے گھر کی لڑکی لانی ہوتی ہے۔ ہمارے اپنے جیسی ہے جو کچے گھر میں کبھی خوش' کبھی خفا رہے گی' لیکن اسی دیوار کے پیچھے زندگی گزار دے گی۔ ہماری زندگی تو ایسی ہی ہوتی ہے اور ہماری دنیا بھی یہی ہے۔'' وہ بولی۔

اپنے سوال کے جواب میں مجھے آسیہ کا کوئی سراغ نہ ملا تو میں نے براہِ راست سوال پوچھنے کا ارادہ کرلیا۔

''پروین! تمہیں خبر ہوئی آسیہ کی؟ میرے دل کو بہت دھکا لگا اس کے متعلق جان کر۔''

''نہیں جی' مجھے کیا خبر ہونی ہے آسیہ کی۔'' اس نے نگاہیں چرائیں۔

اُس کا جھوٹ پکڑنے میں مجھے ایک لمحے سے بھی کم وقت لگا۔ اوّل تو اس کا انداز ہی یہ بتا دینے کے لیے کافی تھا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے اور پھر وہ آسیہ کے انکشاف سے پہلے ہی اپنے بیٹے کے ساتھ لاہور آ چکی تھی۔ اس نے اتنے برس ہمارے گھر کام کیا تھا کہ اس کی فطرت کا تجسس مجھ سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اگر وہ کچھ نہ جانتی تو میری بات سن کر میرے قریب کھسک آتی اور رازداری سے پوچھتی۔

''ہائے بی بی! کیا کر دیا آسیہ نے؟ جلدی بتائیں' میرا تو دل بند ہونے لگا ہے۔''

جب کہ اس کے برعکس وہ کہہ رہی تھی کہ اسے کیا خبر آسیہ کی۔

''تو کیا دادی اماں کا اندازہ درست تھا؟ کیا پروین کے بیٹے نے اس پر ظلم کیا تھا؟'' میں نے سوچا۔

''لیکن کیسے پتا چلاؤں کہ اصل بات کیا تھی۔ یہ کب مانے گی کہ اس معصوم لڑکی کو اس کا بیٹا بھیڑیا بن کر ٹکرایا تھا۔''

تھوڑی دیر خاموشی کے ساتھ میں سوچتی رہی کہ اس سے کیسے حقیقت اگلواؤں۔ پھر اچانک ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی۔ وہ برسوں ہماری ملازمت کرتی رہی تھی اب بھی

سے اپنے رعب داب سے مرعوب کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

''تم نے کیا ہم سب کو بیوقوف سمجھ رکھا ہے کہ تمہاری اور تمہارے بیٹے کی چالاکیاں سمجھ نہیں پائیں گے؟ میں تو اندر کروا دوں گی تمہارے بیٹے کو۔ جانتی ہو ناں کتنے بڑے افسر ہیں میرے میاں۔ پولیس کے چھتر کھا کر تمہیں سب خبر مل جائے گی آسیہ کی۔ کتنے بھروسے سے اُسے تمہارے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ میں تو کہتی ہوں کہ تمہاری مرضی سے تمہارے بیٹے نے اس کے ساتھ منہ کالا کیا۔'' میں نے اپنے لہجے کو حتی المقدور سخت کیا۔

مجھے نہیں امید تھی کہ وہ اس قدر دہشت زدہ ہو جائے گی' بلکہ میرا خیال تو یہ تھا کہ ابھی اسے دھمکیوں کی ایک اور ڈوز بھی دینی پڑے گی' لیکن وہ تو اتنی سی بات سن کر ہی میرے قدموں میں گر گئی۔

''ارے' ارے یہ کیا کر رہی ہو؟'' اسے ایسا کرتا دیکھ کر میں خود بھی گھبرا گئی۔

مگر اس نے میرے پاؤں نہ چھوڑے۔

''بی بی! مجھ سے قسم لے لیں' اللہ پاک کی قسم' اس کے سچے رسول کی قسم' مجھ پر اللہ کی مار پڑے جو میں جھوٹ بولوں۔ میرے بیٹے نے کچھ نہیں کیا۔ وہ بالکل بے قصور ہے۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے بی بی' میرے سفید سر پر کالک نہ ملو۔ اپنی بیوگی میں نے اسی بیٹے کے سہارے کاٹی ہے بی بی! اُسے کچھ نہ کہنا' اس کا کوئی قصور نہیں۔'' وہ روتے ہوئے منت کر رہی تھی۔

اس کی اس آہ و زاری سے میرا دل موم ہو رہا تھا پھر بھی میں نے سختی سے کہا۔

''تو پھر کیا سارا قصور آسیہ کا ہے؟ وہ گئی تھی تمہارے بیٹے کے پاس؟''

''بی بی! مجھے خبر نہیں ہے کہ وہ کس کے پاس گئی تھی میں کوڑھی ہو کر مروں اگر میرے بیٹے نے اسے ہاتھ بھی لگایا ہو۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں میرے بیٹے کو کچھ نہ کہنا وہ بالکل بے گناہ ہے۔''

''تو پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ آسیہ ماں بننے والی ہے تم تو اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی لاہور چلی آئی تھیں۔''

''مجھے کچھ خبر نہیں تھی' قسم لے لیں مجھ سے' میری قبر میں کیڑے پڑیں' مجھے سانپ بچھو کاٹیں اگر میں جھوٹ بولوں۔'' وہ پہلے سے زیادہ شدت سے رونے لگی۔

میں نے اسے واپس چارپائی پر بٹھایا اور بولی۔

''تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو گی تو میں بھی پولیس کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔''

اس نے شکر گزاری سے میری طرف دیکھا۔

''میں نے آپ کے گھر کا نمک کھایا ہے۔ جب میرے سر کا سائیں بھری جوانی میں مجھے دو بچوں کی نشانی دے کر دور چلا گیا تو آپ کے گھر میں ہی مجھے پناہ ملی۔ میں یا میری اولاد احسان فراموش نہیں ہے۔ میں کیسے نمک حرامی کر سکتی ہوں؟

میرا صادق تو پہلے بھی کہتا تھا کہ اماں اس لڑکی کو یہاں پناہ نہ دے پتا نہیں کس کا گناہ لیے پھر رہی ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں پولیس پکڑ کر لے گئی تو ہماری سفارش کرنے والا بھی کوئی نہ ہوگا' وہیں جوتیاں کھاتے رہیں گے' پر میرا دل نہیں مانتا تھا۔ اتنے عرصے کا ساتھ تھا' اتنے دن تو جانور کے ساتھ رہنے پر اس سے بھی محبت ہو جاتی ہے وہ تو پھر انسان کی اولاد تھی۔

جب میں وہیں جہلم میں تھی تو آسیہ کو دیکھ کر مجھے لگتا تھا جیسے وہ کسی بات کی فکر کر رہی ہے۔ پہلے کی طرح خوش خوش نہیں لگتی تھی مجھے پھر ایک دن میں نے اس کے کمرے میں تکیے کے نیچے سونے کی ایک بھاری زنجیر دیکھی' مجھے بہت حیرت ہوئی۔ بڑی بیگم صاحب اس پر مہربان تھیں۔ اسے سونے کی بالیاں بھی بنوا کر دی تھیں۔ کیا خبر زنجیر بھی بنوا دیتیں پر اتنی بھاری زنجیر تو وہ بھی اسے نہ دیتیں اور پھر انہوں نے اتنی قیمتی چیز دی ہوتی تو کیا مجھے خبر نہ ہوتی؟ نوکروں سے کس بات کا پردہ ہوتا ہے۔

ابھی میں زنجیر ہاتھ میں لیے دیکھ ہی رہی تھی کہ وہ کمرے میں آ گئی۔

''ماسی! تمہیں بڑی اماں بلا رہی ہیں۔'' وہ میرے قریب آتے ہوئے بولی۔

اُسی لمحے اس کی نگاہ میرے ہاتھ میں پکڑی زنجیر پر پڑی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے وہ زنجیر مجھ سے جھپٹ لی۔

''یہ ...... یہ ...... اسے اٹھانے کی کیا ضرورت تھی تمہیں؟'' اس کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ وہ بات بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

''اتنی قیمتی زنجیر تمہارے پاس کہاں سے آئی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''تمہیں اس سے کیا' جاؤ بڑی اماں بلا رہی ہیں۔'' اس نے زنجیر مٹھی میں بند کر کے ہاتھ کمر کے پیچھے کر لیا۔

''مجھے کیا' مجھے کچھ کیوں نہیں ہوگا۔ آخر اس گھر کا نمک کھایا ہے میں نے سچ سچ بتاؤ تم

نے چوری تو نہیں کی؟''

''نہیں ماسی! قسم سے میں نے چوری نہیں کی۔'' وہ گھبرا گئی۔

''پھر یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟''

''مجھے ملی تھی۔'' اس نے بمشکل کہا۔

''کہاں سے ملی تھی؟''

''ایک سہیلی نے دی تھی۔''

''وہ کون سی سہیلی ہے تمہاری جو سونے کے زیور تحفے میں دیتی ہے۔ سچ سچ بتاؤ' ورنہ میں بڑی بیگم صاحب کے پاس لے جاؤں گی۔''

لحہ بہ لحہ اس کا رنگ اُڑتا جا رہا تھا۔

''یہ مجھے دریا کے کنارے پڑی ملی تھی۔ اچھی لگی اس لیے میں نے رکھ لی۔'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''تو پھر گھر میں کسی کو بتایا کیوں نہیں' کیوں چوروں کی طرح چھپائی؟''

''مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ بڑی اماں کو بتایا تو وہ مجھ سے لے لیں گی' کہیں گی کہ اس پر تمہارا حق نہیں ہے' ہم مسجد میں اعلان کروائیں گے جس کی زنجیر ہوگی وہ آ کر لے جائے گا مگر ماسی' یہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے لے لے تم بڑی اماں کو مت بتانا۔'' اس نے آنکھیں صاف کر کے منت بھرے لہجے میں کہا۔

میں ٹھہری بیوقوف عورت اور پھر آسیہ اتنی اچھی لڑکی تھی' اس نے بھلا پہلے کب جھوٹ بولا تھا۔ سو میں نے اس کی بات کو سچ مان لیا اور دل میں سوچا کہ اسے زنجیر اچھی لگتی ہے تو چلو اسی کے پاس رہنے دو۔ اگر زنجیر کا مالک اس کی حفاظت نہیں کر سکا اور وہ دریا کے کنارے گر گئی تو یہ آسیہ کا قصور تو نہیں ہے۔

پھر ایک رات جب آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے کہ کسی بھی وقت بارش برس پڑے گی۔ میں نے آسیہ کو بہت پریشان دیکھا۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی پہلے تو اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا پھر بڑی بیگم صاحب کے ڈانٹنے پر بھی صرف چند لقمے لیے۔

شام سے ہی وہ گھر بھر میں بولائی بولائی پھر رہی تھی۔ کبھی اس کمرے میں تو کبھی اس کمرے میں' کبھی نیچے والے آنگن میں تو کبھی اوپر کے صحن پر۔

"کیا ہوا ہے تجھے آسیہ؟ تک کر کیوں نہیں بیٹھ رہی۔" بالآخر میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں‘ کچھ بھی نہیں۔" وہ ایک پل میں گھبرا گئی اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

میں جلدی سو جاتی ہوں۔ ہمیشہ کی طرح اس رات بھی بستر پر لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ ویسے تو میری نیند خاصی گہری ہے۔ سارا دن کام کر کے جب تھک ٹوٹ کر بندہ بستر پر پڑتا ہے تو ظاہر ہے نیند بھی کچی نہیں آتی مگر اس رات میری دو مرتبہ آنکھ کھلی پہلی مرتبہ جب مجھے کوارٹر میں کھٹ پٹ کا احساس ہوا تو میں نے سمجھا کہ کوئی دروازہ کھلا رہ گیا ہے اور بلی اندر گھس آئی ہے۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن اُٹھنا ہی پڑا۔ کمرے سے نکلی تو سامنے ہی آسیہ کالی چادر لیے باہر نکلتی نظر آئی مجھے خاصی حیرت ہوئی۔

"تو کہاں جا رہی ہے؟"

"مم... میں... میں ماسی بڑی اماں کے پاس جا رہی ہوں‘ مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" اس نے کہا۔

یوں اکثر ہو جاتا تھا۔ وہ رات کو اپنے کوارٹر سے نکل کر بڑی بیگم صاحب کے پاس چلی جاتی تھی۔" میں مطمئن ہو گئی نیند کا بھی غلبہ تھا۔

"اچھا! دروازہ بند کرتی جانا‘ کہیں بلی نہ گھس آئے۔" میں نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

وہ بمشکل کوارٹر سے نکلی ہو گی کہ میری آنکھ لگ گئی۔ دوسری مرتبہ میری نیند رونے کی آواز سے ٹوٹی پہلے تو میں سمجھ ہی نہ پائی کہ مسلسل آنے والی یہ آواز کیسی ہے اور کہاں سے آ رہی ہے۔ ذرا کان لگائے تو اندازہ ہوا کہ آواز آسیہ کی ہے اور اسی کے کمرے سے آ رہی ہے۔ وہ بہت شدت سے رو رہی تھی۔ کبھی جیسے خود پر قابو پانے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ میں اس کے کمرے تک پہنچی تو دروازہ کھلا تھا۔

بارش پوری شدت کے ساتھ جاری تھی اور بتی بھی نہیں تھی۔ اٹکل سے میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے بستر کے پاس پہنچی۔

"آسیہ‘ آسیہ کیا ہوا؟ خیر ہے کیوں رو رہی ہو؟ تم تو بڑی بیگم صاحب کے پاس گئی تھیں نا؟"

اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی‘ لیکن پا نہ سکی اور پہلے سے بھی زیادہ رونے لگی۔

"کیا ہوا‘ کچھ بولو تو سہی‘ اس کمبخت بتی کو بھی ابھی جانا تھا۔ تم ہی کچھ پھوٹ دو منہ سے کیا ہوا؟"

بہت مشکل سے وہ بولی۔ "ماسی چوٹ لگ گئی ہے۔"

"کہاں لگی چوٹ؟"

وہ پھر رونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔ "یہاں آتے ہوئے بارش میں پھسل گئی تھی گھٹنا چھل گیا ہے۔"

"مجھے تو تم نے ڈرا ہی دیا۔ میں نے سوچا پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ اور تم تو بالکل بھیگ گئی ہو۔ کیا مصیبت پڑی تھی اتنی بارش میں آنے کی صبح بارش تھمنے پر آ جاتیں۔"

اندھیرے میں اسے چھونے سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ بری طرح بھیگ چکی تھی۔

وہ کچھ نہ بولی۔

"اب اس اندھیرے میں کیا کروں تمہارے گھٹنے کا‘ ایک تو یہاں موم بتی بھی نہیں ہے۔"

"تم جاؤ ماسی‘ سو جاؤ‘ میری فکر مت کرو۔" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

میں اسے دلاسہ اور تسلی تشفی دے کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور سو گئی۔ صبح سویرے ہی میرا بیٹا صادق لاہور سے آ گیا کہنے لگا۔

"اماں! بس بہت دھو لیے تم نے برتن‘ اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ تمہیں چارپائی پر بٹھا کر کھلا سکوں۔"

وہ میرے لیے ریشمی جوڑا بھی لایا تھا۔ اس دن کا کب سے انتظار تھا مجھے‘ اپنی خوشی میں مگن ہو کر میں آسیہ کو بھول ہی گئی۔ یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ رات کو کتنا رو رہی تھی۔ دوپہر کو میں نے بڑی بیگم صاحب سے اجازت لی اور صادق کے ساتھ یہاں آ گئی۔

میں سب کو خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلنے لگی‘ تو آسیہ میرے گلے لگ کر بہت روئی۔

"ماسی! تمہارے جانے سے میں کوارٹر میں بالکل اکیلی ہو جاؤں گی۔ کتنے عرصے کا ساتھ تھا۔ جب سے میں نے آنکھ کھولی تمہیں اپنے ساتھ پایا۔ کیا ہے جو تم یہیں رہ جاؤ۔"

"پگلی! میں کون سا دور جا رہی ہوں۔ صبح بس پکڑو اور دوپہر کو لاہور پہنچ جاؤ۔ کبھی میں آ

جاؤں گی کبھی تم آ جایا کرنا۔ ابھی صادق کی شادی کروں گی اس پر تم ضرور آنا۔ ہم سب مل کر لاہور کی سیر کریں گے۔ جب دل چاہے چٹھی لکھ دینا۔ میں صادق سے پڑھوا لیا کروں گی۔''
میں نے اسے تسلی دی۔ آنے سے پہلے میں نے اسے یہاں کا پتا بھی دے دیا۔

پھر کچھ دن بعد ایک دوپہر بالکل اچانک وہ یہاں آ گئی۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر میں بہت حیران ہوئی۔ خیر بٹھایا' خیریت وغیرہ پوچھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے رو پڑے گی۔ اس کا چہرہ بھی بالکل زرد ہو رہا تھا۔ میں بار بار اس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ اکیلی یہاں کیسے آ گئی اور وہ ٹال رہی تھی۔

''دیکھ آسیہ مجھے سچ سچ بتا کہ تو اکیلی کیسے آ گئی۔ بڑی اماں نے تجھے کسی کے بغیر کیسے بھیج دیا؟'' میں نے اس سے دوٹوک لفظوں میں پوچھا۔ اسے یوں دیکھ کر ہی میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

وہ مضطرب ہو گئی پھر بے چینی سے اپنی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر بولی۔

''ماسی! مجھے اپنے پاس رکھ لو میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔''

''ہیں' ہیں! کیا بکواس کر رہی ہے۔ اتنے بڑے گھر میں مالکوں کی طرح نہ سہی لیکن رہ تو رہی ہے۔ کسی نے تجھے نوکر بھی تو نہیں سمجھا۔ کیا کر کے نکلی ہے وہاں سے' جلدی سے بتا میں کان سے پکڑ کر تجھے وہاں واپس چھوڑ آؤں گی۔''

''نہیں ماسی!'' وہ ایک دم رو پڑی۔ ''میرا کوئی نہیں ہے۔ نہ گھر بار نہ رشتہ دار' میں کیا کروں' کہاں جاؤں؟''

''کیا کر کے آئی ہے وہاں پر جلدی بتا'' میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔

اس نے اپنی مٹھی کھول دی۔ گوری ہتھیلی پر سو روپے کا سرخ نوٹ پڑا ہوا تھا جس میں نمی رچی ہوئی تھی اور جا بجا ٹیپ لگا کر جوڑا گیا تھا۔

''ماسی! میرے پاس یہی ہے۔ تم یہ رکھ لو لیکن مجھے اپنے پاس رہنے دو بس چند ایک مہینے کے لیے پھر میں چلی جاؤں گی۔ میری آخری امید تم ہی ہو۔ تم نے بھی سہارا نہیں دیا تو میں جان دے دوں گی' دریا میں کود جاؤں گی یا ریل کی پٹڑی پر لیٹ جاؤں گی۔ تمہیں اللہ اور اس کے رسول کا واسطہ۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

میں ہکا بکا اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ اس سے قبل مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا اس حد

تک احساس نہیں ہوا تھا۔ کوئی لڑکی یوں محبت بھرا گھر چھوڑ کر در بدر ہو جائے اور پھر پناہ کی تلاش میں بھٹکتی پھرے وہ بھی صرف چند مہینے کے لیے تو معاملے کی تہہ تک پہنچنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ وہ رو رہی تھی۔ مجھے اپنا دم نکلتا محسوس ہو رہا تھا۔

''آسیہ! یہ کیا کیا تو نے' بدبخت' کم ذات' کوئی شرم حیا نہ آئی تجھے' کچھ خدا' رسول کا خوف نہ ہوا۔''

وہ پہلے سے زیادہ شدت سے رونے لگی۔

''اللہ تجھے غارت کرے تجھے یہ بھی پاس نہ آیا کہ بڑی بیگم صاحب نے کیسے تجھے پالا پوسا تھا۔'' میں اسے کوستی رہی اور وہ روتی رہی۔

پھر تھوڑی دیر بعد ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور چادر سر پر ڈال کر خاموشی سے باہر کی طرف چل دی۔

''کدھر دفع ہو رہی ہے اب؟'' میں اس کے پیچھے بھاگی۔

''خودکشی کرنے' اپنی جان دینے جا رہی ہوں۔ میرا کوئی نہیں ہے اس جہان میں۔'' وہ پھر رو پڑی۔

''جان ہی دینی تھی تو چلو بھر پانی لیتی اور اس میں ڈوب مرتی۔ چل اب اندر آ۔ باہر نکلے گی تو لوگ کتوں کی طرح تیرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ اب اندر مر یوں تو تجھے نہیں جانے دے سکتی۔'' میں اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے آئی۔

کیا کرتی' وہ میرے ہاتھوں میں پیدا ہوئی تھی۔ اس گھر میں ہم سب نے مل کر اسے پالا تھا۔ وہ مالکوں کو پیاری تھی تو ہم نوکروں کو بھی اپنے بچوں جیسی لگتی تھی۔ غصہ اپنی جگہ لیکن ایسے وقت میں اسے کیسے اکیلا چھوڑ سکتی تھی۔ اس کی معصوم صورت دیکھ کر غصہ یوں بھی اتر جاتا تھا۔

میں سوچ رہی تھی کہ صادق کام سے آئے گا تو اسے کیسے یہ سب کچھ بتاؤں گی اور پھر یہ اکیلی تو نہیں اردگرد کتنے گھر ہیں۔ کیا بتاؤں گی کہ آسیہ کون ہے۔ وہ نہ صرف دیکھنے میں حسین ہے بلکہ اپنے اٹھنے بیٹھنے کے انداز کی وجہ سے بھی ہم میں سے نہیں لگتی۔ بے شک وہ ملازموں میں سے نہیں تھی لیکن اس کا ہر انداز بڑے گھرانوں کی لڑکیوں جیسا تھا۔ پھر یہ غریبوں کی بستی ہے یہاں امیروں کی طرح لوگ دور دور نہیں رہتے۔ پہلے ہی دن سے آنے والے سب ہوا تک کا پتا معلوم کر لیتے ہیں ایسے میں کتنا مشکل تھا اسے شکوک کی زد سے بچانا۔

"دیکھ آسیہ! یہاں کسی سے زیادہ بات نہ کرنا۔ ادھر لوگوں کو دوسروں کی بہت کرید لگی رہتی ہے۔ میں کہہ دوں گی کہ تیرا سسرال میرے پرانے مالکوں کے گھر کے ساتھ تھا۔ گھر والا حادثے میں مر گیا تو سسرال والوں نے نکال دیا۔ ماں باپ پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں' دنیا میں اب کوئی نہیں رہا' لاچار ہو کر میرے پاس آ گئی ہے۔"

وہ خاموشی سے سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔

"مگر وہ کم ذات کون تھا جس سے منہ کالا کیا۔" بالآخر میں نے کافی دیر سے ذہن میں گردش کرتا سوال اس سے دریافت کیا۔

"ماسی! کم ذات تو ہم ہیں' میں اور تم' وہ تو بہت اونچے گھر کا تھا' اونچی ذات والا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تھا کون' کچھ تو بتا' میں مالکوں کو بتاؤں گی' وہ ضرور تیری مدد کریں گے۔ دیکھ بڑی بیگم صاحب تجھے کتنا چاہتی ہیں۔"

"کچھ نہ پوچھنا ماسی' تجھے قرآن کی قسم' پھر یہ سوال مت پوچھنا' یوں بھی اب کیا رکھا ہے۔ میں ایسی نہیں تھی جیسا اس نے مجھے بنا دیا۔ میں نے کب کسی کو جھوٹ بولتے دیکھا تھا۔ اس نے تو مجھے طوائف بنا دیا۔ دیکھو یہ سو روپیہ میری ہتھیلی پر رکھ گیا۔ میری معصومیت' میرے کنوارپن اور میری عزت کی قیمت کے طور پر۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس کے بعد میں نے بہت مرتبہ اس سے جاننا چاہا لیکن اس نے اپنے ہونٹ سی لئے تھے۔ اس شخص کے متعلق یہ اس کی پہلی اور آخری بات تھی۔ بعد میں میرے ہر سوال پر ...س بند کر لیتی یا گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگتی تھی۔

اس شام صادق گھر آیا تو وہ بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پہلے تو یہی سوچتا رہا کہ بڑی بیگم صاحب لاہور آئی ہوں گی تو اسے یہاں چھوڑ دیا ہوگا۔ دو ایک دن میں وہ ان کے ساتھ واپس چلی جائے گی۔ یوں بھی صادق عورتوں سے زیادہ بات چیت پسند نہیں کرتا' اس لیے سلام دعا کے بعد نہ اس نے آسیہ سے کچھ پوچھا' نہ آسیہ نے ہی کچھ بتایا۔

رات کو کھانے کے بعد جب میں نے باہر اس کا بستر لگایا تو اس نے پوچھا۔

"اماں! یہ کب تک یہاں رہے گی؟"

میں تو خود موقع کی تلاش میں تھی۔

"ابھی تو آئی ہے غریب' کچھ دن تو رہے گی ناں۔"

"اماں! ہمارا کون سا بڑا سا گھر ہے۔ ایک کمرا ہے دوسرا کچھ عرصے بعد ہی بن سکتا ہے' دو ایک دن کی بات اور ہے' گزارا ہو جائے گا اس سے زیادہ مشکل ہوگی۔ یوں بھی اچھا نہیں لگتا کہ جوان جہان لڑکی' جس سے رشتہ داری بھی نہ ہو' اسے زیادہ دن گھر میں رکھا جائے پھر مجھے بھی دقت ہوگی۔"

"اب یہ یہیں رہے گی۔" میں نے چاہا کہ اسے درست بات بتا دوں۔

"یہیں رہے گی کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ......" میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

صادق کسی صورت اسے رکھنے پر تیار نہیں تھا۔

"اماں! تم نے گندگی کی پوٹ اپنے گھر میں رکھ لی تاکہ یہاں نئے گل کھلائے۔ بے عزت کر کے نکلوائے گی' ہمیں یہاں سے' پلس سے چھتر لگیں گے سو الگ۔ تمہیں کچھ تو عقل سے کام لینا چاہیے تھا۔" وہ بھڑک اٹھا تھا۔

دیر تک ہمارے درمیان بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ صادق تو اسی وقت اسے دھکے دے کر باہر نکالنے پر تیار تھا' لیکن میں سامنے آ گئی۔

"یہ اس گھر میں نہیں رہے گی تو میں بھی نہیں رہوں گی' اپنا گھر خود سنبھالو۔" میں نے اپنی چادر سنبھالی۔

یہ وہ بات تھی جس نے صادق کو ٹھنڈا کیا اور وہ آسیہ کو رکھنے پر آمادہ ہو گیا' لیکن جب تک وہ گھر ہوتا تھا چپ چاپ گھر کے کام کرتی آسیہ پر طنز کے تیر برساتا رہتا تھا۔ یہ وہی تھی کہ اس کا حقارت آمیز سلوک برداشت کرتی رہی۔

مگر اب چند دن پہلے جب سے صادق کی بات طے ہوئی ہے تب سے وہ کسی بھی صورت اسے برداشت کرنے پر تیار نہیں تھا۔ بہت مجبور ہو کر میں نے آسیہ کو اسی دائی کی طرف بھجوا دیا ہے' جو اس کا کیس کرے گی۔

میرے ہاتھ میں اب کچھ نہیں تھا۔ وہ دائی ایسے کیس بھی کر لیتی ہے۔ اب تو آسیہ کا بچہ ہونے والا ہی ہے۔ دیکھیں دو ایک دن کی بات ہے اس کے بعد وہ کہاں جاتی ہے' اللہ مالک ہے۔ میں پھر کوشش کروں گی کہ اسے سر چھپانے کا ٹھکانہ مل جائے اور اب تو وہ اکیلی بھی نہیں

ہوگی' دو جی کو کیسے سنبھالوں گی میں' صادق بھی راضی نہیں ہے اسے رکھنے کے لیے' کہتا ہے اماں کسی دن اس لڑکی کی وجہ سے پلس جوتے لگانے آ جائے گی۔ کہاں جائے گی جوان جہان لڑکی ایک بچے کے ساتھ۔''

پروین کہہ چکی تو کتنی دیر تک میں کچھ بھی نہ بول پائی میرے ذہن میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔

''آسیہ کے پیٹ میں کس کا بچہ ہے' وہ کون انسان تھا جسے آسیہ کے حسن اور جوانی نے شیطان بنا دیا تھا۔ کیا وہ اس چار دیواری میں رہنے والا' اسی گھر کا کوئی فرد تھا جس نے برسوں پہلے اس کی ماں کو پناہ دی تھی؟'' یہ سوچتے ہوئے میرا دل کانپ کر رہ گیا۔ ''کیا میرا کوئی بھائی؟ یا نوجوان بھتیجے؟''

''ماسی! کم ذات تو ہم ہیں' میں اور تم' وہ تو بہت اونچے گھر کا تھا' اونچی ذات والا۔'' آسیہ نے کہا تھا۔

''وہ جھوٹ بول رہی ہوگی۔ بکواس کر رہی ہوگی' الزام لگا رہی ہوگی۔'' میں نے سوچا' لیکن اس سوچ میں کوئی وزن نہ تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی خود ہی اس کو رد کر دیا۔

''اگر اسے جھوٹ ہی مان لیا جائے تو بھی کہیں تو سچ تھا پھر وہ سچ کہاں تھا؟ کہہ دینے کے لیے' بتا دینے کے لیے اس کے پاس بہت کچھ تھا' مگر وہ ایک لفظ بھی نہیں بتا رہی تھی تو کیسی بکواس اور کیا الزام۔ اسے بکواس کرنی ہوتی یا الزام لگانا ہوتا تو حقیقت سے اس کے علاوہ کون باخبر تھا وہ کسی کا بھی گریبان پکڑ لیتی تو اسے کون روک سکتا تھا؟''

بہت دیر بعد میں پروین سے مخاطب ہوئی۔

''میں آسیہ سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''اس نے مجھے قسم دی ہے کہ کوئی بھی اس کے متعلق پوچھنے آئے تو میں کچھ بھی نہ بتاؤں۔'' پروین نے تامل سے کہا۔

''میں ''کوئی'' نہیں ہوں۔'' مجھے غصہ آ گیا۔

''اس نے مجھے صادق کی قسم دی ہے' بس اس سے زیادہ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔'' وہ مجبور نظر آ رہی تھی۔

''میں ہر حال میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''اب کیا کرنا ہے جی؟'' اس کے انداز میں افسردگی اتر آئی۔ ''عزت تو وہ گنوا بیٹھی ہے' بدنامی کی کالک الگ چہرے پر مل لی۔ اس کا حق اسے دلائیں تو کوئی بات ہو ورنہ زخم کھرچنے کا کیا فائدہ؟ وہ تو رو رو کر' سوچ سوچ کر جھلی ہوگئی ہے۔''

میری آنکھوں کے سامنے اپنے میکے کے مردوں کے چہرے آ گئے۔ کیا میں ایسے کسی سلسلے میں ان پر دباؤ ڈال سکتی تھی؟ ہرگز نہیں' کس میں اتنی ہمت ہوتی ہے کہ اپنے کردار کی سیاہی لوگوں کے سامنے دکھا سکے۔ عورت کا وجود اس کے گناہ کا اشتہار بن جاتا ہے اور مرد صاف بچ نکلتا ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا کبھی اپنا گناہ ماننے پر راضی نہیں ہو سکتا تھا اور میرے پاس کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اسے کسی بھی بات کے لیے مجبور کر سکتی۔

میں آسیہ کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی حالانکہ اس کے دکھ میں میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ بے بس لاچار لڑکی جو اتنی معصوم تھی کہ جھوٹ سچ میں تمیز نہ کر سکی اور کسی شکاری کے جال میں پھنس گئی۔ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اتنا بھی نہیں کہ اسے اپنے گھر لے آتی کیونکہ اس کے ساتھ بدنامی کی گندگی بھی میرے گھر میں آ جاتی اور اپنے گھر میں' میں اکیلی نہیں تھی۔ مروجہ معیار کے مطابق میرا میکہ اور سسرال دونوں باعزت تھے۔ میکے میں تو آسیہ یوں بھی اب نہیں گھس سکتی تھی کہ وہاں آدھا شہر دادی اماں سے افسوس کرنے آیا تھا۔ خاندان کے ہر گھر سے کوئی نہ کوئی فرد انہیں تسلی دلاسا دینے ضرور پہنچا تھا اور پھر خود دادی اماں کے دل میں جو خدشہ تھا اور جس نے ان کے ذہن میں آئے بے بنیاد خیال کو یقین میں بدل دیا تھا۔ اب وہ کیسے آسیہ کا وجود اپنے گھر میں برداشت کر سکتی تھیں۔

''اگر کہیں سچ مچ وہ صادق کے بجائے اسی گھر کا کوئی مرد تھا تب؟'' ان کے ذہن میں یہ خیال آنا ناگزیر تھا۔

اور اس خیال کے آنے کے بعد آسیہ کو وہاں پناہ ملنے کی کیا گنجائش ہو سکتی تھی۔

اور دوسری طرف میری سسرال تھی جو میری شادی کے سولہ برس بعد مجھ سے مکمل طور پر بیزار ہو چکی تھی کیونکہ میری گود خالی تھی۔ انہیں ایک بہانا چاہیے تھا۔ میرا آنگن سونا تھا لیکن اس میں میری کوئی خطا نہیں تھی' پھر بھی میں اس لیے سزاوار تھی کیونکہ میں نے اپنے شوہر کا بھرم رکھا ہوا تھا۔ انہیں آج تک یہ علم نہیں تھا کہ اگر یہ کوئی جرم ہی تھا تو قصوروار میں نہیں' ان کا بیٹا' ان کا بھائی تھا۔

میں اور اقبال میاں بیوی ہی نہیں دوست بھی ہیں' ایک دوسرے کی خوشیوں کے ہی نہیں غموں کے بھی ساتھی ہیں' ایک دوسرے کی خوبیوں کے معترف اور خامیوں کے امین' لیکن آسیہ کو لے جانے والا فیصلہ ایسا ہوتا جسے نہ میرا میکہ برداشت کر سکتا تھا اور نہ سسرال۔ یہ دباؤ ہم دونوں کے لیے بہت زیادہ ہوتا۔ اسے امید دلا کر بے سہارا چھوڑ دینے سے بہتر تھا کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میں وہ سب کچھ جو پروین نے مجھے بتایا تھا' اقبال کو بتا دوں گی۔ وہ میری زندگی کے ساتھی اور میرے بہترین دوست ہیں۔ ہم آپس میں ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپا سکتے۔

سو اس شام کو میں نے ان سے سب کچھ کہہ دیا۔ وہ سب بھی جو وہ جانتے تھے اور وہ بھی جو وہ نہیں جانتے تھے' اپنے خدشات تک انہیں بتا دیئے۔ وہ پوری توجہ سے میری بات سنتے رہے۔

''یہ تو کوئی نہیں جانتا کہ آسیہ کی زندگی تباہ کرنے والا کون تھا لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس پر جو کچھ بیتا' اسی گھر کی چار دیواری میں بیتا اس لیے عین ممکن ہے کہ تمہارے خدشات درست ہوں اور تمہارا یہ اندازہ بھی درست ہے کہ وہ جو کوئی بھی تھا' بہر حال اپنا یہ قصور ماننے پر تیار نہیں ہوگا' بلکہ میرا تو یہ اندازہ ہے کہ آسیہ گھر چھوڑنے سے پہلے یہ کوشش کر ہی چکی ہوگی۔'' بالآخر انہوں نے کہا۔

''آپ ہی بتائیں اب کیا کیا جائے۔ میرا دل نہیں مانتا کہ اسے یوں تنہا چھوڑا جائے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی مجرم میں ہوں۔ اس گناہ میں' میں بھی برابر کی شریک ہوں۔ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ اس کی تباہی میرے ماں باپ کے گھر کی چار دیواری میں ہوئی۔ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔''

''میں کیا بتاؤں کہ کیا کیا جائے۔ تمام تر صورت حال تمہارے سامنے ہے۔ ہم اسے اس کے حال پر چھوڑنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔''

اقبال مجھے سمجھاتے رہے' تسلی دیتے رہے' چپ کرانے کی کوشش کرتے رہے مگر غم سے مجھے اپنا کلیجہ پھٹتا ہوا لگ رہا تھا۔ آسیہ کا حسین' معصوم چہرہ بار بار نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا اور پھر یہ سوچ کر کہ وہ جس بچے کو جنم دینے والی ہے' اس سے میرا بھی کوئی رشتہ ہو سکتا ہے۔

اس لمحے سے لے کر آج اس وقت تک مجھے یہ یقین ہے کہ آسیہ کے جسم میں پرورش پانے والی بچی کی رگوں میں کوئی غیر خون نہیں دوڑ رہا تھا۔ وہ ہماری' میرے ماں باپ کے خاندان کی امانت تھی اور ہے۔ آج تک میرے میکے والے اس بات کو ماننے کے لیے راضی نہیں ہیں مگر میں سمجھتی ہوں کہ یہ محض خود فریبی ہے اور کچھ نہیں۔ ہر ایک کے دل میں کہیں بہت اندر یہ خیال ضرور موجود ہے۔ صرف اسے زبان دینے سے سبھی ڈرتے ہیں۔

''آسیہ کا مستقبل کیا ہوگا اقبال؟'' کافی دیر بعد میں نے پوچھا۔

''میرا نہیں خیال کہ اب کبھی خوش قسمتی اس کا در کھٹکھٹائے گی۔'' انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔

''اور اس کے بچے کا مستقبل کیا ہوگا؟''

''وہ اپنی ماں سے جدا تو نہیں ہوگا۔''

''ہاں بیٹا ہوا تو عصمتوں کا سوداگر ہوگا اور بیٹی ہوئی تو اپنی ماں کے مستقبل میں شریک ہو جائے گی۔'' میرے آنسو پھر بہنے لگے۔

''ریلیکس! ہم افسوس کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم ایک معاشرے میں رہتے ہیں اور ISOLATE ہو کر تو نہیں رہ سکتے۔''

''ہم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ یہ سفر کہیں روک دیں۔ یہ سفر دائرے میں نہ چلتا رہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''ہم میں سے کسی کو علم نہیں ہے کہ آسیہ کا باپ کون تھا یا وہ جس شخص کی بیٹی تھی اس سے آسیہ کی ماں کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی اور اب آسیہ ہے' اپنی ماں کی طرح' وہ بھی کسی غیر کے گھر بے یار و مددگار پڑی آنے والے لمحوں کا انتظار کر رہی ہے اور اگر اس نے بیٹی کو جنم دیا تو؟ کہتے ہیں کہ ایک عورت پر برا وقت آئے تو وہ تین نسلوں کی عورتوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ یہ بات درست ہے یا غلط مگر میں اسے دائرے کا سفر نہیں بننے دینا چاہتی۔ اقبال' ہم آسیہ کو نہیں بچا سکتے کہ ہم میں اتنی ہمت اور اتنا حوصلہ نہیں ہے' لیکن اس کے بچے کو تو بچا سکتے ہیں ناں پلیز اقبال! انکار مت کرنا پلیز۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' ان کے انداز میں تذبذب تھا۔

"یہ ہو سکتا ہے، ہم کسی کو نہیں بتائیں گے کہ یہ بچہ کس کا ہے۔ یہ کہہ دیں گے کہ ہم نے گود لیا ہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ آسیہ بیٹے کو جنم دیتی ہے یا بیٹی کو۔ میں اس بچے کو محفوظ مستقبل دینا چاہتی ہوں، جو ابھی اس دنیا میں نہیں آیا جو بے خبر ہے کہ پیدائش سے پہلے ہی اس کے ماتھے پر کیسی سیاہی لگ چکی ہے۔ پلیز اقبال انکار مت کرنا۔"

"تم جذباتی ہو رہی ہو، پہلے اچھی طرح سوچ لو اور پھر کوئی فیصلہ کرو۔ ایسے بچوں کو زیادہ دیر بے خبر نہیں رکھا جا سکتا۔ ہم بہت سے مسائل کا شکار ہو سکتے ہیں۔" وہ بولے۔

"میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ باقی سب پیچھے ہٹ گئے ہیں، لیکن مجھے یہ گوارا نہیں کہ وہ بچہ جو ہمارا خون ہے۔ مستقبل میں مجبور عورتوں کی عصمت و عفت کا سودا کرے یا خود اپنی عزت سرِ عام نیلام کرے۔ یہ ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اس موضوع پر صبح بات کریں گے۔" اقبال نے کہا۔

وہ مجھے سوچنے کے لیے وقت دینا چاہتے تھے۔

اُس روز مجھ سے کوئی کام نہ ہو سکا۔ اپنے بستر پر پڑی... روتی اور سوچتی رہی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میں پہلے سے زیادہ شدت سے یہ چاہنے لگی تھی کہ آسیہ کا بچہ گود لے لوں۔

اقبال آفس سے واپس آئے لیکن میں خاموش ہی رہی شام کو انہوں نے خود ہی یہ ذکر چھیڑا۔

"پھر تم نے کیا سوچا؟"

میں چونک گئی۔ "میں کل والی سوچ پر قائم ہوں۔"

"تو چلو پروین کی طرف چلتے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں نے حیرت آمیز خوشی کے ساتھ ان کی طرف دیکھا۔

"تھینک یو اقبال۔" میری آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ گئے۔

"ہم انسانوں کی بد اعمالیاں ہی ہمیں تنگ کائنات بناتی ہیں اور ہمارا ایک چھوٹا خوبصورت سا فعل ہمیں...... اشرف المخلوقات بنا دیتا ہے۔ اللہ نے ہمیں اشرف المخلوقات ہی بنایا ہے لیکن افسوس ہم تنگ کائنات رہنے پر ہی مُصر ہیں۔" اقبال نے ڈرائیو کرتے ہوئے

کہا۔

"کاش سب ایسے ہی سوچنے لگیں۔" میں نے آہ بھری۔

"اب جب تم فیصلہ کر چکی ہو تو تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ مجھ سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔"

"کیا؟" میں نے ان کی طرف دیکھا۔

"یہ کہ امید دلا کر اس بچے کو راستے میں تنہا مت چھوڑنا اسے اپنا رہی ہو تو اپنا ہی سمجھنا یوں جیسے اسے تم نے ہی جنم دیا ہو۔ میں نہیں کہتا کہ اس کی اچھی بری ہر بات ماننا تمہارا فرض ہوگا۔ البتہ اس کی ہر وہ بات تمہیں ماننا ہوگی جو اپنی سگی اولاد کی مانتیں اور ہر وہ بات رَد کرنی ہوگی جو تم اپنی سگی اولاد کی رَد کرتیں۔ کبھی اسے اس کی ماں کے نام کا طعنہ مت دینا۔ اسے اس کا ہر جائز حق ضرور دینا۔"

"آپ تو مجھے جانتے ہیں اقبال۔ ٹھیک ہے بہت اچھی نہیں ہوں، ہر انسان میں خامیاں ہوتی ہیں، لیکن مجھ میں انسانیت ضرور ہے اور میں محبت کرنا اور اسے نبھانا جانتی ہوں، چاہے اس میں نقصان ہی اٹھالوں۔"

انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"اسی لیے میں تم سے اتنی شدید محبت کرتا ہوں۔"

ہم پروین کے گھر پہنچے۔ اس وقت اس کا بیٹا بھی وہیں تھا۔ مجھے اقبال کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ دونوں ماں بیٹے گھبرا گئے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید ہم انہیں اغوا یا ایسے ہی کسی کیس میں پولیس کے حوالے کرنے آئے ہیں۔ بہر حال میں نے اسے تسلی دی اور اصل موضوع پر آ گئی۔

"میں آسیہ کے متعلق جاننے آئی تھی۔ بچہ ہو گیا یا نہیں؟"

"نہیں، دائی نے بتایا ہے کہ آج رات متوقع ہے۔" پروین بولی۔

"میں اس کا بچہ گود لینا چاہتی ہوں، تم اس سلسلے میں آسیہ سے بات کرو، لیکن یاد رہے یہ نہ بتانا کہ بچہ کون گود لینا چاہ رہا ہے؟"

وہ میری بات نہ سمجھی۔

"بی بی آپ؟ اس کا بچہ گود لیں گی؟"

"ہاں' دیکھو میں اس کے پاس جا نہیں سکتی ورنہ اسے سمجھاتی کہ یہ کتنا ضروری ہے۔"

میں نے اسے سمجھانے کی غرض سے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔

"اس کا مستقبل محفوظ نہیں ہے نہ جانے وہ کہاں کہاں بھٹکے اور کتنے بھیڑیوں کا سامنا کرے۔ اس کا بیٹا ہوا اور اس کے ساتھ رہا تو وہ بھی بھیڑیا بن جائے گا اور بیٹی ہوئی تو کیا خبر اسے پاؤں میں گھنگھرو باندھنے پڑیں یا شاید کسی دن اُسے بھی اپنی ماں اور نانی کی طرح کسی غیر گھر میں کسی بچے کو جنم دینے کے لیے لمحے گننے پڑیں۔ تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات؟ تمہیں اسے سمجھانا ہے۔ میں ہر حال میں اس کا بچہ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

چند لمحے پروین بغور میری جانب دیکھتی رہی پھر اس نے سر جھکا لیا۔

"جی اچھا بی بی۔"

"دیکھو میں ہر حال میں وہ بچہ لینا چاہتی ہوں۔" میں نے دُہرایا۔

اقبال نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے خاموش کروا کر اقبال نے آرام اور سلیقے کے ساتھ اس سے بات کی۔ میرے نزدیک اس وقت صرف ایک بات اہم تھی اور وہ یہ تھی کہ آسیہ جس بچے کو جنم دے میں ہر حال میں اسے گود لے لوں اور یہ کہ اسے یہ خبر نہ ہو کہ بچہ کس نے گود لیا تھا۔

اقبال بات ختم کر چکے تو میں پھر پروین سے مخاطب ہوئی۔

"میں رات بھر جاگتی رہوں گی' یہ میرا فون نمبر ہے۔ تم مجھے اطلاع کر دینا۔" میں نے اقبال کا کارڈ اس کی جانب بڑھایا۔ "لیکن اگر رات گئے فون کرنا پڑا تو تم کہاں سے کرو گی۔ تمہارے گھر تو فون نہیں ہے۔" پھر میں اقبال کی طرف مڑی۔ "ایسا کرتے ہیں کہ ابھی پروین اس دائی کی طرف ہی جا رہی تھی۔ اسے وہاں چھوڑ دیتے ہیں۔ جگہ بھی دیکھ لیتے ہیں پھر ڈرائیور کے ہاتھ گاڑی بھجوا دیں گے۔ رات کے جس بھی پہر ولادت ہوئی' پروین بچہ لے کر ہماری طرف آ سکتی ہے۔ واپس بھی اسے ہم ہی چھوڑ دیں گے۔"

اپنے پرس سے کچھ روپے نکال کر میں نے پروین کی جانب بڑھائے۔ "یہ آسیہ کے علاج اور کھانے کے لیے رکھ لو۔"

اس نے بلا تامل پیسے مٹھی میں دبا لیے۔

گھر جانے سے قبل میں نے بچوں کا کچھ سامان خریدا۔

اس رات میں ایک لمحے کے لیے بھی سو نہ سکی۔ سارا وقت اقبال سے باتیں کرتی رہی۔ کچھ خدشات کچھ امیدیں۔

صبح کے قریب گھر کے گیٹ کے باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ میں تقریباً اُچھل کر بستر سے اُتری اور ننگے پاؤں بغیر دوپٹے کے باہر کی طرف لپکی راستے میں اقبال نے مجھے روکا۔

"تم ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں۔"

میں صدر دروازے سے باہر جھانکتی رہی اور اقبال باہر نکل گئے۔ گیٹ سے گاڑی اندر آئی تو پروین کو بیٹھے دیکھ کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک ننھا منا سا وجود تھا۔ میں اسی حالت میں دوڑ کر باہر نکلی اور اس روئی کے گالوں جیسی نرم بچی کو اس سے تقریباً چھین لیا۔

"جی بچی ہے۔" اس نے کہا پھر اقبال کی طرف متوجہ ہوئی۔ "یہ آپ نے جو پرچا دیا تھا اس پر اس نے دستخط کر دیئے ہیں۔"

میں اب جلد از جلد پروین کو رخصت کرنا چاہتی تھی۔

"ڈرائیور تمہیں چھوڑ آئے گا۔ اور اب تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس بچی پر اس کی ماں کے ماضی کی کوئی پرچھائیں نہیں پڑنے دینا چاہتی۔"

بات کر کے اس کی جانب دیکھے بغیر ہی میں اندر آ گئی۔

بچی کو دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے وہ چاند کا ٹکڑا ہو۔ اتنی خوبصورت' اس قدر حسین کہ میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ کر زور سے پیار کیا۔

تھوڑی دیر بعد اقبال بھی اندر آ گئے۔

"تم یوں باہر نکل آئیں۔ موسم اچھا نہیں ہے۔ بارش بھی ابھی ہی تھمی ہے۔ سردی لگ جاتی تو بیمار پڑ جاتیں۔" وہ پروین کا دیا ہوا پرچا ایک طرف رکھ کر بولے۔

"اس پرچے پر کیا لکھا ہوا ہے؟" میں نے ان کی بات نظر انداز کر دی۔

انہوں نے کاغذ کا وہ ٹکڑا میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے تحریر پر نگاہیں جما دیں۔

"میں آسیہ ولدیت نامعلوم آج بارہ دسمبر 1980ء کی صبح تین بجے بقائمی ہوش وحواس اپنی نومولود بچی جس کی ولدیت ظاہر نہیں کرنا چاہتی اقبال حسن ولد احمد حسن کے حوالے کر رہی ہوں۔ اب اس بچی پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔ نہ ہی مستقبل میں اس سے کسی قسم کا واسطہ رکھوں

گی۔"

نیچے آسیہ کے دستخط تھے۔ میں نے گہرا سانس لے کر اقبال کی طرف دیکھا۔

"اس تحریر کی کیا ضرورت تھی؟"

"تا کہ کل ہم پر کوئی الزام نہ دھرا جا سکے۔ ممکن ہے آئندہ کسی دن آسیہ کو احساس ہو کہ اس نے غلط فیصلہ کیا تھا تو وہ ہم پر بچی کے اغوا کا الزام بھی لگا سکتی ہے۔ اس تحریر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف اس کے تعلقات مشکوک تھے بلکہ اس کی ماں کے متعلق بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یوں اگر وہ بچی واپس لینا چاہے گی تو قانون کے تحت خود بھی پھنسنے کا خدشہ ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ خود کو اور بچی کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لیے مجھے ایسا کرنا پڑا۔"

"اور اگر وہ آپ کو پہچان گئی تو؟"

"اس نام کے تو بے شمار لوگ ہیں' اسی لیے میں نے نام کے ساتھ عہدہ نہیں لکھا تھا۔" انہوں نے بتایا۔

"لیکن آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ بچی ہی پیدا ہوگی بیٹا بھی تو ہو سکتا تھا؟"

وہ ہنس پڑے۔ "مجھے کیسے پتا چل سکتا تھا۔ میں نے دو تحریریں دے کر بھجوایا تھا۔ ایک تحریر بیٹی کے حوالے سے تھی اور دوسری بیٹے کے حوالے سے۔ ساتھ یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ متعلقہ تحریر پر دستخط کروا کے دوسری تحریر بھی ساتھ لے آئی جائے۔ بچہ کس وقت حوالے کیا گیا' یہ بھی بعد میں لکھا گیا ہے۔"

اپنی بیوقوفی پر مجھے خود بھی ہنسی آ گئی۔

آسیہ کی بیٹی میری زندگی میں کیا آئی گویا بہار آ گئی۔ نئی اور خوشگوار مصروفیات نے مجھے گھیر لیا۔ کتنے دن تک تو ہم نام بھی نہ رکھ پائے۔

"دیکھیں یہ زمین پر چاند کا ٹکڑا نہیں لگتی؟ میں اس کا ایسا ہی کوئی نام رکھنا چاہتی ہوں جس میں چاند کا حوالہ ہو۔" میں کہتی تھی۔

اور ہم نے ایسے ناموں کی کتنی طویل فہرست تیار کر لی...... بہت دن بعد اور بہت بحث کے بعد ہم مہر نگار پر متفق ہوئے۔

ہم نے اپنے خاندان میں یہ اطلاع تو کروا دی تھی کہ ہم ایک بچی گود لے چکے ہیں۔

لیکن کسی کو یہ خبر نہیں دی تھی کہ اس کی ماں آسیہ تھی۔ اقبال نے کہہ دیا تھا کہ یہ ان کے کسی دوست کی بچی تھی۔ جس کا اپنی بیوی کے ساتھ حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ سبھی نے ہماری یہ بات تسلیم کر لی تھی۔ میری شادی کو اتنا عرصہ گزر چکا تھا کہ میرے میکے میں ہمارے اس فیصلے کو بہت خوش دلی سے تسلیم کر لیا گیا جبکہ سسرال میں خاصی لے دے ہوئی تھی۔ اقبال کی ماں اور بہنوں نے بہت واویلا مچایا۔ انہیں دوسری شادی کے لیے بھی مجبور کیا لیکن پھر تھک ہار کر وہ بھی خاموش ہو گئیں۔

بہت عرصے تک سبھی سمجھتے رہے کہ تمہارے والدین اقبال کے دوستوں میں سے تھے اور حادثے کا شکار ہو گئے تھے لیکن جیسے جیسے تم بڑی ہوتی گئیں تمہارے چہرے میں تمہاری ماں کے نقوش واضح ہوتے گئے۔ اس نے سب کے سامنے پرورش پائی تھی اور سبھی دیکھ سکتے تھے کہ شکل وصورت کے اعتبار سے تم بچپن سے اسی جیسی تھیں۔ یہ بھی مجھے قدرت کی ستم ظریفی لگتی ہے۔ وہ شخص پھر بچ گیا۔ ہم شاید یہ کبھی نہیں جان پائیں گے کہ وہ کون تھا۔"

مجھے گود لینے والی عورت نے ایک آہ بھر کر اپنی کتھا ختم کی۔

"جان کیوں نہیں پائیں گے۔ میں اسے پاتال سے بھی کھوج نکالوں گی۔" میری نس نس میں دوڑتا نفرت کا زہر میرے لہجے میں بھی واضح تھا۔

میرے لہجے' انداز اور آواز میں چھپے عزم نے اسے خوفزدہ کر دیا۔ "مہر نگار نہیں۔ بس یہ بات یہیں ختم ہو گئی۔ تمہیں اپنی اسی زندگی کی طرف لوٹنا ہوگا۔ جسے تم بتاتی آ رہی ہو۔ اس ساری بات کو بھیانک خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پرے کیا۔ "یہ میری زندگی ہے اور اپنی شناخت تلاش کرنا میرا حق ہے۔ اب تک میری زندگی تم لوگوں نے بتائی ہے۔ آئندہ اپنی زندگی میں خود بتاؤں گی۔"

وہ عورت آنے والے وقت سے خوفزدہ تھی اسے احساس ہو چکا تھا کہ پنڈورا کا جو بکس کھل چکا تھا وہ بند ہونا اب مشکل تھا۔ اس کی منت' اس کے آنسو' واسطے بھی میرا ذہن تبدیل نہ کر سکے۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اپنے ماں باپ کو ضرور تلاش کروں گی۔ صرف ایک بار ان کے چہروں پر تھوکنے کے لیے۔ مجھے ان سے نفرت تھی۔ شدید نفرت۔ مجھے سب سے نفرت تھی' ہر ذی روح سے۔ ہر اس چیز سے جو زمین اور آسمان کے درمیان تھی اور میں اس نفرت کو

مرنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ میں اس کی حفاظت کر رہی تھی۔ خود سے بھی بڑھ کر۔

وہ عورت جسے چند دن پہلے تک میں ماں کہتی آ رہی تھی، وہ اب میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔ اس نے بہت لمبی کہانی سنائی تھی، مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ چونکہ اس نے مجھ سے بے تحاشا محبت کی تھی، اس لیے وہ بھی محبت کیے جانے کے قابل تھی۔

''ہونہہ محبت!'' میں سوچتی۔ ''اس نے اپنے خاندان کے ناموس سے محبت کی تھی۔ اگر اس میں اسی قدر انسان دوستی یا انصاف پسندی ہوتی تو وہ آسیہ کے حق کے لیے اپنے خاندان سے لڑتی چاہے اسے اس کا حق نہ دلا سکتی لیکن کچھ کہتی تو سہی۔ پر وہ کہاں کر سکتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اس کے منہ میں زبان نہیں تھی۔ اس لیے کہ یوں اس کے اپنے خاندان پر کیچڑ اُچھلتا جو اسے گوارا نہیں تھا۔''

ان دنوں میرے پاس سوچنے اور سوچتے رہنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ میں اپنی بیتی ہوئی زندگی کے بارے میں سوچتی رہتی تھی، آنے والے دنوں کے متعلق سوچتی تھی۔ خیالوں ہی خیالوں میں بے شمار مرتبہ اس عورت سے ملی تھی جو میری حقیقی ماں تھی اور اس مرد کا گریبان پکڑا تھا جو میرا حقیقی باپ تھا۔

پھر ایک دن اچانک میں نے سوچا کہ آخر میں اس گھر میں بیٹھی کیا کر رہی تھی؟ یہ میرا گھر نہیں تھا۔ یہاں کے مکین میرے نہیں تھے۔ میرے دل میں ان کے لیے کوئی محبت نہیں تھی۔ پھر میں اب تک یہاں کیوں تھی؟ میں تو اپنی شناخت کھوجنا چاہتی تھی اس زمین کو ڈھونڈنا چاہتی تھی جس میں میری جڑیں تھیں۔ ان لوگوں کو تلاش کرنا چاہتی تھی جو میرے خوابوں اور خیالوں میں فقط سائے تھے لیکن کہیں، نہ جانے کہاں ان کی تجسیم بھی تھی۔

یہ سوچ اتنی اچانک اور اس قدر شدت سے میرے ذہن کے ساتھ چمٹی کہ اس کے بعد اس گھر میں ایک لمحے کے لیے بیٹھنا بھی میرے لیے محال ہو گیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ڈوبتے سورج کی شفق سے آسمان رنگین ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا اسکول بیگ لے کر اسے بستر پر الٹا دیا۔ سب کتابیں اور کاپیاں بے ترتیبی سے وہاں ڈھیر ہو گئیں۔ پھر میں تیزی سے اپنی وارڈ روب کی طرف بڑھی اور چند سادہ سے کپڑے ہینگروں سے اُتار کر بیگ میں ٹھونس دیے۔ دراز میں پڑا اپنا والٹ نکالا جس میں میری پاکٹ منی اور پچھلے مہینوں کی بچت کی رقم پڑی ہوئی تھی۔ بندھے بالوں پر اوپر سے ہی تیزی کے ساتھ برش پھیرا اور جانے کے

لیے تیار ہو گئی۔

مجھے علم نہیں تھا کہ میری منزل کہاں تھی۔ یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہاں تک میں کیسے پہنچ سکتی تھی لیکن یہ خیال بہت قوی تھا کہ یہ گھر بھی میرا نہیں تھا، اور میرے لیے ویسا ہی اجنبی تھا جیسے اتنی بھری پُری دنیا کا کوئی اور گوشہ۔ سو یہاں نہ رہتی کہیں اور چلی جاتی بات برابر تھی۔

بیگ کندھے پر ڈال کر میں لاؤنج سے گزری تو وہاں مجھے گود لینے والے میاں بیوی دونوں بیٹھے شاید میرے ہی متعلق باتیں کر رہے تھے۔ میں نے انہیں نظر انداز کر کے گزرنا چاہا۔ وہ عورت ایک دم گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

''مہر نگار! بیٹا کہاں جا رہی ہو؟''

میں نے اس اجنبی چہرے کی طرف دیکھا۔ ''اس عورت اور مرد کی تلاش میں جو میرے ماتھے کی سیاہی کے ذمے دار ہیں۔'' اور اپنے قدم دروازے کی طرف بڑھا دیے۔

وہ عورت بھاگ کر میرے سامنے آئی اور مجھے کاندھوں سے پکڑ لیا۔ اس کی آواز خوف اور اندیشوں سے کانپ رہی تھی۔

''نہیں مہر......نہیں۔ تم کہیں نہیں جاؤ گی بیٹا سوچو تو سہی کہ انہیں ڈھونڈو گی کہاں اور کیسے؟ اور پھر رات ہونے والی ہے۔ یہ زندگی اتنی آسان نہیں ہے مہر جتنی تم نے سمجھ لی ہے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔'' وہ مجھے قائل کرنے کے لیے جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔ خود اُسے علم نہیں تھا کہ اس کے فقرے بے ربط تھے۔

''مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ زندگی کتنی مشکل ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹک دیا اور قدم بڑھانے لگی۔

مگر اس نے میرا راستہ روک لیا تھا۔

''نہیں مہر! میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔'' وہ رونے لگی۔

میں اسے دھکا دے کر کنارے سے نکلنا چاہتی تھی میرے دھکیلنے کے باوجود بھی وہ پھر میرے راستے میں آ کھڑی ہوئی۔

''مہر! خدا کے لیے مت جاؤ۔ میں، میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔'' وہ میرے قدموں میں جھکنے لگی۔

لیکن اس کے شوہر نے اُسے تھام لیا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے کہ اس بچی کے قدموں میں گرتی ہو جسے خود تم نے پالا ہے۔"

پھر وہ میری جانب مڑا۔

"اپنے کمرے میں چلو۔" انداز تحکمانہ بھی تھا اور سخت بھی تھا۔

"آپ کون ہوتے ہیں مجھے حکم دینے والے۔" میرا لہجہ تیکھا تھا۔

اس کا ہاتھ اُٹھا اور میرے گال پر نشان چھوڑ گیا۔

"میں کون ہوں؟" لہجے میں غصہ بھی تھا اور رنج بھی۔ "میں کچھ نہیں ہوں۔ میرا کوئی رشتہ نہیں ہے تمہارے ساتھ' لیکن تم میرے گھر میں کھڑی ہو اور اپنی پیدائش کے دن سے اب تک یہاں ایک فرد کی حیثیت سے رہتی آ رہی ہو' اس لیے تمہاری عزت کی حفاظت میرا فرض ہے۔ تمہاری خواہش ہے کہ اپنے ماں باپ سے مل سکو' میں اسے پورا کروں گا' اس کے بعد میرا فرض ختم ہو جائے گا۔ تم جانو اور تمہاری ماں یا تمہارا باپ جانے لیکن اس وقت تک تم ہماری ذمہ داری ہو۔"

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی مجھے تو کبھی کسی نے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا' پھر آج یہ تھپڑ کیوں مار دیا تھا مجھے؟ اس ایک لمحے میں مجھ پر بہت کچھ آشکار ہوا تھا۔ یہ کہ میری ذہنی حالت نارمل نہیں تھی۔ مجھے کوئی کندھا چاہیے تھا' کوئی اپنا چاہیے تھا' جس سے میں سب کچھ کہہ سکتی جسے اپنے دکھوں میں شریک کر سکتی اور یہ کہ میرے اپنے بہرحال وہی تھے جنہوں نے مجھے پالا تھا اور مجھ سے بہت محبت کی تھی' ورنہ ان کا کیا بگڑتا تھا۔ چاہے مجھ پر کچھ بھی گزر جاتی۔ یہ تھپڑ بیماری ٹھیک کرنے والا انجکشن تھا۔

اپنی پریشان کن ذہنی حالت میں' میں نے ان کی محبت کے مثبت پہلو دیکھنے سے انکار کر دیا تھا اور میری نگاہ منفی پہلوؤں پر تھی۔ شاید اس کی وجہ میری کم عمری اور ناتجربہ کاری تھی یا پھر یہ شاک ہی اتنا بڑا تھا کہ میری سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتیں مفلوج ہو گئی تھیں۔ میں بھول گئی تھی کہ ان پندرہ برسوں میں ایک مرتبہ بھی انہوں نے مجھ پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ میں ان کی سگی اولاد نہیں تھی' نہ زبان سے نہ عمل سے۔

میں بے اختیار آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گئی۔

"پاپا...... پاپا......" میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ "آئی ایم سوری پاپا میں بہت بری ہوں' بہت ہی بری۔ مگر میں کیا کروں مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو

جاؤں گی' یہ دُکھ مجھ سے سہا نہیں جاتا۔"

وہ اجنبی' ایک لمحے میں میرے اپنے ہو گئے تھے پھر وہی ماں باپ' جنہوں نے میرے لیے اپنا آرام و سکون تباہ کر رکھا تھا۔ میں اپنی پرانی سوچ پر شرمسار تھی۔ کسی بھی غرض سے لیکن مجھے میری ماں سے جدا کر کے انہوں نے ایک ذلت بھری زندگی گزارنے سے بچا لیا تھا' ورنہ شاید کہیں میں بھی پاؤں میں گھنگھرو باندھے ہوتی یا کہیں میری عزت کا بھی سودا ہو رہا ہوتا۔

اگر میں ان کا یہ احسان نہ مانتی تو کیا یہ ناشکرگزاری کی انتہا نہ ہوتی؟

ممی پاپا نے مجھے لا کر صوفے پر بٹھا دیا اور خود دونوں میرے گرد بیٹھ گئے۔ میں بری طرح سے رو رہی تھی۔

"میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ آپ کس تکلیف سے گزر رہی ہیں' مگر بیٹا! جو ہو گیا سو ہو گیا۔ تکلیف دہ باتوں کو بھول جانا ہی اچھا ہوتا ہے۔" پاپا سمجھا رہے تھے۔

☆======☆======☆

دبے پاؤں اور کتنے دن سرک گئے۔ ممی چاہتی تھیں کہ میں پھر سے اسکول جانا شروع کر دوں۔ میری پڑھائی کا بہت حرج ہو رہا تھا مگر اب تو کتابوں میں۔ میری اتنی دلچسپی بھی نہیں رہی تھی' جتنی کہ پہلے ہوا کرتی تھی۔ میرا دھیان بٹانے کے لیے ممی' پاپا مجھے ڈرائیو پر لے جاتے تھے۔ کبھی باہر کھانا کھانے کا پروگرام بناتے تھے' مگر آدھے راستے میں ہی میں رو پڑتی تھی۔ باہر چلتے پھرتے لوگوں کے مقابلے میں مجھے اپنا آپ بہت حقیر' بہت کمتر لگتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سبھی مجھ پر ہنس رہے ہوں' میرا مذاق اُڑا رہے ہوں مجھے اس بری طرح سے روتا دیکھ کر وہ گھر واپس لے آتے تھے۔

ممی' پاپا چاہتے تھے کہ مجھے کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جائیں اور میں چڑ جاتی تھی۔

"آپ کے خیال میں' میں پاگل ہو گئی ہوں؟ میرا علاج کسی ماہر نفسیات کے پاس نہیں ہے' بس میں ایک مرتبہ اپنی ماں اور اپنے باپ سے ملنا چاہتی ہوں' پلیز مجھے ان سے ملوا دیں۔"

اس سلسلے میں پاپا بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ آسیہ کو ڈھونڈنا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرنے کے مترادف تھا۔ اور اب اتنے برسوں بعد پروین کا سراغ پانا بھی بہت مشکل تھا۔ پھر بھی وہ کوشش کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ وہ اور ممی گلبرگ کی اس کچی آبادی کی تلاش میں

بھی نکل چکے تھے۔ مگر اب وہاں شاندار بنگلے تھے۔ اس دائی کا گھر بھی نئی پرانی گلیوں اور مکانوں میں گم ہو چکا تھا۔ پھر یہ بھی کسے خبر تھی کہ اس کہانی کی کڑیاں ملانے والے کردار زندہ بھی تھے یا مر چکے تھے۔ اس کے باوجود پاپا کی کوششیں جاری تھیں۔

مجھے اور ممی کو لگتا تھا جیسے کسی دن اچانک کہیں راہ چلتے ہمیں پروین یا آسیہ مل جائیں گی جب پاپا ایک ایک قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ جب اس کچی آبادی کی زمین پر مکان بنے تو وہاں رہنے والے کہاں گئے۔ اس تحقیق کے نتیجے میں انہیں معلوم ہوا کہ وہاں کے مکین تین مختلف آبادیوں میں بکھر گئے تھے۔ بات تقریباً دس سال پرانی تھی پھر بھی بہت سے لوگوں کی یادداشت میں محفوظ تھی کہ حکومت کے حکم پر کیسے وہ آبادی گرائی گئی تھی اور بہت احتجاج کے باوجود بھی وہاں کے مکینوں کو مختلف مقامات پر ہجرت کرنی پڑی تھی۔

اگلے قدم کے طور پر پاپا ان تینوں کچی آبادیوں میں گئے جس کے متعلق لوگوں نے بتایا تھا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ انہی میں سے ایک آبادی میں چار برس قبل تک پروین اور صادق کے بیوی بچے رہتے رہے تھے۔ پھر انہوں نے گڑھی شاہو میں دو کمروں کا پکا مکان خرید لیا تھا اور اس میں شفٹ ہو گئے تھے۔ تھوڑی مزید تلاش کے بعد ایک ایسا شخص دستیاب ہوا، جسے صادق کے گھر اور اس ورکشاپ پر جہاں وہ کام کرتا تھا، دونوں جگہوں کا علم تھا۔

اُس روز پاپا آئے تو پروین اور صادق کے گھر کا پتا بھی لے آئے۔ میری بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔

''ہم وہاں کب جائیں گے پاپا؟''

''وہاں آپ نہیں جائیں گی۔''

''کیوں؟''

''یہ ضروری نہیں کہ وہاں سے آسیہ کا پتا مل سکے کیا خبر اس نے پروین سے کوئی رابطہ رکھا بھی ہو یا نہیں۔ ممکن ہے پروین ہی اس سے مزید رابطہ نہ رکھنا چاہتی ہو۔ یہ دنیا بہت وسیع ہے اور یہاں اربوں لوگ بستے ہیں۔ کسی ایک فرد کو ڈھونڈ نکالنا مشکل ترین امر ہے۔''

میرے چاہنے کے باوجود ممی، پاپا مجھے پروین کی طرف نہیں لے کر گئے۔ ان کے گیٹ سے نکلتے ہی میں نے ان کی واپسی کا انتظار شروع کر دیا تھا میرا دل بہلانے کے لیے گھر میں

بہت کچھ تھا۔ کتنی فلمیں پڑی ہوئی تھیں میں ٹی وی لگا کر بھی دیکھ سکتی تھی، رومیو سے بھی کھیل سکتی تھی۔ میرے لیے رکھی ہوئی سب جیولری، سارے پرفیوم آرائش کی بے شمار چیزیں، سب کچھ ممی نے مجھے دے دیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہ سب چیزیں میرے شوق کی انتہا تھیں اور آج سب بیکار لگ رہی تھیں۔ کبھی اپنے ڈھیر سارے فرینڈ شپ بینڈز گننا اور سہیلیوں کو دینے کے لیے رنگ برنگی اونوں اور ڈوریوں سے نئے بینڈز بنانا میرا پسندیدہ مشغلہ ہوتا تھا، آج اس میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ لگ رہا تھا۔

ممی، پاپا تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کے بعد واپس آئے۔ کار کے ہارن کی آواز سن کر میں باہر گیٹ کی طرف بھاگی۔ وہ کار میں بیٹھے ہوئے تھے پھر بھی میں ان کے چہروں پر پڑھ سکتی تھی کہ وہ میری ماں آسیہ کا کوئی سراغ لے آئے تھے۔

بہت مشکل سے میں نے ان کے لیونگ روم تک پہنچنے کا انتظار کیا اور ابھی وہ بیٹھ بھی نہیں پائے تھے کہ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''کچھ پتا چلا؟''

''ہاں آسیہ مظفر آباد میں ہے۔'' پاپا نے بیٹھتے ہوئے بتایا۔

''مظفر آباد یعنی آزاد کشمیر میں؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''ہاں۔''

''وہاں کہاں ہیں، ہم جا سکتے ہیں ناں ان کے پاس؟ آپ کو ٹھیک طرح سے پتا ہے ناں کہ وہ وہاں ہیں؟'' میں مضطرب ہو گئی۔

''میرے پاس آ کر بیٹھو۔'' ممی نے کہا۔

میں ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''ہمیں اس کا پتا مل گیا ہے لیکن اب وہ اپنی زندگی میں اپنی دنیا میں سیٹل ہو چکی ہے۔ بہتر ہے کہ اس کی زندگی کو اب کسی مصیبت سے دوچار نہ کیا جائے۔''

ممی کی بات سن کر مجھے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

''اور میری زندگی؟ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے کسی کی نگاہ میں؟'' میں نے ہونٹ کاٹ کر آنکھوں میں آئے آنسو پینے کی کوشش کی۔

''میری جان۔'' ممی نے مجھے خود سے لپٹا لیا۔ ''تمہارے پاس ایک محفوظ گھر ہے۔ ماں

باپ کی محبت ہے۔ بھول جاؤ وہ سب۔ سمجھو وہ عورت تمہیں جنم دیتے ہوئے ہی مر گئی تھی۔''

''وہ مر گئی ہوتی تو میں اس کی لاش بھی قبر سے کھینچ نکالتی۔'' غصے اور بے بسی سے میں چلائی...... آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

''روؤ مت مہر۔ ہم تمہیں اس کے پاس لے جائیں گے۔'' ممی نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے۔

ممی اور پاپا مظفر آباد جانے کا پروگرام بنا رہے تھے اور مجھ سے ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی مسئلے کو حل کرتے ہوئے پہلے ہی پاپا کے بزنس کا کافی حرج ہو رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جانے سے قبل اپنا کچھ کام نمٹا جائیں۔ اس لیے وہاں جانے کا پروگرام مہینہ بھر بعد کا رکھا گیا تھا۔

میرا ذہن وہیں اٹکا ہوا تھا۔ پاپا کی ٹیلی فون انڈکس سے میں نے آسیہ کا مظفر آباد کا پتا اور ٹیلی فون نمبر لے لیا تھا۔ اور رات کو بستر پر لیٹ کر گھنٹوں اس تحریر کو تکتی اور سوچتی رہتی تھی۔

ایسے ہی ایک دن اچانک ایک خیال میرے ذہن میں کوندا۔

''ہاں۔ وہ بہت مطمئن رہ رہی ہے ناں۔ اس پُرسکون جھیل میں کنکر پھینک کر لہریں گننی چاہئیں۔ میں کانٹوں کے بستر پر پڑی ہوں۔ وہ بھی تو انگاروں پر لوٹے۔''

☆======☆======☆

وہ چمکتی ہوئی نسان پٹرول گھر کے گیٹ سے باہر نکلنے کے لیے ریورس ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے چیخ کر پکاروں۔

''طیبہ' رک جاؤ۔''

لیکن چاہتے ہوئے بھی میرے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ مجھے ماں کہلانے کا کوئی حق نہیں کیونکہ میں اس قابل ہی نہیں ہوں۔ وہ جو میرے جسم کا حصہ ہے' جسے میں نے تکلیف اُٹھا کر پیدا کیا ہے' جسے یاد کر کے تنہائیوں میں تڑپی ہوں۔ آج میں اسی کو بیٹی کہہ کر پکار نہیں سکتی۔ یہ کون سی اَن دیکھی زنجیریں مجھے باندھے ہوئے ہیں۔ میں اسے آواز دینا چاہتی ہوں۔ بلانا چاہتی ہوں۔

''طیبہ۔''

''میں ماں ہوں' کیسے فراموش کر سکتی ہوں اسے' ہاں جیپ ابھی گیٹ سے باہر نہیں نکلی۔ میں چلا کر اسے آواز دوں تو اس تک ضرور پہنچے گی۔ وہ ایک مرتبہ میری جانب ضرور دیکھے گی۔ میری محبت اسے میرے سینے سے لگنے پر ضرور مجبور کرے گی۔ وہ جواب میرے منہ پر تھوک گئی ہے۔ میں اسے پکارنے لگتی ہوں لیکن اسی وقت دروازہ کھول کر آمنہ اندر داخل ہوتی ہے۔

''امی دیکھیں ناں' بھائی تنگ کر رہا ہے۔''

اور اس کی آواز سن کر میں پھر کمزور پڑ جاتی ہوں۔ گاڑی میری آواز کی حد سے دور چلی جاتی ہے' چلتی جاتی ہے اور پُر پیچ پہاڑی راستوں کے موڑوں پر گھومتے ہوئے میری نگاہوں

سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

''امی! بھائی کو منع کریں ناں۔''

''ہوں بیٹا۔ ابھی منع کرتی ہوں۔ آپ جائیں اور رابعہ کے ساتھ کھیلیں۔'' میں نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی۔ آمنہ اُچھلتی کودتی باہر نکل گئی۔

میرا شدت سے رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ جس طرح میں آمنہ اور کامران کو چھو سکتی تھی کاش اسی طرح طیبہ کو بھی چھو سکتی۔ پیار کر سکتی۔ مگر اس کے چہرے پر تو میرے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔ وہ سوال پوچھ رہی تھی مگر جواب سننے پر تیار نہیں تھی۔ بری طرح سے رو رہی تھی۔ گالیاں دے رہی تھی۔ اس کی نفرت کی شدت کے سامنے اظہار کے سبھی طریقے محدود لگ رہے تھے۔

''تم انتہائی قابلِ نفرت' گھٹیا اور رذیل مخلوق ہو۔ اپنی زندگی میں تم نے جو کچھ کیا' اس سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے میرے ماتھے پر سیاہی کیوں لگائی؟ مجھے شرم آتی ہے یہ سوچ کر بھی کہ میں نے تمہارے گندگی بھرے وجود سے جنم لیا اور تمہارے وجود کی غلاظت میرے جسم سے بھی چپک گئی۔

جانتی ہو لوگ مجھے کس نام سے پکارتے ہیں۔ بدچلن ماں کی آوارہ بیٹی۔ لوگ کہتے ہیں ناجائز اولاد تھی اور ناجائز ہی رہی۔ کیوں یہ داغ میری پیشانی پر لگایا تم نے؟ کتیا اولاد پیدا کرتی ہے تو وہ بھی اسے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھاتی ہے۔ ایک تم تھیں جس نے پیدا ہوتے کے ساتھ ہی پھینک دیا۔

میری زندگی تباہ کر دی تم نے۔ مجھے پیدا کرنا ہی تھا تو اپنی منحوس صورت کیوں دی مجھے۔ کم از کم کوئی یہ تو نہ جان پاتا کہ میں انسانیت کی سطح سے گرے ہوئے رذیل مرد اور عورت کی وقتی خوشی کے چند لمحات کا گناہ ہوں۔

تم نے کچھ بھی نہ رہنے دیا میرے پاس۔ میرا مان میری ذات کا غرور' میرا اعتماد۔ کچھ بھی تو نہیں۔ مجھے گندگی کے ڈھیر میں پھنسا دیا مجھے تنہا کر دیا۔ کیا تم اس دکھ کا حساب دے سکتی ہو جس سے میں گزر رہی ہوں۔ میرے ماتھے کی سیاہی مٹا سکتی ہو؟ مجھے میرا اعتماد' میرا مان میری ذات کا غرور لوٹا سکتی ہو۔ بتاؤ' کیا میں کبھی بھی کسی کے سامنے سر اٹھا کر چل سکوں گی؟

کسی پر اعتبار کر سکوں گی؟ پہلے کی طرح اپنی زندگی گزار سکوں گی؟

تم نے تو سب کچھ پا لیا۔ گھر بھی اور رشتے بھی' مگر میرا کون ہے؟ بتاؤں میں کہاں کس کے پاس جاؤں؟ کس رشتے کو اپنا کہوں؟ کسے ماں کہوں' کسے باپ کہہ کر پکاروں؟ بولو جواب دو ناں' لیکن تمہارے پاس جواب کہاں۔''

کتنی دیر تک وہ بولتی رہی تھی اور میں سنتی رہی تھی۔ میرے آنسو میری بے گناہی کا ثبوت نہ بن سکے کیونکہ میں بے گناہ تھی بھی نہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگانا چاہا لیکن اس نے میرے منہ پر تھوک دیا۔

''تم اسی قابل ہو کہ تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے۔ بلکہ تم اس سے بھی بدتر سلوک کی مستحق ہو۔'' نہ جانے یہ سب میرے اعمال کی سزا تھی یا میری معصومیت کی۔ میں جو زبان سے نکلے اور قلم سے لکھے ہر لفظ کو سچ سمجھا کرتی تھی' جھوٹ کو نہ ڈھونڈ سکی اور اپنی زندگی تباہ کر بیٹھی۔ اپنی ہی نہیں' اس بیٹی کی بھی۔ جو آج میرے سامنے کھڑی ہو کر مجھ سے حساب مانگ رہی تھی۔

آنکھ کھولتے کے ساتھ میں نے انسانیت' شرافت اور محبت کی پیکر بڑی اماں کو دیکھا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میری ماں کون تھی' کہاں تھی۔ میرے لیے سب کچھ بڑی اماں ہی تھیں۔ وہی مجھے کھانا کھلاتی تھیں۔

نہلاتی دھلاتی تھیں' میرے بال سنوارتی تھیں۔ میری خاطر اپنے بچوں اور بہوؤں تک کو ڈانٹ دیتی تھیں۔ یہ نہیں کہ گھر میں ان کے علاوہ اور کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا تھا۔ سبھی مجھے عزیز رکھتے تھے لیکن کبھی کوئی بات' کوئی انداز میرے دل پر زخم لگا دیتا تھا۔

پھر بھی میں ان سب سے محبت کرتی تھی شکرگزاری میری فطرت کا حصہ تھی۔ میں محبتوں کو یاد رکھنے اور نفرتوں کو بھول جانے کی قائل تھی۔

ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی میں نے اپنی ماں کے متعلق شکوک وشبہات سنے تھے۔

''آخر کوئی تو سراغ ملتا اس کے گھر والوں کا۔ مجھے تو لگتا ہے کہیں سے بھاگ کر آئی تھی۔ آج کل کی لڑکیوں سے اللہ بچائے۔ ابھی زمین سے اُگی نہیں ہوتیں اور عشق شروع کر دیتی ہیں۔ پھر اس کا تو یہی انجام ہونا ہوا ناں۔''

اور میں نوٹ بک پر سر جھکائے ہوم ورک کرتے ہوئے اپنے دل پر نئے گھاؤ لگتے

دیکھتی رہتی تھی۔

"اللہ جانے ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ وہ کیسی تھی۔ بس توبہ کرنی چاہیے۔ اللہ برے وقت سے بچائے دشمنوں کی بیٹیوں کو بھی محفوظ رکھے۔"

میں پنسل کا پچھلا سرا منہ میں دبائے سوچنے لگتی تھی کہ میرے متعلق بات کرتے ہوئے میری ماں کی ذات آخر اتنی اہم کیوں ہو جاتی ہے۔ میری اپنی ذات اور اس کی اچھائیاں' برائیاں کیوں پسِ پشت چلی جاتی ہیں۔ میرے وجود کی اہمیت کیوں ختم ہو جاتی ہے۔

مگر ان سوالوں کا جواب کہیں نہیں ملتا تھا۔ اور کبھی تو بڑی اماں کی باتیں اور کنفیوز کر دیتی تھیں۔

"دیکھو' یہ میری فرشتہ سی بیٹی' کیسی پیاری ہے یہ کتنی اچھی عادتیں ہیں اس کی دیکھنا اس خاندان کی کوئی لڑکی اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔"

مجھے اس خاندان میں شامل کرنے پر کون تیار تھا؟ اور میری تعریف کے ساتھ کبھی اچانک میری ماں کا ذکر کیوں منسلک ہو جاتا تھا؟ ہاں گھر کے سبھی افراد مانتے تھے کہ آسیہ بہت اچھی' بہت فرمانبردار ہے۔ چھوٹی امی کہتی تھیں کہ آسیہ کی اچھائیاں اور محبت اس کے چہرے پر نور بن کر جھلکتی ہے مگر پھر اچانک ہی کہیں سے کوئی فقرہ کان میں پڑ جاتا تھا۔

"نہ جانے کس خاندان کی ہے بیچاری لیکن چلو اچھی تربیت سے بچے کو سنوارنے کی کوشش تو کی ہی جا سکتی ہے۔"

میں سماعت سے ٹکرانے والے ان فقروں سے محفوظ رہنے کی خاطر ہر کام لگن اور محنت سے کرتی تھی۔ سب سے محبت اور اخلاق سے پیش آتی تھی اور جب اس کے باوجود بھی ہر تعریف کے ساتھ کہیں یہ ذکر آ جائے تو میں تھک سی جاتی تھی۔ رات کو اپنے کمرے کی تاریکی میں بستر پر لیٹ کر انہی سب فقروں کی بازگشت سنتی رہتی تھی۔ یا پھر اسکول میں سب سہیلیوں کی نظر بچا کر پرانے اسکول کی شکستہ دیواروں سے پشت ٹکا کر سامنے کچھ دور ایستادہ چرچ کی ویران عمارت پر نظریں جما دیتی تھی۔

بڑی اماں بھی شاید میری خاموشی اور میرے اندر لگے زخم جانتی تھیں۔

"دیکھنا آسیہ! ایک دن تم اپنی محبت اور سیرت سے سب کو جیت لوگی۔ اپنی ان خوبیوں کو چھوڑنا مت۔"

میں سر جھکا کر باتیں سنتی رہتی تھی اور دوپٹے پر کروشیے کی بیل بناتی جاتی تھی۔ میرے ذہن میں بیسیوں سوال گردش کرتے رہتے تھے۔ جنہیں میں کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ سب سے محبت کرنے کے باوجود اپنے دل کا حال کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔

میں اور سب کچھ کہلانا گوارا کر سکتی تھی' ناشکرا کہلانا گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے اخلاق اور اپنی سیرت پر کوئی دھبہ لگوانا مجھے گوارا نہیں تھا۔ شاید میں کسی سے کہہ سکتی تو میرے اندر اتنا غبار جمع نہ ہوتا۔ میں اس راہ پر نہ نکلتی۔

ابا جی کا رویہ میرے ساتھ سرسری سا تھا۔ گھر کے سب افراد کی طرح وہ بھی میرے عادی تھے اور بس۔ انہیں نہ مجھ سے محبت تھی اور نہ نفرت۔ ان کے بیشتر کام میں ہی سرانجام دیا کرتی تھی۔ ان کے کپڑے استری کرنا' وقت بے وقت چائے بنانا۔ ان کی کتابیں اور اخبار ترتیب سے رکھنا فائلنگ کرنا' یہ سب کام میں نے خود ہی اپنے اوپر لے لیے تھے۔ وہ بھی ان کاموں کے لیے مجھے ہی پکارتے تھے۔

چھوٹی امی تھیں۔ وہ میرے ساتھ بری نہیں تھیں لیکن اپنے گھرانے سے ایک فاصلے پر ہی رکھنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے مجھے نوکروں کے درجے پر تو نہیں رکھا تھا لیکن اپنے ساتھ بٹھانا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔ وہ بھی میری تعریف ضرور کرتی تھیں مگر کبھی چند تکلیف دہ الفاظ کا اضافہ کر کے۔ انہیں خوش رکھنے کی میں ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔ اوّل تو گھر میں کافی ملازم تھے پھر بھی اگر چھوٹی امی کوئی کام کر رہی ہوتی تھیں اور میری نگاہ پڑ جاتی تھی تو میں ان کے ہاتھ سے لے کر وہ کام مکمل کر دیا کرتی تھی۔ انہیں پھولوں' پودوں کا بہت شوق تھا۔ مالی کی موجودگی کے باوجود بھی وہ کبھی پنیری' کبھی کھرپی اور کبھی پودوں کو پانی دینے کے لیے پائپ لے کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ایسے میں مَیں ہی ان کا ساتھ دیا کرتی تھی۔ باغبانی سے متعلق کتنی ہی کتابیں میں نے صرف اس لیے پڑھ ڈالی تھیں تاکہ وہ میری طرف متوجہ ہو کر بغیر کسی اضافی فقرے کے میری تعریف کریں۔

چھوٹی امی کو صفائی کا جنون تھا اور میں ان کی خاطر گھر کی بکھری چیزیں سمیٹتی پھرتی تھی۔ گھر بھر کے کپڑوں کی الماریوں کی صفائی ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور ہی کرتی تھی۔ کسی کا پھٹا اُدھڑا کپڑا ملتا تو سی دیتی' میلے کپڑے اکٹھے کر کے ڈولی میں ڈال دیتی۔ باتھ روموں میں صاف تولیے اور صابن کی نئی ٹکیاں رکھ دیتی۔ مناسب وقفوں کے بعد سب کمروں میں رکھے

فرنیچر کی ترتیب بدل ڈالتی۔

میری خوش ذوقی کے سبھی قائل تھے۔ کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ کسی کو میری کی ہوئی سیٹنگ پسند نہ آئی ہو۔ کبھی کوئی سینری کاڑھ کر دادی اماں سے کہہ کر فریم میں لگوا کر کسی کمرے میں لٹکا دیتی تھی۔ چھوٹی امی کا کوئی دوپٹا ایسا نہ تھا جس پر میں نے پھول نہ کاڑھے ہوں۔ یا کروشیے کی بیل نہ بنائی ہو۔

مجھے لگتا تھا کہ انہیں میرے منہ سے چھوٹی امی کہلوانا پسند نہیں تھا لیکن انہوں نے کبھی اس طرح مخاطب کرنے سے مجھے منع بھی نہیں کیا تھا۔

یوسف بھائی فوج میں تھے اور کبھی کبھار بیوی بچوں کے ساتھ چکر لگا جاتے تھے۔ وہ اور ان کے گھر والے لاپروا قسم کے لوگ تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ گھر والوں کے علاوہ کسی کے متعلق سوچتا۔ وہ لوگ آتے تھے۔ کئی دن تک شور شرابہ اور ہلا گلا رہتا تھا۔ پھر چلے جاتے تھے۔

بجیا راولپنڈی ہوتی تھیں اور مہینے میں ایک بار تو ضرور میکے آیا کرتی تھیں۔ کبھی ایک آدھ بچے کو لے کر اور کبھی سبھی بچوں کے ساتھ۔ ان کے آنے پر ویسا ہنگامہ نہیں ہوا کرتا تھا جیسا کہ یوسف بھائی اور ان کی فیملی کے آنے پر ہوتا تھا۔ چھوٹی امی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہ مجھے کتنے کام بتاتی جاتی تھیں۔ جن میں سب سے اہم کام بچوں کو سنبھالنے کا ہوتا تھا۔

''آسیہ نوکرانی لگی ہوئی ہے یا تمہارے بچوں کی آیا ہے۔ پڑھنے سے اُٹھا دیا اسے تم نے۔'' بڑی اماں کہتی تھیں۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا دادی اماں۔ اب ہمارا اتنا سا کام بھی نہ کر سکے تو کیا فائدہ۔'' وہ بے نیازی سے کہہ کر پھر چھوٹی امی سے باتیں کرنے لگتی تھیں۔

اور کبھی وہ اپنے بچوں کے کپڑے سینے کے لیے دے دیتی تھیں۔

''ان پر کوئی اچھے سے پھول بھی بنا دینا۔'' وہ مجھ سے کہتیں اور پھر چھوٹی امی سے مخاطب ہوتیں۔

''چچ چچ...... مجھے تو بڑا ترس آتا ہے بیچاری پر۔ نہ جانے کیا گل کھلا کر آئی تھی اس کی ماں خود تو جان سے گئی۔ اسے بھی اپنی گود سے محروم کر دیا۔ یہ تو شکر ہے اچھا گھر مل گیا اسے۔

ورنہ نہ جانے کہاں رُل رہی ہوتی۔''

میں یوں سر جھکا کر مشین کی سوئی میں دھاگا ڈالنے لگتی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ پھر جب خوبصورت فراک اور کرتے کڑھائی کر کے ان کے حوالے کرتی تو وہ مسکرا کر میری طرف دیکھتیں۔

''بھئی واہ! ہماری دادی اماں نے تو کمال ہی کر دیا۔ اتنا کچھ سکھا دیا تمہیں۔'' پھر بڑی اماں سے مخاطب ہوتیں۔

''دادی اماں بہت اچھی شاگرد ہے آپ کی۔ اتنا تو شاید اس کی سگی ماں بھی اسے نہ سکھا سکتی۔''

بڑی اماں انہیں غصے سے گھورتیں۔ ''اب اسے پڑھنے سے نہ اُٹھانا۔ درزی مر نہیں گئے۔ تھوڑے پیسے خرچ کر کے کپڑے سلوا لو۔''

''ارے ہاں' اس مرتبہ تم نے اپنا رزلٹ کارڈ تو دکھایا ہی نہیں۔'' بجیا مجھ سے کہتیں۔

میں خوشی خوشی اپنی کاپیاں اور رزلٹ کارڈ لے کر آتی۔ اسکول میں میں بہت لائق طالبہ سمجھی جاتی تھی۔ بڑی اماں سب کے سامنے اس بارے میں میری تعریف کرتی نہ تھکتی تھیں۔ میرے نمبر کسی کلاس ٹیسٹ میں بھی اچھے آتے تھے تب بھی اس خوشی میں گھر بھر کے لیے میٹھا ضرور پکواتی تھیں اور سب کو فخر سے میری نوٹ بک دکھاتی تھیں۔

''دیکھو تو بہو کتنا اچھا نتیجہ لائی ہے آسیہ جانا اپنے میاں کو بھی دکھانا۔ کیسی موتیوں جیسی لکھائی ہے میری گڑیا رانی کی۔''

اور ان کا یہ فخر قائم رکھنے کے لیے میں ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ محنت کیا کرتی تھی۔

بجیا میری کاپیاں اور رزلٹ کارڈ دیکھ کر اپنے دونوں بڑے بچوں کی کمر پر دھموکے جڑتیں۔

''یہ دیکھو آسیہ کی کاپیاں اور کارڈ' ایسے پڑھا جاتا ہے۔ میں مر جاتی ہوں تم لوگوں کو پڑھا پڑھا کر اپنے باپ کو ہلکان کر دیتے ہو تم لوگ' اور پھر بھی نکمے کے نکمے ہو اور یہ دیکھو آسیہ کی طرف۔ بیچاری کی نہ ماں ہے نہ باپ پھر بھی کتنی لائق ہے۔ کوئی پڑھانے والا نہیں ہے اسے۔ اس کے باوجود کلاس میں پوزیشن لیتی ہے۔''

ان کے بچے غصے سے میری طرف دیکھتے تھے میری وجہ سے انہیں ڈانٹ جو پڑ جاتی تھی اور پھر مجھے منہ چڑا کر بھاگ جاتے تھے۔

اپیا البتہ بڑی اماں جیسی تھیں۔ وہ خود بھی دُکھی تھیں۔ ان کے گھر کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ آتیں تو گھر کی روٹین میں ذرا سا بھی فرق نہ پڑتا۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ یوں تو گھر میں جب بھی کوئی چھٹیاں گزارنے آتا تھا۔ میں اسے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور دیا کرتی تھی مگر اپیا کے لیے میں ہر ایک سے زیادہ محنت اور لگن کے ساتھ تحفہ تیار کرتی تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں ان کے لیے اہم نہیں تھی پھر بھی جب میں ان سے بات کرتی تھی تو وہ پوری توجہ سے سنتی تھیں۔ میری تعریف کرتی تھیں۔ ان کے منہ سے اپنے لیے میں نے کبھی کوئی تکلیف دہ بات نہیں سنی تھی اور میرے لیے یہ ہی بہت تھا۔

ان کے شوہر بھی بہت اچھے تھے۔ بااخلاق، تہذیب یافتہ اور ان سے محبت کرنے والے۔ ان سے میری بات چیت کم ہی ہوا کرتی تھی۔ انہی سے نہیں۔ چھوٹی امی کے کوئی بھی داماد آتے تھے تو وہ واضح طور پر مجھے خواہ مخواہ گھر میں گھومنے پھرنے سے منع کر دیتی تھیں۔

ارسلان بھائی وہیں رہتے تھے۔ اپنی بیوی اور ایک بیٹے کے ساتھ۔ ان کی بیوی یعنی رفعت بھابی مزاج کی خاصی تیز تھیں۔ کچھ یہ خیال بھی ان کے دل میں بیٹھا ہوا تھا کہ انہیں ایک نہیں دو ساسیں بھگتنی پڑ رہی تھیں، اس لیے ان کا مزاج کچھ گرم ہی رہا کرتا تھا۔ ان کا میکہ بھی قریب ہی تھا۔ جب وہ میکے جاتیں، جو وہ اکثر جاتی رہتی تھیں، تو گھر میں کافی سکون ہو جاتا تھا۔

ان کو شوق تھا کہ گھر کے ہر فرد کے کام میں کیڑے نکالیں ان کے کام میں بہت احتیاط سے سرانجام دیتی تھی۔ جب میں کام کر چکتی تو وہ خاصی باریک بینی سے جائزہ لیتیں۔ انہیں کبھی موقع نہیں ملتا تھا میرے کام کو برا بھلا کہنے کا۔ البتہ میری ذات کے حوالے سے بڑی اماں اور ان کے درمیان کھٹ پٹ ہو جایا کرتی تھی۔

''چھوٹی بہو! آسیہ کو پڑھنے سے مت اُٹھایا کرو۔ وہ تمہارے بچے کی آیا نہیں ہے۔'' بڑی اماں کہتیں۔

یا پھر کبھی انہیں کسی اور بات پر غصہ آ جاتا۔ ''گھر کے نوکر مر گئے ہیں جو تم آسیہ پر حکم چلاتی رہتی ہو۔''

اور جواب میں رفعت بھابی کو آگ ہی لگ جاتی۔ ''سر پر بٹھالیں آپ اسے، مجھ سے تو یہ نہیں ہوگا۔ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ ہمارے گھر کی ریت نہیں ہے کہ گلیوں میں بے نام ونشان پیدا ہونے والے لوگوں کو اپنے خاندان میں شامل کر کے نسل خراب کریں اور یہ نوکر نہیں تو کیا

مالکن ہے اس گھر کی؟ مفت روٹیاں توڑنے بٹھایا ہوا ہے اسے۔''

''اپنے حصے کا کھاتی ہے، تم سے نوالہ نہیں چھینتی جس دن تم سے مانگے گی تم نہ دینا۔'' بڑی اماں تپ جاتیں۔

''میرے میاں کا پیسہ بھی اس گھر پر خرچ ہو رہا ہے۔'' وہ بھڑک کر بولتیں۔

''ارے جاؤ، تمہارا میاں ہزار روپے دے کر احسان کر رہا ہے۔ الگ ہو جاؤ تو میں دیکھوں کیسے تمہارے گھر کا گزارا چلتا ہے۔''

وہ دونوں بولتی رہتیں، لیکن رفعت بھابی کے ہاتھوں میری شامت آجاتی۔ انہیں میرا بھابی کہنا سخت ناپسند تھا۔ میری بھی کوشش ہوتی تھی کہ ان سے نہ ہی مخاطب ہوں تو بہتر ہے۔

یہ تو چھوٹی امی اور ابا جی کی اولادیں تھیں۔ ان کے علاوہ بھی خاندان کے بے شمار لوگ آتے رہتے تھے۔ بڑی اماں کی بیٹیاں تھیں۔ ان کے بچے تھے کچھ اور رشتے دار تھے۔ ہاں بڑی اماں کے چھوٹے بیٹے بہت کم آیا کرتے تھے۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور سول سرونٹ تھے۔ کبھی آتے بھی تھے تو تنہا ہی آتے تھے۔ ان کی بیوی برسوں پہلے سسرال سے جھگڑ کر علیحدہ ہوئی تھیں اور قسم اُٹھا کر گئی تھیں کہ پھر اس گھر میں قدم نہیں رکھیں گی۔ سو اب تک اپنی قسم پر قائم تھیں۔ راشد انکل خود ہی بہن بھائیوں اور ماں سے ملنے آ جاتے تھے اپنے بچوں کو بھی نہیں لاتے تھے۔ بڑی اماں افسردہ ہو جاتی تھیں۔

''راشد! بچوں کو ہی لے آئے ہوتے۔'' وہ کہتی تھیں۔

''اماں! آپ میری طرف آ جائیں۔'' وہ پہلو بدل کر کہتے۔ واضح تھا کہ بیوی کی ضد تھی اور وہ بے بس تھے۔ ان کی بیگم نے کہہ رکھا تھا کہ ان کے گھر کے دروازے کھلے ہیں، جو آئے وہ خندہ پیشانی سے ملیں گی لیکن اب سسرال کی دہلیز نہ وہ خود پار کریں گی اور نہ بچوں کو وہاں جانے دیں گی۔

میرے سر پر تیل کی مالش کرتے ہوئے بڑی اماں راشد انکل سے ملنے والے زخم میرے سامنے کھول کر رکھ دیتیں۔ میں انہیں تسلی دیتی۔

''بڑی اماں دیکھنا ایک دن راشد انکل کے بچے ضرور یہاں آئیں گے۔ آپ دعا کرتی رہیں۔''

''اللہ تیری زبان مبارک کرے لیکن میری بہو بڑی تیز ہے۔ باندھ کر رکھا ہوا ہے میاں

اور بچوں کو۔ ابھی تو دیکھنا ارسلان کی بیوی پر تول رہی ہے ہر دوسرے دن میکے سے سبق سیکھ کر آتی ہے۔''

''بڑی اماں! ہمیں بھی درگزر کرنا چاہیے۔ اگر ہم خاموش ہو جائیں تو وہ کتنی دیر تک بولتی رہیں گی۔ ظاہر ہے خود ہی خاموش ہو جائیں گی۔''

''کیسی عقل مند ہے میری بیٹی۔ جس گھر میں جائے گی اُجالا پھیلا دے گی۔ لیکن میری گڑیا رانی' ہر بات پر خاموشی اچھی نہیں ہوتی۔ کہیں بولنا بھی پڑتا ہے۔ آہ۔ تیرا بہت دل دکھاتی ہے وہ۔''

''اتنا تو بڑے کہہ ہی دیا کرتے ہیں۔ میں نہیں برا مانتی۔''

اور میں برا مان بھی کیسے سکتی تھی۔ اس گھر کے کتنے احسان تھے مجھ پر۔ انہی لوگوں کے ہاتھوں میں میری پیدائش ہوئی تھی۔ میری ماں کی بے گور و کفن پڑی لاش کی تجہیز و تکفین کی ذمے داری انہوں نے ہی اُٹھائی تھی۔ مجھے پالا پوسا تھا۔ تعلیم دلوائی تھی سر چھپانے کو ٹھکانا دیا تھا۔ کھانے پینے پر کبھی روک ٹوک نہیں کی تھی۔ بہترین پہنایا تھا۔ اچھے اسکول میں داخل کیا تھا۔

اس کے بعد کبھی کسی کے منہ سے کوئی تکلیف دہ بات نکل جاتی تھی تو کیا وہ مجھے برداشت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس بھری دنیا میں وہی سب تو تھے جو میرے اپنے تھے' جن کے حوالے سے میری شناخت تھی۔ یہ نہ ہوتے تو میں کہاں جاتی۔ کدھر کدھر بھٹکتی؟ وہ آرام اور سکون جو مجھے یہاں نصیب تھا اور کہاں مل سکتا تھا۔ اس لیے' چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دینا میرا فرض ہی نہیں شکر گزاری کا تقاضا بھی تھا۔

بڑی اماں ایسے میں میرے ماتھے کو چوم لیا کرتی تھیں۔

''دیکھنا آسیہ تم اپنی محبت اور سیرت سے سب کو جیت لو گی۔ اپنی خوبیوں کو چھوڑنا مت۔''

مجھے یقین تھا کہ بڑی اماں ٹھیک کہتی ہیں وہ غلط ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ آج میں جو کچھ بھی تھی انہی کی محبت اور عنایت کی وجہ سے تھی۔ بچپن سے ہی انہوں نے مجھے گھر داری کے ہنر سکھانے شروع کر دیئے تھے اور تھوڑے ہی عرصے میں مَیں طاق ہو گئی تھی۔ میری پڑھائی کا بھی وہی خیال رکھتی تھیں۔ مجھے کچھ پڑھانا تو ان کے بس میں نہیں تھا مگر ان کی نصیحتیں اور میرا

خیال رکھنے کا انداز مجھے اعتماد بخشتا تھا۔

پھر ایک دن انہوں نے خود سوئی اور کالا دھاگا لے کر میرے کان چھیدے۔

''اب تم بڑی ہو رہی ہو۔ یوں خالی کان اچھے نہیں لگتے۔ میں تمہارے لیے سونے کی بالیاں بنوا رہی ہوں لیکن ابھی کسی کو بتانا مت۔''

میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ''سچ بڑی اماں' آپ مجھے سونے کی بالیاں لے کر دیں گی؟''

''تو میری بیٹی نہیں ہے کیا؟ یوں اچھا لگتا ہے کیا۔ اتنا قد نکال لیا ہے اور کان ننگے۔ ہمارے وقتوں میں تو بچپن میں ہی ننھی ننھی بالیاں کان میں ڈال دی جاتی تھیں۔'' وہ کہنے لگیں۔

میں شدت سے منتظر تھی اس روز کی جب میری بالیاں آنی تھیں۔ میں نے کسی کو وجہ نہیں بتائی تھی لیکن میری خوشی بہت واضح تھی۔

''جھلی!'' رفعت بھابی مجھے خوش دیکھ کر رہ نہ سکیں منہ میں بڑبڑائیں۔ ''پتا نہیں ہر وقت کیوں خوش رہتی ہے۔ نہ ماں' نہ باپ' نہ گھر کا سکھ آرام۔ جوتیوں میں پڑی رہتی ہے پھر بھی دانت نکالے رکھتی ہے۔''

میں نے کہنا چاہا کہ یہ تو سوچنے کا انداز تھا۔ میرے لیے اتنی محبت' اتنا آرام بھی کافی تھا اور وہ اتنے اعلیٰ خاندان کی بہو بن کر عزت اور سکون سے رہتے ہوئے بھی ناخوش تھیں تو اس میں تمام تر نہ سہی کچھ نہ کچھ قصور ان کا بھی ضرور تھا۔ مگر میں یہ بات کہتی نہیں تھی۔

جس روز میری بالیاں آئیں' میں برآمدے سے آنگن میں اُترتی سیڑھی پر کتابیں کاپیاں پھیلائے ہوم ورک کرنے میں مصروف تھی۔

''شی۔ آسیہ۔'' بڑی اماں کی رازداری بھری آواز سنائی دی۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ انہوں نے چپکے سے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں بستہ کھلا چھوڑ کر ان کے پیچھے لپکی۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ آج تو میری بالیاں آنی تھیں۔ میں ان کے پاس آئی تو انہوں نے ننھی سی نیلی مخملی ڈبیا کھول کر میرے سامنے کر دی۔ اس میں نئی سنہری بالیاں چمک رہی تھیں۔

''کیسی ہیں؟'' بڑی اماں نے اشتیاق سے پوچھا۔

""بہت اچھی، بہت خوبصورت۔ اتنی پیاری کہ میں بتا نہیں سکتی۔"" میں نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کے جھریوں بھرے چہرے کو چوم لیا۔

""لاؤ میں کانوں میں ڈال دوں۔ دیکھنا چاند سا چہرہ کیسے چمکنے لگے گا۔"" انہوں نے ڈبیہ سے بالیاں نکال کر میرے کانوں میں ڈال دیں۔

میں بھاگ کر آئینے کے سامنے پہنچی اور کتنے ہی زاویوں سے چمکتے زیور کا جائزہ لیا۔

""میں نہ کہتی تھی، میری بیٹی شہزادی لگے گی۔"" میں ہنس پڑی۔

""انہیں حفاظت سے رکھنا۔ جو کچھ میں تمہیں بنا کر دوں، ان چیزوں کا خیال رکھنا۔ تمہارے ہی کام آئیں گی۔ مجھے پتا ہے، اس گھر میں تمہارا کوئی نہیں ہے۔ میری آنکھیں بند ہوئیں تو تمہیں کھانا بھی نوکروں کے برتنوں میں ملے گا۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے ہی تمہیں محفوظ کر دوں۔ ان زیوروں کے لیے تم پر کوئی بھی احسان نہیں دھر سکتا۔ کیونکہ یہ خالص میرے پیسوں کے ہیں۔""

""بڑی اماں یہ میں چھوٹی امی اور ابا جی کو دکھا آؤں۔"" میں نے پُرشوق لہجے میں پوچھا۔

""ہاں جاؤ۔""

میں باہر نکلی تو ابا جی برآمدے میں ہی کھڑے تھے۔

""ابا جی، یہ دیکھیں میری بالیاں اچھی ہیں ناں۔"" میرے لہجے میں مسرت آمیز جوش تھا۔

""ہاں اچھی ہیں۔ میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ انکم ٹیکس والی فائل لا دینا۔""

فائل انہیں تھما کر میں چھوٹی امی کی تلاش میں نکلی وہ پودوں کو پانی دے رہی تھیں۔

""چھوٹی امی! یہ میری نئی بالیاں دیکھیں۔ خوبصورت ہیں ناں؟""

انہوں نے میری جانب دیکھا، آنکھوں میں حیرت اُتر آئی۔ ""ہاں بہت اچھی ہیں مگر یہ آئیں کہاں سے؟ تم نے کوئی بچت کی تھی کیا؟""

میں کہنے لگی تھی کہ میرے ہاتھ میں پیسے کب ہوتے ہیں کہ میں بچت کرتی۔ کبھی مہینے میں ایک آدھ مرتبہ بڑی اماں ایک دو روپے دے دیا کرتی تھیں جو میں اسکول میں خرچ کر دیا کرتی تھی۔

لیکن یہ کہتے کہتے میں رُک گئی۔ کیا خبر میری یہ بات چھوٹی امی کو بری لگ جاتی۔

""نہیں چھوٹی امی۔"" میں نے کہنا شروع کیا۔ ""یہ مجھے بڑی اماں نے لے کر دی ہیں آج۔ ابھی لائی ہیں وہ۔""

""بڑی اماں نے۔"" ان کے ماتھے پر کچھ بل پڑے اور لمحوں میں غائب بھی ہو گئے۔ ""چلو اچھا ہے۔ کچھ دے دلا کر ہی رخصت کرنا ہو گا۔ آہستہ آہستہ چیزیں بنتی جائیں تو بہتر ہے۔ اکٹھا بوجھ کون اُٹھا پائے گا۔""

میں خاموشی سے سیڑھی پر آ بیٹھی اور کتابیں کھول کر سوچنے لگی۔

""اللہ میاں جی۔ میرے نصیب میں اس گھر کی روٹی لکھی تھی تو میرا کوئی درجہ تو متعین کر دیتا۔ میں سمجھ نہیں پائی کہ نوکروں میں سے ہوں یا مالکوں میں سے۔ کیا فرق پڑتا جو میں یوسف بھائی، بجیا اپیا اور ارسلان بھائی کی طرح چھوٹی امی اور ابا جی کی بیٹی ہوتی، سگی بیٹی۔ کھانا پینا تو اب بھی یہیں ہے مگر تب میں بوجھ نہ ہوتی۔ اپنی اولاد کتنی بھی زیادہ ہو، ماں باپ کو بوجھ نہیں لگتی۔""

اپنی سوچوں سے میں رفعت بھابی کی آواز سن کر چونکی۔

""بڑی بی خاصا مال دبائے بیٹھی ہیں ورنہ ہم نے تو کسی گھر میں نہیں دیکھا کہ بے ننگ و نام لوگوں کو زیور بانٹتے جا رہے ہوں۔ ہم تو اتنی زکوٰۃ بھی نہیں نکال سکتے جتنا بڑی بی فیاضی میں لٹاتی پھرتی ہیں۔""

میں نے کتابیں، کاپیاں سمیٹ کر بستے میں ڈالیں اور بڑی اماں کے مشترکہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں ان کے اور چھوٹی امی کے درمیان تکرار جاری تھی۔

""اماں! میں کب روکتی ہوں، میری طرف سے آپ سنار کی پوری دکان آسیہ کے حوالے کر دیں۔ میرا کیا لے رہی ہے وہ، لیکن اب وہ بڑی ہو رہی ہے۔ ساتویں میں پہنچ گئی ہے۔ اب اسے حقیقتیں سمجھانے کا وقت آ گیا ہے۔"" چھوٹی امی کہہ رہی تھیں۔

میں دروازے کی چوکھٹ میں ہی کھڑی رہ گئی۔

""کیسی حقیقت؟ بچپن سے تو تم لوگ باآواز بلند اس سے کہتے آ رہے ہو کہ نہ جانے اس کا باپ کون تھا۔ ماں نے کیا گل کھلائے تھے۔ ہمارے گھر کی دہلیز پر آ کر ڈھے گئی تھی۔ ہمارا احسان کہ اس اجنبی عورت کی بچی کو پال پوس رہے ہیں۔ کیا اب اس سے بھی بڑھ کر کوئی حقیقت ہے جو تمہیں اسے بتانا ہے؟"" بڑی اماں ماتھے پر بل ڈال کر بولیں۔

''اماں! میں ان باتوں میں نہیں پڑتی۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ آسیہ کو گھر کے افراد میں شامل نہیں کیا جانا چاہیے۔ مجھے یہ مناسب نہیں لگتا۔''

''اس میں غیر مناسب کیا ہے؟''

''یہ اسی کے لیے بہتر ہے کہ اس ماحول سے جدا رہے۔ اسی ماحول کو اپنا سمجھنے لگی تو کل کو یہ بھی چاہے گی کہ اس کی شادی کسی ڈاکٹر' انجینئر یا آرمی آفیسر سے ہو جائے۔ یوں مشکل ہو جائے گی۔'' چھوٹی امی کا انداز سمجھانے والا تھا۔

''کیا مشکل ہو جائے گی۔'' بڑی اماں تو بھڑک اُٹھیں۔ ''یہ کہ تمہاری بیٹیوں کا مقابلہ کرنے لگی ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کی شادی بھی تمہاری بیٹیوں کی طرح کسی ڈاکٹر یا آرمی افسر سے ہو جائے۔ اپنے نصیبوں کا کھا رہی ہے اور کھاتی رہے گی۔ تم نہ بولا کرو درمیان میں۔''

''اماں! ہر کوئی اپنے نصیبوں کا ہی کھاتا ہے لیکن یہ بھی تو سوچیں کہ ارد گرد دور تک سبھی جانتے ہیں کہ اس کی پیدائش کن حالات میں ہوئی تھی۔ نہ یہ علم کہ ماں کون تھی۔ نہ یہ خبر کہ باپ کون ہے ایسے میں اسے اچھا رشتہ کہاں سے ملے گا؟ اور جو کوئی انجان آ بھی گیا تو سسرال والوں کو کیا بتائیں گے؟ اچھے گھروں میں یونہی تو رشتے طے نہیں ہو جاتے لڑکی ہی نہیں پورے خاندان کو دیکھا جاتا ہے۔ نیک نامی دیکھی جاتی ہے۔ اماں بہت مشکل ہو جائے گی پھر۔ بجائے اس کے کہ تب اسے زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔ ابھی سے اس کی تربیت اس نہج پر کریں کہ بعد میں کسی قسم کی دقت نہ ہو اور اس کی شادی کسی عام سے خاندان میں' کسی عام سے شخص کے ساتھ ہو' تب بھی یہ خوش اور مطمئن رہ سکے۔''

میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ ایسی باتوں کی عادت ہو جانے کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ انہیں سن کر میرا دل نہیں دُکھتا تھا۔ میں اندر تک لہولہو ہو جاتی تھی۔ اس کے باوجود مجھے نفرت کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ گھر والوں سے تو کسی شکایت تک کا سوال نہیں تھا۔ مجھے تو اپنی سگی ماں سے بھی کبھی نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جو میری پیدائش کی ذمے دار تھی اور مجھے تنہا چھوڑ کر اتنی دور چلی گئی تھی جہاں سے کوئی لوٹا نہیں کرتا۔ میں سوچتی تھی کہ میری ماں یقیناً بہت اچھی عورت ہوگی۔ لوگ اس لیے شک کرتے ہیں کیونکہ وہ میری ماں کے لیے کچھ محسوس نہیں کرتے۔ وہ محبت جو میرے دل میں اس کے لیے ہے۔ یہ محض لوگوں کی غلط فہمی بھی ہو

سکتی ہے۔ ورنہ کیا کبھی کوئی ماں بری ہو سکتی ہے مجھے پکا یقین تھا کہ میری ماں زندہ ہوتی تو مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرتی۔ ویسے ہی جیسے چھوٹی امی اپنے بچوں سے کرتی تھیں۔

اس وقت بھی چھوٹی امی کی باتوں نے میرا دل توڑ دیا تھا۔ وہ جو کہہ رہی تھیں سچ تھا۔ نہ میں انہیں جھٹلا سکتی تھی نہ کوئی اور۔ حقیقت سے کیسے منہ موڑا جا سکتا تھا۔ بڑی اماں سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔

''میں کیا کروں۔ آسیہ میری اولاد' اس خاندان کا خون نہیں ہے لیکن مجھے بہت عزیز ہے۔''

''یہ فیصلہ تو آپ کو ہی کرنا ہوگا۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ آنے والے وقت کا اندازہ ہو جائے۔ آسیہ کی پرورش آپ اپنی ذمے داری سمجھ کر کر رہی ہیں تو آپ کو ان حقیقتوں کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے جن سے کوئی مفر نہیں ہے۔ اماں اتنے عرصے گھر میں جانور رہے تو اس سے بھی اُنسیت ہو جاتی ہے۔ آسیہ کو تو میں نے گود میں کھلایا ہے میں بھی اس کا برا نہیں چاہتی۔ میں جو یہ بات کہہ رہی ہوں تو آپ ناراض مت ہوں میں بھی اسے خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہ چاہتی ہوں کہ وہ ایسے خواب نہ بُننے لگے جن کے پورا ہونے کی کوئی امید نہیں۔ ورنہ زندگی اس کے لیے بوجھل ہو جائے گی۔ وہ خوش نہیں رہ سکے گی اس طرح۔''

میں کمرے کے اندر دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور بمشکل اپنے آنسو روک پا رہی تھی۔ چھوٹی امی مڑیں تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گئیں پھر میرے قریب سے نکل کر باہر چلی گئیں۔

بڑی اماں اسی طرح سر تھامے بیٹھی تھیں۔ میں کچھ کہے بغیر قالین پر بیٹھ کر پھر ہوم ورک کرنے لگی۔ تب سے لے کر رات کے کھانے تک بڑی اماں اُلجھی اُلجھی سی رہیں جیسے کچھ سوچ رہی ہوں' کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہی ہوں۔ کھانا کھا کر میں فوراً ہی سو جاتی تھی کیونکہ صبح سویرے جاگنا ہوتا تھا۔ میں جب بستر میں گھسنے لگی تو بڑی اماں نے مجھے بلا لیا۔

''آج سے تمہیں پروین کے کوارٹر میں سونا ہوگا۔'' انہوں نے کہا۔

میں کچھ نہ سمجھی۔ ''کیوں بڑی اماں؟''

''بڑوں سے کیوں' نہیں پوچھتے۔ میں جو کچھ کروں گی تمہارے بھلے کے لیے کروں گی۔'' انہوں نے رسان سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''مگر میں آپ کے بغیر کیسے رہ پاؤں گی۔'' میری آنکھیں بھر آئیں۔

''اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ میں بھی بوڑھی ہوگئی ہوں۔ کیا خبر آج ہوں کل نہیں۔ اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے بھی بچے دیکھ لیے ہیں میں نے اور کتنا جیوں گی اب۔ ابھی سے عادت ڈالوگی تو میرے بغیر رہ سکوگی۔''

میں رو پڑی۔ شام سے ہی میرے دل پر بوجھ تھا۔ میں جانتی تھی کہ بڑی اماں مجھے خود سے کیوں جدا کررہی ہیں۔ میں ان سے کہنا چاہتی تھی کہ مجھے سب خبر ہے' وہ ایسا کیوں کہ رہی ہیں لیکن میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے کہا۔

''آپ میری شادی کی وجہ سے کہہ رہی ہیں ناں؟ بڑی اماں میں شادی کروں گی ہی نہیں۔ بس آپ مجھے خود سے الگ مت کریں۔ پلیز۔'' میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

انہوں نے مجھے گلے لگالیا۔ ''اللہ نہ کرے' کیسی باتیں کرتی ہے۔ اللہ موقع دے تو میں اپنے ہاتھوں سے تیری شادی کروں گی۔ ایسی بات منہ سے نکالتے بھی نہیں ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ میری گڑیا رانی جس گھر میں بھی جائے گی وہاں اُجالا بھر دے گی۔ پھر مت کرنا ایسی بات۔''

سو میں پروین ماسی کے دو کمروں کے کوارٹر میں چلی آئی۔ رات بھر میری آنکھوں سے آنسو جاری رہے۔ رات بھیگتی جارہی تھی۔ سب سو چکے تھے' ماسی کے مدہم مدہم خراٹے دریا کی لہروں کی آواز میں مدغم ہوکر میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔

یہ دریا میرا محبوب تھا۔ بچپن میں 'میں نے جل پری کی کہانی سنی تھی۔ ابھی میں اس کہانی کو جذب ہی کررہی تھی کہ ابا نے ہنستے ہوئے چھوٹی امی سے کہا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ آسیہ کی ماں بھی جل پری تھی۔ شور مچاتی لہروں سے نکلی ہوئی' یاد ہے امی' اس روز وہ کتنی بھیگی ہوئی تھی۔ حالانکہ بارش ہورہی تھی۔ پھر بھی میرے ذہن میں خیال آیا تھا جیسے وہ دریا سے نکل کر آئی ہو اور وہ تھی بھی پریوں جیسی خوبصورت۔''

اس کے کتنے عرصے بعد تک میں اپنی ماں کو جل پری سمجھتی رہی تھی۔ ذرا سیانی ہوئی تو یہ خواب ٹوٹ گیا لیکن اس دریا سے' اُس روز کے بعد مجھے محبت ہوگئی تھی۔ اب بھی کبھی بالکل اچانک گھٹتی بڑھتی لہروں کو دیکھ کر میرے ذہن میں پرانا خواب تازہ ہوجاتا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ حقیقت کی دنیا میں یہ بات محض افسانہ ہے۔ میں پھر اپنے خوب میں گم ہوجاتی

تھی۔ مجھے لگتا تھا جیسے ابھی میری ماں جل پری کے روپ میں لہروں سے نکلے گی اور مجھے اپنی آغوش میں بھر لے گی۔

اس رات بھی دریا کی پُرشور لہروں نے مجھ سے کہا کہ جب سب سو رہے ہیں اس وقت بھی وہ جاگ رہی ہیں۔ وہ میرا غم سن سکتی ہیں۔ میرے درد کو جان سکتی ہیں۔ جیسے وہ میری ماں کے غم کو جانتی تھیں جو سرد بھیگی رات میں ان سے گزر کر اس دروازے تک پہنچی تھی۔

میں اُٹھی اور دریا کی طرف کھلنے والی بڑی سی کھڑکی سے باہر نکل آئی۔ لہریں ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا اور میں چاندنی میں نہائی' گیلی زمین پر بیٹھ کر غمناک آنکھوں سے اپنی طرف بڑھتی لہروں کو دیکھتی رہی جو کبھی تو میرے پاؤں چھو کر ہی لوٹ جاتی تھیں اور کبھی مجھے بھگو دیتی تھیں۔

''نہ جانے میری زندگی میں کیا لکھا ہے۔'' میں سوچ رہی تھی۔ ''میں نے خود کو تقدیر کے دھارے پر چھوڑ رکھا ہے۔ خبر نہیں یہ مجھے کہاں لے جائے گی۔''

میں تاریکی کے روشنی سے ملاپ تک وہاں بیٹھی رہی۔ جب سفیدی نمایاں ہونے لگی تو میں اُٹھ کر اس کھڑکی کے راستے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

بڑی اماں فجر کی نماز پڑھتے ہی میرے پاس آگئیں۔

''آسیہ! رات کو ڈر تو نہیں لگا اکیلے کمرے یا اندھیرے سے؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں' ڈر کیسا۔''

''آہستہ آہستہ عادت ہوجائے گی۔ تُو میری بہت سیانی بیٹی ہے۔'' انہوں نے مجھے پیار کیا۔

ماسی پروین کے ساتھ بھی میرا تعلق بچپن کا تھا۔ وہ اکثر مجھے بتایا کرتی تھی کہ جب میری ماں نے گھر کی گھنٹی بجائی تھی تو اس نے دروازہ کھولا تھا۔ ماسی گھر کی سب سے بااعتماد ملازمہ تھی۔ اس نے بچپن میں مجھے بہت اُٹھایا اور کھلایا تھا۔ میں جو مالک اور ملازم کے بین بین تھی۔ میرا رویہ سبھی سے اچھا تھا۔ مالکوں سے بھی اور ملازموں سے بھی۔ گھر کے بچوں میں سے کوئی کبھی پروین کو ماسی نہیں کہتا تھا مگر میں اسے ماسی کہہ کر ہی بلاتی تھی۔ مالی کو بابا' ڈرائیور کو شکور بھائی' اوپر کا کام کرنے والے کو بشیر بھائی اور ان کی بیویوں کو آپا جی۔ صفائی

کرنے اور کپڑے دھونے والی کو بی بی ان سب کے بچوں کے ساتھ بھی میں کھیلا کرتی تھی۔ انہیں زبردستی پڑھایا بھی کرتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ جب میں بنگلے سے نکل کر سرونٹ کوارٹر میں پہنچی تو مجھے اس ایک بات کے سوا کسی چیز کا ملال نہیں تھا کہ میرے ساتھ بڑی اماں نہیں تھیں۔ البتہ اس جگہ کی بے ترتیبی نے مجھے اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ کوارٹر دو کمروں کا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ جن کے سامنے اس قدر گنجائش بھی تھی کہ دو چار پائیاں ڈالی جا سکیں۔ اور ایک طرف ایک چھوٹا سا باتھ روم بھی تھا اور کچن بھی۔ ماسی نے دونوں کمروں میں ایک ایک بان کی چار پائی ڈال رکھی تھی اور بس گھر بھر میں اس کے علاوہ فرنیچر کے نام پر ایک پرانی میز اور ایک پیڑھی تھی۔ باتھ روم گندا تھا جس کا فرش ہر وقت پانی سے چپ چپ کرتا رہتا تھا۔ کچن میں ایک تیل کا چولہا اور چند ایک ضرورت کے برتن تھے۔ وہ بھی میلے میلے' کالے کالے سے۔

میری نفاست پسند طبیعت کو یہ گوارا نہیں تھا۔ صبح تو اسکول جانا تھا اس لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی لیکن واپس آ کر کھانا کھانے کے ساتھ ہی پانی کا پائپ لگا کر میں نے دھلائی شروع کر دی۔ بڑی اماں میرا پتا کرنے آئیں تو مجھے پائنچے چڑھائے' جھاڑو اُٹھائے دیکھ کر مسکرا دیں۔

''مجھے پتا تھا کہ آسیہ اس گندگی میں نہیں رہ سکے گی۔ میرا ارادہ تھا کہ شام کو پروین سے ساری صفائی کرواؤں گی۔''

''ماسی بیچاری تو بہت تھک جاتی ہے پہلے ہی اتنا سارا کام کرتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ جگہ میری بیٹی کے قابل نہیں ہے۔'' انہوں نے گہرا سانس لیا پھر بولیں۔ ''یہ صفائی کر لو پھر بہو بازار جا رہی ہے۔ میں پیسے دوں گی۔ اپنے کمرے کے لیے کچھ لیتی آنا۔ پروین نے بھی ایک جھلنگا سی چار پائی ڈالنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔''

چھوٹی امی کے ساتھ میں بازار تو چلی گئی لیکن وہاں جا کر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا خریدوں' بہت سوچ کر بالآخر کپڑوں کے کچھ ٹکڑے' رنگین دھاگے اور چند ایک گملے خرید لائی اور باقی پیسے بڑی اماں کو واپس کر دیے۔

''ارے یہ کیا اُٹھا لائی؟'' انہوں نے میری خریدی ہوئی چیزوں کا جائزہ لیا۔

''ان کپڑوں پر پھول بنا کر انہیں فریم کروا لوں گی اور یوں Wall Hanging بن

جائیں گی۔ چھوٹی امی سے پنیری لے کر ان گملوں میں لگا دوں گی اور انہیں صحن میں رکھ دوں گی۔'' میں نے انہیں پروگرام بتایا۔

انہوں نے ہنس کر میری پیشانی چوم لی۔ ''جیتی رہ۔ اتنی سیانی تو اس گھر کی کوئی لڑکی نہیں۔''

پھر میرا ہاتھ پکڑ کر کوارٹر لے گئیں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کمرے میں بان کے بجائے نواڑ کی چار پائی پڑی ہوئی تھی۔ جس پر خوبصورت چادر بچھی ہوئی تھی۔ ارسلان بھائی کے بیٹے عرفان کے کمرے میں قالین ڈال لینے کے بعد جو پرانی دری اسٹور روم میں بند کر دی گئی تھی' وہ فرش پر بچھی ہوئی تھی۔ کین کی دو پرانی کرسیاں بھی بڑی اماں نے رکھوا دی تھیں۔

میں ان کے گلے لگ گئی۔ ''تھینک یو۔ آپ کتنی اچھی ہیں بڑی اماں۔''

''کچھ عرصے میں میں تجھے پڑھنے والی میز بھی بنوا دوں گی۔ پر تو ابھی سے کسی کو بتانا مت۔''

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

رات کے کھانے کے وقت میں حسبِ معمول بڑی اماں کے ساتھ والی کرسی نکال کر بیٹھ گئی اور کھانے کا ڈونگہ اپنی جانب سرکا لیا۔

''آسیہ!'' چھوٹی امی نے مخاطب کیا۔

''جی۔''

''آج کی خیر ہے لیکن کل سے پروین تمہارے لیے کھانا لے جایا کرے گی۔ کوارٹر میں ہی کھا لیا کرنا۔''

میرا ہاتھ رک گیا۔ میں نے بڑی اماں کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی پلیٹ پر جھکی کھانا کھاتی رہیں۔

''جی اچھا چھوٹی امی۔'' میں نے کہا۔

مجھے بہت بھوک لگی ہوئی تھی مگر چند نوالوں سے زیادہ نہ کھا سکی۔

''اماں! میں ان باتوں میں نہیں پڑتی۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ آسیہ کو گھر کے فراد میں شامل نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہ مجھے مناسب نہیں لگتا۔''

چھوٹی امی کا کہا ہوا فقرہ میرے ذہن سے چپکا ہوا تھا۔ میرے حلق میں آنسوؤں کا

گولہ سا پھنسا ہوا تھا۔ سب سے معذرت کر کے میں کھانے کے درمیان سے ہی اُٹھ گئی۔

''کوئی مجھے اپنا سمجھے نہ سمجھے لیکن میں کیا کروں کہ میرے لیے تو یہی سب لوگ میرے اپنے ہیں جن سے میں محبت کرتی ہوں۔ جن کے بیچ رہنا چاہتی ہوں۔ ہمیشہ' ساری زندگی کے لیے کاش میں چھوٹی امی کی بیٹی ہوتی پھر میں ہی نہیں' گھر کے سب لوگ بھی مجھے اپنا سمجھتے۔ تب میں چاہتی تو ہمیشہ بڑی اماں کے پاس رہ سکتی تھی۔ میں بھی پھر سب سے اپنے دل کا حال کہہ سکتی تھی۔ جیسے بجیا کہتی ہیں' اپیا کہتی ہیں۔ یوں خاموشی مجھے اندر ہی اندر نہ چاٹتی رہتی۔'' اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے میں سوچ رہی تھی اور آنسو میری آنکھوں سے رواں تھے۔

اس کے بعد میں نے کوارٹر میں ماسی پروین کے ساتھ کھانا کھانا شروع کر دیا۔ وہ اپنے اور میرے لیے گھر سے ٹرے میں کھانا لے آتی تھی اور ہم دونوں مل کر باتیں کرتے ہوئے کھانا کھاتے جاتے تھے۔ کبھی ماسی کو گھر کے کاموں میں دیر ہو جاتی تھی تو میں کھانے کے انتظار میں جاگتی رہتی تھی۔ بھوک مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ دل میں آتا کہ خود ہی جا کر کھانا لے آؤں مگر پھر میرے قدم نہیں اُٹھتے تھے یوں لگتا تھا جیسے یہ چوری ہو گی۔ اس لیے یونہی کتابیں کاپیاں کھولے خود کو پڑھائی میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

اور تب بڑی اماں کی محبت دیکھ کر...... میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ جب وہ گھر میں پکا میٹھا اپنی چادر یا دوپٹے میں چھپا کر میرے لیے لایا کرتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ مجھے میٹھا کس قدر پسند ہے۔

''یہ دیکھو' بہو نے بطور خاص تمہارے لیے بھجوایا ہے۔ جلدی سے کھا کر برتن مجھے دے دو۔ میں خود ہی واپس لے جاؤں گی۔'' وہ کہتیں۔

اور میں سوچتی کہ ان کے دل میں محبت کا سمندر موجزن تھا۔ کیسے کیسے پردہ رکھا کرتی تھیں۔ وہ سب وہیں سے میں نے سیکھا تھا کہ ہمیں بھی لوگوں کی کوتاہیوں کو درگزر کرنا اور عیبوں کا پردہ رکھنا چاہیے۔

دن اسی طرح بیتتے جا رہے تھے۔ اس چھوٹے سے شہر میں میری زندگی بہت محدود سی تھی۔ حالانکہ اسکول میں میری بہت دوستیاں تھیں اور بیشتر کلاس فیلوز قریب ہی رہا کرتی تھیں۔ مگر ان سے میری دوستی اسکول کی چار دیواری تک ہی تھی۔ کبھی اگر میں چھٹی کرتی تھی تو

فون پر کسی سے اسکول کا کام لے لیا کرتی تھی اور اسی طرح کبھی اور کوئی لڑکی غیر حاضر ہوتی تھی تو مجھے فون کر کے کلاس اور ہوم ورک لے لیا کرتی تھی۔

گو کہ میری رہائش اور کھانا ماسی کے ساتھ ہو گیا تھا مگر گھر میں مَیں سب کی ناگزیر ضرورت تھی اس لیے اب بھی میرا بیشتر وقت وہیں گزرتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بڑی اماں چپکے سے مجھے اپنے کمرے میں سونے کے لیے بلوا لیا کرتی تھیں۔

مگر اس روز ایک بہت عجیب بات ہوئی۔ رفعت بھابی میکے گئی ہوئی تھیں۔ چھوٹی امی مجھے ارسلان بھائی کے کپڑے استری کرنے کے لئے دے گئی تھیں۔ مجھے اگلے دن ہونے والے ٹیسٹ کی تیاری کرنی تھی اس لیے جلدی جلدی پتلون قمیص استری کر کے ان کے کمرے کی طرف بھاگی۔ دوپٹا سنبھالنا ہمیشہ مجھے مشکل لگتا تھا۔ ہر وقت رسی بنا ایک کندھے پر جھولتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی ایسا ہی تھا اور مجھے اس بات کا احساس تک نہیں تھا۔

''ارسلان بھائی' یہ لیں کپڑے۔''

وہ اپنے بریف کیس پر جھکے فائلیں کھول کھول کر دیکھ رہے تھے۔

''رکھ دو۔''

''کہاں؟ باتھ روم میں لٹکا دوں؟'' میں نے پوچھا۔

''کہیں بھی رکھ دو' میرا دماغ مت کھاؤ۔'' وہ بیزاری سے بولے۔

وہ ہمیشہ اسی طرح بیزار سے دکھائی دیتے تھے۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے' اس سے کم ہی واسطہ رکھتے تھے۔ گھر کی عورتوں کو بھی انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ چاہے ایک دوسرے کا گلا کاٹ دیں لیکن ان کے سامنے عدالت نہ لگائیں۔ یہ نہیں کہ وہ گھر والوں کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ وہ تو بلکہ سبھی کا بہت خیال رکھتے تھے مگر روپے پیسے کی حد تک جہاں کسی کو کچھ ضرورت ہوئی' ان کی جیب سے روپے برآمد ہو جاتے تھے۔ کسی کو ذاتی توجہ دینا ان کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔ چھوٹی سی گھریلو بات جو ان کی توجہ کی متقاضی ہوتی تھی' انہیں ایک دم چڑچڑا بنا دیتی تھی۔ اور وہ عمر کا لحاظ کیے بغیر اچھا بھلا ڈانٹ دیتے تھے۔ اسی لیے میں ان سے دور دور ہی رہتی تھی۔

میں کپڑے باتھ روم میں لٹکا کر باہر نکلی تو وہ بریف کیس میں سے کچھ تلاش کرتے ہوئے بولے۔

"ایک کپ چائے کا بھی دے جاؤ۔"

"ماسی کام سے بازار گئی ہے۔" میں نے انہیں بتایا۔

"تو تم بنا دو۔ کیا ماسی نہیں ہوگی تو گھر کے کام رُک جائیں گے؟" پھر وہی چڑ چڑاہٹ بھرا غصہ۔

"میرا کل ٹیسٹ ہے۔ میں نے اب تک کتاب کھول کر بھی نہیں دیکھی۔ میں فیل ہو جاؤں گی۔" میری آواز بھرا گئی۔

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ جونہی میں کتاب کھولنے کا ارادہ کرتی تھی' کوئی نہ کوئی کام مل جاتا تھا۔ ایک کے بعد ایک کتنے کام میں یہی سوچ کر کرتی رہی تھی کہ بس اس کے بعد پڑھ لوں گی اور یونہی اتنی دیر گزر گئی تھی کہ مجھے یقین ہو گیا تھا اب میں نے پڑھ لیا تب بھی میں فیل ہو جاؤں گی۔

اور شاید آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ارسلان بھائی کی چڑ چڑاہٹ کا شکار ہو جانے کی شامت کم از کم دو دن تک آتی رہتی تھی۔ بات بات پر وہ تب تک ڈانٹتے رہتے تھے جب تک کسی اور وجہ سے ان کا موڈ بحال نہیں ہو جاتا تھا۔

میری آواز میں آنسوؤں کی نمی محسوس کر کے انہوں نے بریف کیس بند کر کے غصے سے میری جانب دیکھا۔

ظاہر ہے میں اس گھر میں رہتی تھی اور اکثر اوقات ان کے اقوالِ زریں سے مستفید ہوتی رہتی تھی جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انہیں عورتوں کے آنسوؤں سے سخت چڑ ہے۔ "یہ ڈراما میری برداشت سے باہر ہے۔" وہ اکثر کہتے تھے۔ اب جو انہوں نے غصے سے میری طرف دیکھا تو مجھے اور شدت سے رونا آ گیا۔ جلدی سے میں نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑیں اور ان کے غصے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

مگر پتا نہیں کیا ہوا۔ ان کی آنکھوں میں لمحہ بھر پہلے جو غصہ اُبھرا تھا' اب دور دور تک کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی جگہ حیرت اُبھر آئی تھی۔ دلچسپی تھی اور وہ یوں میری جانب دیکھ رہے تھے جیسے اب سے پہلے کبھی مجھے نہ دیکھا ہو۔ میں دم سادھے کھڑی تھی اور پل پل بدلتے ان کی آنکھوں کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ پھر یوں لگا جیسے وہ نگاہیں چبھنے لگی ہوں۔ انہوں نے پہلے کبھی میری جانب اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ میرا پورا وجود کانپ گیا تھا۔

گال تمتما اُٹھے تھے۔ بالکل بے اختیاری میں مَیں نے کندھے پر جھولتا دوپٹا ٹھیک کیا اور ان کے قریب سے گزر کر تیزی سے باہر نکل جانا چاہا..... انہوں نے میرا راستہ روک لیا۔ مجھے لگا جیسے وہیں میرا دم نکل جائے گا۔

"تم وہی آسیہ ہو۔" انہوں نے جیسے سرگوشی سی کی۔

"م' مجھے جانے دیں۔ پلیز۔" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

مگر انہوں نے میرا راستہ نہ چھوڑا۔ میں انہیں تقریباً دھکا دے کر کنارے سے نکلی اور بھاگ کر کمرے سے باہر نکل آئی اور وہاں بھی رکے بغیر اپنے کوارٹر کی طرف بڑھ گئی۔ جاتے جاتے چھوٹی امی کی بیزار سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ دسویں میں پہنچ گئی ہے۔ پر عقل نہیں آئی اسے۔ سارے گھر میں کدکڑے لگاتی پھرتی ہے۔"

میں سب کچھ نظر انداز کر کے اپنے کمرے میں گھس گئی اور اندر سے کنڈی لگا لی۔ نیچے دری پر بیٹھ کر ٹھنڈی دیوار سے پشت ٹکائی تو کچھ سانس بحال ہوا۔ میرا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ گال تمتما رہے تھے۔ دل یوں دھڑک رہا تھا گویا پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ہاتھ پاؤں میں عجیب سی سنسنی کا احساس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر تو میں بالکل بے جان سی بیٹھی رہی پھر میری آنکھوں میں ڈھیروں آنسو اُمڈ آئے۔

"یہ کیا ہوا تھا' کیوں کیا ارسلان بھائی نے ایسا؟" میں بار بار خود سے پوچھ رہی تھی اور میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اس روز کے بعد میں محتاط ہو گئی۔ کسی ایسی جگہ جہاں وہ تنہا ہوتے تھے' جانا تو دور کی بات ہے اس طرف دیکھتی' تک نہ تھی' اچانک ہی انہوں نے اپنے بیشتر کام میرے حوالے کر دیئے تھے۔ کبھی مجھے لگتا کہ یہ میرا وہم تھا اور کبھی سوچتی کہ وہ ایسا بلاوجہ نہیں کر رہے۔ عجیب سی کنفیوژن کا شکار ہو گئی تھی میں مگر مجھے اپنا بھید رکھنا آتا تھا۔ اس لیے کسی کو اندازہ نہ ہوا کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔

ارسلان بھائی مجھ سے چائے طلب کرتے تو میں کپ ماسی کے ہاتھ بھجوا دیتی' کپڑے استری کرواتے تو وہ میں ہینگر پر لٹکا کر عرفان کو تھما دیتی۔ اپنا کمرا ٹھیک کرنے کو کہتے تو میں باتوں باتوں میں اپنے ساتھ بڑی اماں کو بھی گھسیٹ لیتی۔ غرضیکہ ان سے دور رہنے کی جو بھی

صورت ہوسکتی تھی' وہ اختیار کرتی۔ یہ کوشش کرتی کہ نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھوں بھی نہ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی میری نگاہیں اٹھ جاتی تھیں اور وہ میری ہی جانب متوجہ ہوتے تھے۔ ایسے میں گھبراہٹ کے مارے میری ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹ پڑتا تھا۔

اس رات ہوا کی وجہ سے ٹی وی کا انٹینا ہل گیا تھا اور چھوٹی امی ڈرامے کی شوقین تھیں۔ میں ابا جی کو اخبار دے کر آئی تو ان کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔

''کہاں گم تھیں آسیہ۔ کب سے تمہیں آوازیں دے رہی تھی۔ چل میری بیٹی' جلدی سے ٹیرس پر جا کر انٹینا ٹھیک کر دینا۔ ڈراما آنے والا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''جی اچھا چھوٹی امی۔''

میں باہر نکلی اور سیڑھیاں چڑھ کر ٹیرس پر لگا انٹینا ٹھیک کر دیا۔ پھر وہیں کھڑے ہو کر تاریکی میں لپٹے دریا کی لہریں دیکھنے لگی۔ یوں بھی ہوم ورک میں دوپہر کے کھانے کے بعد ہی کر لیتی تھی اور ٹی وی کا مجھے کوئی شوق نہ تھا۔ روزمرہ کے دیگر کام بھی نمٹا چکی تھی۔

ٹیرس پر کہنیاں ٹکائے میں سوچ رہی تھی کہ اگر کہیں کسی جل پری کا وجود تھا تو یقیناً میری ماں بھی جل پری ہوگی جو انہی لہروں میں سے نکل کر زمین پر چلی آئی ہوگی۔

اپنی اس سوچ میں' میں اس قدر گم تھی کہ کسی کے آنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ چونکی تو میں اس وقت جب مجھے اپنے دائیں کندھے پر کسی مردانہ ہاتھ کے دباؤ کا احساس ہوا۔ تقریباً اچھل کر میں پلٹی۔ ڈر اور خوف سے میرا حال برا تھا۔ پلٹ کر دیکھا تو ارسلان بھائی روبرو تھے۔ چند لمحوں کے لیے تو بالکل گنگ رہ گئی۔ رات کی تاریکی' لہروں کا پُراسرار شور' کندھے پر لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہاتھ کا دباؤ' ارسلان بھائی کی گرم سانسیں۔ خوف اور دہشت سے خون رگوں میں جمنے لگا۔

''ب تک چھوگی۔'' انہوں نے سرگوشی کی اور اپنا دوسرا ہاتھ میرے کندھے پر جما دیا۔

''چھوڑیں پلیز' مجھے چھوڑ دیں۔'' میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے منت کی۔

مگر ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

''جانے دیں ناں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔'' میرے منت بھرے لہجے میں آنسوؤں کی نمی بھی گھل گئی۔

لیکن وہ کچھ سننے پر تیار نہیں تھے۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں چیخنا چاہتی تھی مگر چیخ نہیں پا رہی تھی۔ انہوں نے مجھے خود سے قریب کر لیا۔

بس ایک لمحہ تھا میرے پاس خود کو بچانے کے لیے۔ میں نے ان کے بازو پر دانت گاڑ دیئے اور جونہی ان کی گرفت ڈھیلی پڑی' میں خود کو چھڑا کر نیچے بھاگ گئی۔ اور بڑی اماں کے کمرے میں خود کو بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی۔ یہاں میں سب سے زیادہ محفوظ تھی۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے آتے وقت مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ کہاں جاؤں گی' کس جگہ چھپوں گی۔ بالکل غیر شعوری طور پر بڑی اماں کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ بڑی اماں ٹی وی پر ڈراما دیکھ رہی تھیں۔ خود کو ذرا محفوظ محسوس کیا تو میں وہیں دروازے سے ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھ گئی۔ میرا پورا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ چیخ چیخ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا لیکن میں دم سادھے بیٹھی رہی۔ خوف و دہشت میری نس نس میں سرایت کر چکا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ارسلان بھائی دروازے کے دوسری جانب کھڑے ہوں۔

اس رات بھی نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ خاموشی سے کتنے آنسو بہا دیئے تھے میں نے۔ یہ سوچ مجھے اُلجھائے ہوئے تھی کہ اس بات کا کسی سے ذکر کروں یا نہیں۔ اور کسی سے کچھ کہنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ بس ایک بڑی اماں تھیں لیکن ان سے بھی کیسے کہتی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ اپنے سگے بھائی پر الزام دھرنے کے مترادف ہو۔ گو کہ میرا' ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا' یہ بھی صحیح کہ اب سے پہلے انہوں نے میرے وجود کو کبھی اہمیت ہی نہیں دی تھی مگر میں اپنے دل کا کیا کرتی جس نے انہیں ہمیشہ بھائی ہی مانا اور سمجھا تھا۔ جس نے راتوں کی تاریکی میں اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا تھا کہ کیا فرق پڑتا اگر وہ مجھے چھوٹی امی اور ابا جی کے گھر پیدا کر دیتا۔ جیسے یوسف بھائی' بجیا' اپیا اور ارسلان بھائی کو پیدا کیا تھا۔ پھر اب اپنی زبان پر اس الزام کا ایک حرف لانا بھی کس قدر اذیت ناک تھا۔

اور یہی نہیں۔ بڑی اماں ہی سہی۔ کیا اس گھر کا کوئی فرد اپنے خون کے رشتوں پر مجھے اور میری بات کو اہمیت دے سکتا تھا؟ ممکن ہے یہ سمجھ کر کہ میرے حوالے سے گھر کا سکون تباہ ہو سکتا تھا۔ گھر والے مجھ سے اپنی چھت ہی چھین لیتے۔ یوں بھی میرا کیا حق تھا اس گھر پر؟ ...جواب تک یہاں تھی تو یہ ان کا احسان ہی تھا۔

اس کے برعکس نہ بتاتی' خاموش رہتی تو ممکن ہے زیادہ بڑا نقصان اٹھا لیتی۔ ارسلان بھائی شیر ہو جاتے۔ میں کب تک بچ سکتی تھی۔ ہم ایک ہی گھر میں رہتے تھے اور اس میں تنہائی کے مواقع مل ہی جاتے تھے۔

سوچ سوچ کر میرا سر دکھنے لگا تھا۔ میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی تھی۔ میرے بس میں اتنا ہی تھا کہ رو رو کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگا کرتی تھی کہ وہ ارسلان بھائی کو نیک ہدایت دے اور وہ خود ہی باز آ جائیں۔ میرے پاس تو اس گھر کے علاوہ کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا' کہاں جاتی۔ ارسلان بھائی کے طور طریقے وہی تھے۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ گھات لگائے بیٹھے ہوں۔ میں خود کو حد درجہ غیر محفوظ سمجھنے لگی تھی۔

''کوئی تو ہو میرا اپنا جس سے میں اپنے دل کا درد کہہ سکوں۔ اپنے زخم دکھا سکوں' جو میرے دکھتے دل پر مرہم رکھ سکے۔ کہاں جاؤں میں' کیا کروں۔'' رات کو اکثر روتے ہوئے میں سوچا کرتی تھی۔

میں ان کی نگاہوں سے خوفزدہ رہنے لگی تھی۔ کبھی میں سوچتی تھی کہ انہیں رفعت بھابی اور عرفان کا بھی کوئی خیال نہیں تھا۔ کیسے بے حس تھے وہ۔ ابھی تو ان کی شادی کو بمشکل چھ سال گزرے تھے اور وہ بھابی سے بے وفائی کرنے لگے تھے حالانکہ کس چیز کی کمی تھی ان میں۔ رفعت بھابی ماشاء اللہ خوبصورت تھیں۔ بی اے کر رکھا تھا انہوں نے۔ مزاج کی تیز تھیں لیکن ارسلان بھائی کا مزاج کون سا دھیما تھا۔ پھر انہوں نے عرفان جیسا تحفہ بھی تو دیا تھا انہیں۔

پھر گھر میں ایک اور تبدیلی آ گئی۔ راشد انکل کا بیٹا سہیل ایم اے کے امتحانوں سے فارغ ہو کر چھٹیاں گزارنے اور ریلیکس کرنے وہاں چلا آیا۔ اس کے آتے ہی گھر میں رونق آ گئی۔ روز مرہ کے معمولات سب تلپٹ ہو گئے۔ وہ اتنا ہنگامہ پسند تھا کہ آنے کے ساتھ سارے گھر پر اس کا وجود چھا گیا۔ بڑی اماں اس کے صدقے واری ہوئی جا رہی تھیں ان کے بس میں نہیں تھا کہ دنیا کی ہر نعمت اس کے قدموں تلے ڈھیر کر دیتیں اور وہ بھی ان کی اور باقی گھر والوں کی محبت کا خوب فائدہ اٹھا رہا تھا۔

''پتا ہے دادی اماں! ممی کا خیال ہے کہ میں کراچی میں ساحل سمندر پر چھٹیاں منا رہا ہوں جبکہ میں یہاں آپ کے پاس جہلم میں ہوں۔'' اس نے منہ پھاڑ کر قہقہہ لگایا۔ ''انہوں

نے خود مجھے ائیر پورٹ پر چھوڑا تھا اور ڈھیر ساری تاکیدیں کی تھیں۔ ادھر وہ اور پاپا ائیر پورٹ سے باہر نکلے' ادھر میں ٹیکسی پکڑ کر فلائنگ کوچ کے اڈے پر سیدھا ٹکٹ لے کر یہاں جہلم پہنچا ہوں۔''

اس نے یہ کہا اور میں جو بڑی اماں کے پاس بیٹھی اپنی نئی کاپی پر خاکی کاغذ چڑھا رہی تھی حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اس طرح کا خیال اس کے ذہن میں آ کیسے گیا۔

''اور اسے دیکھیں دادی اماں کیسے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں پھاڑے منہ کھولے میری طرف دیکھ رہی ہے۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

میں شرمندہ ہو گئی اور جلدی سے سر جھکا کر قینچی سے خاکی کاغذ کاٹنے لگی۔

''معصوم سی بچی ہے میری۔ اسے ایسے مت کہا کرو۔ یہ تو حیران ہو گی ہی کہ تم دھوکا دے کر تم ادھر چلے آئے۔'' بڑی اماں بولیں۔

''ہاہاہا'' اس نے پھر اونچا سا قہقہہ بلند کیا۔ ''معصوم ہے یا بیوقوف ہے؟ مجھے تو بیوقوف لگ رہی ہے۔ یاد ہے تمہیں آسیہ!'' اس نے براہِ راست مجھے مخاطب کیا۔ ''جب ہم یہاں سے گئے تھے اس وقت تم فراک سے ناک صاف کرتی تھیں۔ آنٹی تو سر پیٹ لیتی تھیں کہ کوئی فراک نہیں چھوڑتی یہ لڑکی۔''

میرا چہرہ شرمندگی کے مارے سرخ ہو گیا۔ مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں تھی بلکہ مجھے تو ان میں سے کوئی بھی یاد نہیں تھی۔ جب وہ لوگ الگ ہوئے تھے اس وقت میں بمشکل تین' ساڑھے تین سال کی تھی۔

''دادی اماں دیکھا قندھاری انار۔'' اس نے ہنستے ہوئے میرے سرخ چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

میں کاپی' قینچی' خاکی کاغذ' سب کچھ چھوڑ کر کمرے سے باہر چلی آئی۔ اسکول کی حد تک میں ایسی ...... فقرے بازی کے خوب جواب دے دیتی تھی مگر گھر میں اول تو کوئی میرے برابر کا نہیں تھا جس سے ایسی نوک جھونک کی نوبت آتی اور دوسرے ارسلان بھائی کے واقعے کے بعد سے میں لڑکوں کے سلسلے میں بہت محتاط ہو گئی تھی۔ میں جس اسکول میں پڑھتی تھی وہاں لڑکیاں لڑکے دونوں تھے۔ یوں تو میں لڑکیوں کے درمیان بھی کم گو تھی لیکن لڑکوں سے تو بطور

خاص میں نے فالتو باتیں بالکل بند کر دی تھیں۔ میں اپنے لیے نئی مصیبتیں پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ ہوتی تو ہر والدین کی طرح وہ میری کتنی ہی اچھی بری برداشت کر لیتے۔ میری غلطیوں پر مجھے ڈانٹتے۔ یہاں تک کہ شاید مار پیٹ بھی کر لیتے مگر میرے سر سے چھت نہ کھینچتے۔ یہاں میرا پاؤں کہیں پھسل جاتا تو گھر والے ناراض ہو کر مجھے کچھ بھی سزا دے سکتے تھے۔ وہ مجھے گھر سے نکال دیتے تب بھی کوئی انہیں موردِ الزام نہ ٹھہرا سکتا تھا۔ سمجھنے والے مجھے ہی ناشکر گزار سمجھتے۔

یہی وجہ تھی کہ میں سہیل سے دور دور ہی رہتی تھی۔ خود سے اسے مخاطب کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اگر اس کے سلسلے میں کوئی کام ملتا تو وہ بھی میں اکثر ماسی یا بی بی کے حوالے کر دیتی تھی۔ وہ البتہ باز نہیں آتا تھا۔ جہاں موقع ملتا وہیں کوئی فقرہ چست کر دیتا اور میری خاموشی کو بیوقوفی پر محمول کرتا۔ اس کے آنے سے گھر میں اتنا ہنگامہ ہو گیا تھا کہ ارسلان بھائی کافی محتاط ہو گئے تھے۔ یوں بھی وہ کسی بھی وقت گھر کے کسی بھی حصے میں پایا جا سکتا تھا اس لیے انہوں نے میرا پیچھا کرنا کم کر دیا تھا۔ دل ہی دل میں، میں سہیل کی آمد کی شکر گزار تھی اور دعا گو تھی کہ اس کے جاتے جاتے ارسلان بھائی سدھر جائیں۔

اس روز شام کو حسبِ معمول میں برآمدے سے آنگن میں اترتی سیڑھی پر بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ اپنے پیچھے سہیل کی آواز سن کر چونک گئی۔

''دادی اماں، دادی اماں۔''

میں سر جھکائے انگریزی کی کتاب کھولے نظم کا خلاصہ لکھنے میں مصروف رہی۔

''دادی اماں۔'' اب کے اس نے اور زوردار آواز میں پکارا۔

''پتا نہیں بڑی اماں کہاں ہیں۔ جو سن نہیں رہیں اور یہ بھی میرے عین پیچھے کھڑا چلائے جا رہا ہے۔'' میں نے سوچا۔

''کمال ہے دادی اماں۔ میں بلائے جا رہا ہوں آپ کے کان پر جوں بھی نہیں رینگ رہی۔'' کہتے ہوئے اس نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں یوں اُچھل کر پلٹی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ کتاب، کاپی اور پین سب نیچے چپس والے فرش پر گر پڑے۔

''ارے یہ تم ہو۔'' وہ میرے خوف سے پیلے پڑتے چہرے سے بے نیاز ہو کر بولا۔

''میں سمجھا کہ دادی اماں ہیں۔ کچھ ایسے ہی کپڑے ان کے بھی ہیں۔''

تو یہ اس کا مذاق تھا۔ میں کبھی کسی سے سختی سے بات نہیں کرتی تھی مگر اس وقت مجھے شدید غصہ آ رہا تھا۔

''مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔'' میں نے بہت ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''ارے مگر یہ مذاق کب تھا؟ میں حقیقت میں تمہیں دادی اماں سمجھا تھا۔ ایسے رنگوں کے کپڑے میں نے تمہاری عمر کی کسی لڑکی کو پہنے نہیں دیکھا۔ یہ رنگ تو دادی اماں ہی پہنا کرتی ہیں۔'' وہ مزے سے بولا۔

میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا منہ نوچ ڈالتی۔ جانتی تھی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی اس لیے اپنے ہی اندر جلتی کڑھتی کتابیں کاپیاں سمیٹ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

شاید ارسلان بھائی کی وجہ سے میرا ذہن اتنے دباؤ میں نہ ہوتا تو میں بغیر غصے کے اس مذاق کو برداشت کر لیتی۔ مجھ میں بہت زیادہ قوتِ برداشت تھی لیکن اب میرا ذہن اتنا منتشر تھا کہ اس بات نے میرا پارہ چڑھا دیا تھا۔

اپنے گھٹنوں میں سر دیئے روتے روتے میں اپنے بارے میں سوچ رہی تھی۔

''اللہ میاں جی، میں کیا کروں، کہاں جاؤں۔ کیوں تھوڑا سا سکون بھی میرے نصیب میں نہیں ہے۔ میں ایسی پوزیشن میں ہوں کہ اپنے دفاع کے لیے زبان تک نہیں ہلا سکتی۔ آج ایک جال ہے کل نہ جانے کتنے جال ہوں گے۔ کس کس سے بچوں گی میں۔ میں تو اتنی بیوقوف ہوں کہ لوگوں کی چالوں کو سمجھ بھی نہیں سکتی۔ انسان محتاط ہوتا ہے لیکن کہیں تو اس کی نگاہ بھی چوک سکتی ہے۔ کیا خبر کہیں کوئی ذرا سا غیر محتاط رویہ مجھے کس راہ پر لے جائے۔''

''آسیہ!''

اپنے کمرے میں سہیل کی آواز سن کر میں نے ایک دم چونک کر سر اٹھایا۔ میری آنکھوں اور گالوں پر آنسوؤں کے نشان واضح تھے۔ وہ ادھ کھلے دروازے میں کھڑا میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی پیکٹ سا تھا۔

''میں اندر آ سکتا ہوں؟''

''آیئے۔'' میں نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑیں اور دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے

بستر سے اُتر آئی۔

اس وقت ماسی گھر کے کاموں میں مصروف رہا کرتی تھی' اس لیے میں نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔

وہ اندر چلا آیا اور میرے رائٹنگ ٹیبل کے پاس پڑی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا۔

''آئی ایم سوری آسیہ! میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' اس نے ہاتھ میں اُٹھایا پیکٹ میز پر رکھ دیا۔

''اِٹس آل رائٹ۔'' میں نے کہا۔

''مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اس قدر اَپ سیٹ ہوگی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ مذاق کو مذاق کی سپرٹ میں لینا چاہیے۔''

میں خاموش رہی۔

''اور اس وقت تمہیں روتے دیکھ کر مجھے بہت ہی افسوس ہوا ہے۔ میری وجہ سے تم دُکھی ہو' یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔ میرا نہیں خیال تھا کہ یہ ایسا تکلیف دہ مذاق ہوگا۔ جو تمہیں اتنا پریشان کر دے گا۔ دراصل مجھے تمہیں اتنے ڈل رنگ پہنے دیکھ کر اُلجھن ہوتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم کس قدر خوبصورت ہو؟ نہیں تمہیں شاید احساس ہی نہیں ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تم کھلتے ہوئے شوخ رنگوں کے کپڑے پہنا کرو۔ پھر دیکھو تمہارے حسن کو کیسے وہ کیا کہتے ہیں۔ ہاں چار چاند لگتے ہیں۔''

میں کوئی جواب دے کر بات کو طول نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے چپ رہی۔ میرا یہی نظریہ تھا کہ خاموشی بہترین ہتھیار ہے۔ اگر میں خاموش رہتی تو آخر کوئی کب تک بول سکتا تھا۔ ظاہر ہے' تنگ آ کر خود ہی چپ ہو جاتا۔

''میں کب تک بکواس کرتا رہوں گا۔ تمہارے منہ میں بھی زبان ہے یا نہیں؟ خیر جانے دو' یہ بتاؤ تمہارے لیے کپڑے کون خریدتا ہے؟''

''بڑی اماں۔'' میں نے مدھم آواز میں مختصر سا جواب دیا۔

''تب ہی۔'' اس نے بھی مختصر سا تبصرہ کیا۔ ''اور تم خود نہیں جاتیں ان کے ساتھ؟''

میں اس سے اُلجھنا چاہتی تھی کہ وہ کون ہوتا ہے مجھ سے یہ سب پوچھنے والا۔ میں کیا پہنتی ہوں' کیوں پہنتی ہوں۔ کون میرے لیے خریداری کرتا ہے۔ اس سے اسے کیا سروکار

تھا۔ میرا دماغ چاٹنے کے بجائے وہ گھر میں کسی اور کا مغز چاٹے۔

مگر پھر وہی بات کہ میں یہ سب کیسے کہہ سکتی تھی۔ اور پھر خواہ مخواہ بات طول بھی پکڑ لیتی جو میں نہیں چاہتی تھی۔

''نہیں۔'' میں نے اس کی بات کا جواب دیا۔ ''جو وہ لاتی ہیں' پہن لیتی ہوں''

''کہتیں کیوں نہیں کہ اتنے ڈل رنگ نہیں پہنو گی؟''

''ضرورت نہیں سمجھتی۔''

''کیوں خود کو ایک خول میں بند کر رکھا ہے تم نے۔'' وہ اُلجھ پڑا۔

''کیونکہ میرا اس گھر سے۔'' میں نے تلخی سے کہنا شروع کیا لیکن اسی وقت زبان دانتوں تلے دے دی۔ یہ میں کیا کہنے چلی تھی۔ ان لوگوں کے متعلق جن کے احسان تلے میرے جسم کا ایک ایک بال دبا ہوا تھا۔

ایک لمحے کو آنکھیں موند کر میں نے گہرا سانس لیا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری جانب بغور دیکھ رہا تھا۔

''کہہ دو جو کچھ تمہارے دل میں ہے۔ یہ بات یہاں سے باہر نہیں نکلے گی۔''

ہاں' میرے لہجے میں اسی قدر تلخی تھی کہ اس نے اسے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا۔ میرے ان چند الفاظ نے اسے بتا دیا تھا کہ میرے اندر کتنا غبار جمع تھا۔ جس کی وجہ سے میں اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔

اس کا لہجہ اور اس کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ میں اس پر اعتماد کر سکتی تھی۔ اس سے سب کچھ کہہ کر شانت ہو سکتی تھی۔ اپنے ذہن کا ہر بوجھ پھینک سکتی تھی۔

مگر میری محتاط طبیعت۔

''نہیں' کوئی بات نہیں ہے' آپ جائیں مجھے پڑھنا ہے۔'' میں نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر کہا۔

''پڑھو گی کیسے۔'' اس کے انداز میں شرارت لوٹ آئی۔ ''تمہارے پین کی نب فرش پر گر کر ٹوٹ گئی ہے۔ تمہارے غصے کا آتش فشاں اتنا اُبل رہا تھا کہ تمہیں شاید پتا بھی نہ چلا۔ چاہو تو دیکھ لو۔''

اگر میرے پین کی نب ٹوٹی تھی تب بھی واقعی مجھے اس بات کا علم نہیں ہوا تھا۔ بہرحال

اس وقت میں نے اس کی بات کو چیلنج نہیں کیا۔ نہ ہی اپنا پین اُٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی۔

''میں نے سوچا کہ کہیں میرے زبانی کلامی سوری کہنے کو بھی تم مذاق نہ سمجھو اس لیے ثبوت کے طور پر یہ لایا ہوں۔ امید ہے تمہیں اچھا لگے گا۔'' اس نے میز پر پڑا پیکٹ میری جانب بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے ہاتھ بڑھائے بغیر پوچھا۔

''خود ہی دیکھ لو۔''

''تھینک یو' مگر میں یہ لے نہیں سکتی۔ آپ نے سوری کہہ دیا' میں نے اسے مذاق نہیں سمجھا.....'' میں بولی۔

''پھر بھی میں یہ تمہارے لیے ہی لایا ہوں۔''

میں نے تب بھی ہاتھ آگے نہ بڑھایا۔ میں سخت اُلجھن میں مبتلا تھی کہ کیا کروں' کس انداز سے انکار کروں۔ جس سے نہ تو اسے غصہ آئے اور نہ ہی وہ مزید اصرار کرے لیکن ایسا کوئی طریقہ میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

چند لمحے میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''یہ تمہارے لیے ہی ہے۔''

وہ کمرے سے نکلا تو میں اس کی طرف دیکھتی ہی رہی۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ پیکٹ اُٹھا کر اسے واپس کر دوں یا وہیں پڑا رہنے دوں۔ اسی گومگو کے عالم میں تھی کہ وہ کمرے سے نکل گیا۔

یہ طے تھا کہ میں ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتی تھی لیکن ان کا کیا کرتی' یہ بھی سمجھ میں' نہیں آ رہا تھا۔ اب پیکٹ اُٹھا کر اس کے پیچھے جانا' اسے آدھے راستے میں جا لینا' انکار کرنا' اس کا اصرار سننا' اپنا نقطہ نظر بیان کرنا' اس کا سننا' بحث مباحثہ کرنا' یہ سب انتہائی غیر مناسب ہی نہیں' میرے مزاج کے بھی خلاف تھا۔ ایک صورت یہ تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں میں یہ پیکٹ اس کے کمرے میں چھوڑ آتی لیکن یہ کوئی حل نہیں تھا۔ وہ پھر اس سمیت میرے پاس آ سکتا تھا۔ پہلے سے زیادہ اصرار کے ساتھ۔ یہ خیال بھی آیا کہ اسے اُٹھا کر دریا میں پھینک دوں۔ تاکہ جان ہی چھوٹ جائے مگر اس طرح وہ یہ سمجھ سکتا تھا کہ میں نے اس کا دیا ہوا تحفہ قبول کر لیا ہے۔ جبکہ میں تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اس پیکٹ میں کیا تھا۔ وہ سمجھتا کہ میں نے ایک تحفہ قبول کر لیا ہے تو ممکن ہے کل کچھ اور اُٹھا لاتا اور یوں راہ ہی کھل جاتی۔ نہ

جانے وہ مجھے کیسی لڑکی سمجھ بیٹھتا۔

بہت سوچ سوچ کر ایک ہی صورت دکھائی دی۔ اسے بہت دن کے لیے یہاں نہیں رہنا تھا۔ ممکن ہے مزید چند دن' ممکن ہے چند ہفتے' چند مہینے مگر اسے بہر حال واپس چلے جانا تھا۔ وہ گھر کا ایسا فرد نہیں تھا جس کے ساتھ مجھے ہمیشہ رہنا ہوتا۔ آج وہ اپنے ماں باپ سے چھپ کر چلا آیا تھا۔ آئندہ شاید یہاں کبھی آتا ہی نہیں۔ اس لیے محتاط ہو کر اس کے سلسلے میں بڑی اماں سے بات کی جا سکتی تھی۔ پھر یہ کوئی ایسی حرکت بھی نہیں تھی جسے انہیں بتاتے ہوئے مجھے خود شرمندگی ہوتی یا میری زبان لڑکھڑا جاتی۔ انہیں بتانے سے یہ فائدہ ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے اپنے کوارٹر تک محدود رہنے کا کہہ دیتیں اور میری جان سہیل سے ہی نہیں ارسلان بھائی سے بھی چھوٹتی۔

میں رات اس وقت تک انتظار کرتی رہی جب بڑی اماں عشاء کی نماز پڑھا کرتی تھیں۔ تب وہ اپنے کمرے میں اکیلی ہوا کرتی تھیں اور میں بغیر کسی کے علم میں لائے ان سے یہ بات کر سکتی تھی۔ یوں بھی ان کا کمرا باقی کمروں سے قدرے ہٹ کر اسی لیے تھا کہ وہ اپنی عبادت میں شور شرابا برداشت نہیں کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں ضرورت کے علاوہ کوئی نہیں آیا کرتا تھا۔

گھڑی پر وقت دیکھ کر میں نے پیکٹ اُٹھا لیا کہ اب تک وہ یقیناً نماز سے فارغ ہو چکی ہوں گی میں کمرے میں داخل ہوئی تو وہ تسبیح پڑھ رہی تھیں صوفے پر ٹانگیں اوپر کر کے' پیکٹ گود میں رکھ کر میں ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہ دعا مانگ کر اور جاءنماز لپیٹ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''شام سے اب تک کہاں تھیں۔ میں ڈھونڈ رہی تھی اور تم ملیں ہی نہیں۔'' انہوں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''میں اپنے کمرے میں تھی۔''

''کیا کوئی امتحان ہے کل؟ میں نے شام کو تمہارے ہاتھ کی چائے نہیں پی تو مزہ ہی نہیں آیا۔''

مجھے افسوس ہونے لگا۔ آج شام کی چائے واقعی میں نے نہیں بنائی تھی۔

''آپ نے مجھے بلا لیا ہوتا۔ میں آ جاتی۔ ابھی بنا دوں چائے؟'' میں نے پوچھا۔

"نہیں' اب تو کھانا کھاؤں گی۔"

"بڑی اماں! مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا۔" بہت ہمت مجتمع کر کے میں نے کہا۔

"ہاں کہو۔" ان کا انداز حوصلہ افزا تھا۔

"میں آج اپنا ہوم ورک کر رہی تھی کہ مجھے سہیل بھائی نے ڈرا دیا۔ میرا پین گر کر ٹوٹ گیا۔ میں نے ان پر تھوڑا سا غصہ بھی کیا۔" میں شرمساری سے کہہ رہی تھی۔ "ابھی کچھ دیر پہلے وہ آئے' سوری کیا اور یہ پیکٹ دے گئے۔ میں نے منع کیا لیکن وہ مانے نہیں۔ کہہ رہے تھے۔ پین ہے اس میں' مگر اتنے بڑے پیکٹ میں صرف پین تو نہیں ہو سکتا۔ میں اسے رکھنا نہیں چاہتی۔ آپ یہ انہیں واپس کر دیں۔"

بڑی اماں کی طرف سے چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ میں جو نظریں جھکائے ان سے بات کر رہی تھی' گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی خاموشی سے میں ایک دم خوفزدہ ہو گئی تھی۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی ہوں گی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے نگاہیں اٹھا دی تھیں۔

مجھے خبر نہیں کہ سہیل وہاں کب آیا تھا۔ جب میں نے بات شروع کی تھی تب وہ وہاں نہیں تھا اور اب جو نگاہ اٹھا کر دیکھا تو بڑی اماں کے گلے میں بازو ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ میں اور خوفزدہ ہو گئی۔ یہ سوچنے لگی کہ اب نہ جانے بڑی اماں مجھے کیا کہیں گی وہ بہرحال ان کا پوتا تھا۔ بچ سکتا تھا۔ میں انہیں بہت پیاری تھی پھر بھی غیر تھی۔ ممکن ہے کہیں میں ہی غلط ٹھہرائی جاؤں۔

یہ تمام تر سوچ لمحہ بھر کی بات تھی۔ بڑی اماں نے اسے گھورا۔

"تم نے آسیہ کو ڈرایا تھا؟"

"میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ سیڑھیوں پر آپ بیٹھی ہوئی ہیں۔ کپڑے دیکھے ہیں' کیا پہن رکھے ہیں اس نے؟ میں تو توقع نہیں کر سکتا تھا کہ ایسے رنگ دادی اماؤں کے علاوہ بھی کوئی پہن سکتا ہے۔ وہ بھی ایسی لڑکی جو میٹرک میں پڑھ رہی ہو۔ بس اس لیے دادی اماں' دادی اماں پکارتا رہا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو آپ سمجھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ تو ڈرنے پر تیار بیٹھی تھی۔ ایسے اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ کاپی' کتاب' پین سب فرش پر۔ اب ظاہر ہے قصور میرا نہیں تھا۔ کس نے کہا تھا دادی اماں لگے۔"

بڑی اماں نے اس کا کان کھینچا۔ "اب ستایا تم نے آسیہ کو تو کان جڑ سے نکال دوں گی۔

کچھ رحم کرو تم لوگ اس بن ماں باپ کی بچی پر۔ کیوں دل دکھاتے ہو اس کا۔ وہ کچھ نہیں کہتی تو سب کے حوصلے بڑھتے جاتے ہیں۔"

اس نے اپنا کان بڑی اماں کی گرفت سے چھڑایا۔ "یہی تو مجھے الجھن ہوتی ہے کیوں نہیں کچھ کہتی آخر؟ اس عمر کی لڑکیوں کے پاس تو باتیں ختم ہی نہیں ہوتیں وہ گڑیا ہے گھر میں: ایک منٹ کو اس کی زبان تالو سے نہیں لگتی۔ یہ کیوں چپ رہتی ہے ایسا لگتا ہے اسی سال کی کسی بڑھیا کی روح گھسی ہوئی ہے اس میں۔"

"کس کے آگے بولے بیچاری اور کیسے بولے۔ یہ شکر ہے کہ کسی نے اب تک نکالا نہیں ہے اسے یہاں سے۔ اگر اس گھر میں کھاتی پیتی ہے تو کسی کا احسان نہیں ہے اس پر' صبح سے رات تک پھرکی کی طرح کام کرتی رہتی ہے۔ اپنی پڑھائی سوا الگ مگر اپنی سوچ کی بات ہے۔ یہاں سب کو اپنا دیا نظر آتا ہے۔ اس کا کیا کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔"

تب اٹھ کھڑی ہوئی۔ "بڑی اماں یہ پیکٹ۔" میں نے پیکٹ ان کی طرف بڑھایا۔ "میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔"

کم از کم میرا اٹکا سانس بڑی اماں کی باتیں سن کر بحال ہو گیا تھا۔ اس موقع پر میرا ساتھ دے کر انہوں نے میری گردن احسان مندی سے کچھ اور جھکا دی تھی۔

"دیکھا کتنی سیانی ہے میری آسیہ۔" انہوں نے پیکٹ میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے فخر سے کہا۔

سہیل نے وہی پیکٹ ان کے ہاتھ سے لے کر زبردستی مجھے تھمانے کی کوشش کی۔ "اگر یہ تم نے نہ لیا تو میں سمجھوں گا کہ تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو اور میں مزید ایک لمحہ بھی اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ میں نے صرف مذاق کیا تھا اور مجھے علم نہیں تھا کہ میرا مذاق اس قدر مہنگا پڑے گا۔"

میں دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ملتجی نظروں سے بڑی اماں کو دیکھا۔

"چلو لے لو۔ اس طرح چھپ کر دینا برا تھا۔ اب میرے سامنے دے رہا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔" وہ بولیں۔

"میں نے ہرگز چھپ کر نہیں دیا تھا۔ مجھے کسی سے کچھ چھپا کر کیا کرنا ہے۔ نہ ہی میں نے کوئی ایسی چیز دی ہے جسے چھپایا جائے۔" وہ تیز لہجے میں بولا اور پیکٹ پر چڑھا رنگین کاغذ

پھاڑ کر پھینک دیا۔اندر سرخ پرنٹڈ سوٹ چمک رہا تھا۔ایک پین اور خوبصورت سکربل پیڈ بھی تھا۔

''دیکھ لیں کوئی ایسی چیز نہیں جو چھپائی جائے۔'' وہ سوٹ' پین اور سکربل پیڈ بڑی اماں کے بیڈ پر پھینک کر کمرے سے نکل گیا۔

میں وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔وہ غصے میں نکل گیا تھا اور چیزیں پٹخ گیا تھا۔نہ جانے اب میرے لیے کیا کرنا مناسب تھا۔کیا مجھے وہ چیزیں اُٹھالینی چاہیے تھیں یا پھر انہیں ویسے ہی چھوڑ کر نکل جانا چاہیے تھا؟ پھر بڑی اماں نے ہی میری مشکل آسان کی۔''اس کا تو دماغ خراب ہے۔اپنی ماں کی طرح گھڑی بھر میں منہ پھلا لیتا ہے بلا وجہ۔'' پھر پُر خیال انداز میں بولیں۔''کہتا تو ٹھیک ہے تمہارے پاس جوڑے ہیں ہی کتنے میں نہ بنا کردوں تو کسی کو خیال ہی نہ آئے۔اپنا اترا ہوا پہنانے لگیں۔اب کے تم اپنی پسند سے جوڑا لے آنا۔کل ہی مجھ سے پیسے لے جانا۔اور یہ بھی سی کر پہن لینا۔غصہ تو کرتا ہے پر دل کا برا نہیں ہے۔شکر ہے ماں والی یہ خصلت نہیں آئی اس میں۔''

سوٹ تو وہیں بڑی اماں کی الماری میں رکھ دیا اور پین اور سکربل پیڈ اپنے کمرے میں لے آئی۔اب کم از کم میرے دل پر بوجھ نہیں تھا۔آج کے دن تک میں نے اسی گھر سے لے کر کھایا تھا۔یہیں سے ملا ہوا پہنا تھا جو بڑی اماں کی اجازت سے مجھے ملا تھا۔تسلی یہ تھی کہ میں نے ان سے کچھ چھپایا نہیں تھا۔جو کچھ میرے اور سہیل کے بیچ ہوا تھا اس کی انہیں خبر تھی اور اس کا تحفہ قبول کرنے کی انہوں نے مجھے اجازت دے دی تھی۔

جاتے جاتے البتہ انہوں نے تاکید کی تھی۔

''کسی کو بتانا مت کہ یہ سب کس نے دیا ہے۔کوئی پوچھے تو میرا نام لے دینا۔بہو کی تو خیر ہے لیکن ارسلان کی بیوی کی گز لمبی زبان ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔اس قسم کی تاکیدیں وہ اکثر ہی کرتی رہتی تھیں۔

رات بستر پر لیٹ کر میں سوچنے لگی کہ سہیل نے تحفہ دیا تھا جو مجھے قبول بھی کرنا پڑا لیکن ایسے کہ وہ غصے میں کمرے سے نکل گیا۔یہ بری بات تھی کہ میں اس کے دیئے ہوئے کپڑے پہنتی'اس کے پین سے لکھتی پھر بھی اسے خفا رہنے دیتی۔

ایک تو میرے لیے یہ بہت بڑا مسئلہ تھا کہ مجھے قدم قدم پر حدود کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔

اس گھر میں مکمل طور پر نوکرانی کی حیثیت سے رہ رہی ہوتی تو ان حدود کا تعین آسان ہوتا یا پھر چھوٹی امی کی بیٹی ہوتی تب بھی اب میں کچھ بھی نہیں تھی۔نہ نوکر نہ مالک گھر والے اپنے مزاج اور کام کے لحاظ سے کبھی مجھے نوکروں کی صف میں شامل کر دیتے تھے اور کبھی اپنے برابر بٹھا لیتے تھے۔ایسے میں میرے لیے بہت مشکل ہو جاتا تھا۔یہ طے کرنا کہ کس سے کس انداز میں اور کس قدر کھل کر گفتگو کی جائے۔

اس لیے میں سوچ رہی تھی۔ان حالات میں سہیل کا مجھ سے خفا رہنا تو نامناسب ہے۔لیکن اسے منانا اس سے زیادہ مشکل۔وہ کیا طریقہ ہو سکتا تھا جس سے وہ ایک مناسب فاصلے پر رہتے ہوئے راضی ہو جائے۔اس کا حال تو یہ تھا کہ ہر ایک سے بے تکلف ہو جاتا تھا۔

بہت سوچنے کے بعد ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی۔

''میں اسے تھینک یو کا کارڈ دے دیتی ہوں۔وہ بھی اس طرح کہ پہلے بڑی اماں کو دکھاؤں گی۔انہوں نے اجازت دی تو اسے دے دوں گی۔اگر انہیں یہ بات نامناسب لگی تو خود ہی مجھے منع کر دیں گی۔''

یہ خیال آتے ہی میں اٹھی اور بتی جلا کر اپنے واٹر کلرز نکال لیے۔کافی محنت سے کارڈ تیار کیا اور مطمئن ہو کر سوگئی۔

بڑی اماں کو کارڈ دکھا کر دینے کی وجہ بتائی تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

''دے دو' کاغذ کا ٹکڑا ہی ہے۔یہ تو نئے فیشن ہو گئے ہیں۔ہمارے وقتوں میں تو منہ سے ہی شکریہ کہہ دیتے تھے۔''

میں نے ان سے نہیں کہا کہ گفتگو سے ہی تو بچنا چاہتی تھی۔

جس وقت وہ اپنے کمرے میں نہیں تھا' میں وہ کارڈ میز پر ایک کتاب کے نیچے اس طرح رکھ آئی کہ اسے فوراً ہی نظر آ جائے۔

شام کو ہمیشہ کی طرح سیڑھی پر بیٹھی میں ہوم ورک کر رہی تھی کہ وہ میرے برابر آ بیٹھا۔

''میں اس شکریے کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔'' وہ بولا۔

میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔وہ میرے بہت قریب نہیں تھا لیکن اسی سیڑھی پر میرے برابر تھا۔میں ایک دم خوفزدہ ہو گئی۔

''کہیں یہ بھی ارسلان بھائی کی طرح۔''میں اس سے آگے سوچ بھی نہ سکی۔

"ہر وقت گھبرائی ہوئی، فکر مندسی کیوں رہتی ہو۔" وہ دلچسپی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں کام کر رہی ہوں۔ آپ پلیز جائیں۔"

"یہاں فرش پر بیٹھ کر کیوں پڑھتی ہو۔ تمہارے کمرے میں تو رائٹنگ ٹیبل بھی ہے۔" اس کا اٹھنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔

"وہیں چلی جاتی ہوں۔" میں اٹھنے لگی۔

"بیٹھو۔ میں چلا جاتا ہوں۔" وہ بولا۔ میں رک گئی۔ اٹھا وہ بھی نہیں۔

"کیا پڑھ رہی ہو؟"

"انگلش۔"

"ادھر دکھاؤ اپنی کتاب۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا

میں نے کتاب اسے تھما دی۔

"پوئم پڑھی جا رہی ہے۔ پوئٹری (Poetry) کا شوق ہے؟"

"ہوں۔ ویسے ہوم ورک بھی ملا ہوا ہے سمری لکھ رہی ہوں۔"

"تم لوگ سمری لکھتے ہو؟"

"جی امتحان میں بھی آتی ہے۔ اس لیے لکھنی تو ہوتی ہے۔" میں نے بتایا۔

وہ ہنس پڑا۔ "تو پہلے لکھتی ہو گی، پھر یاد کرتی ہو گی۔ ہے ناں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اس کا مطلب ہے نکمی اسٹوڈنٹ ہو۔ بھئی سمریاں کون لکھتا اور یاد کرتا ہے، یہ تو ایسی چیز ہے جو امتحان دیتے وقت وہیں لکھی جاتی ہے۔"

"وہ تو مشکل ہوتا ہے۔ میں لکھ کر یاد کر لیتی ہوں۔" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ہمارے ہاں تو ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔

"خود ہی لکھتی ہو؟"

"کچھ خود لکھتی ہوں کچھ ٹیسٹ پیپر سے دیکھ لیتی ہوں۔ پھر مس چیک کر لیتی ہیں جو غلطیاں ہوتی ہیں، وہ نکال دیتی ہیں۔"

"دو میں لکھ دیتا ہوں تمہیں۔" اس نے کاپی پین لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

مجھے اپنی مشکل آسان ہوتی لگی۔ اصولاً یہ کام مجھے کل کر لینا چاہیے تھا مگر پریشانی اور سوچوں میں کر نہیں پائی تھی۔ اب یہ کام بھی کرنا تھا اور پاکستان اسٹڈیز کا ٹیسٹ بھی یاد کرنا تھا۔ کچھ کیمسٹری کے نومیریکلز بھی تھے۔

"تھینک یو۔" میں نے ممنونیت سے کہا۔ "میں اتنی دیر میں کیمسٹری کا کام کر لوں گی۔"

اس لمحے پہلی مرتبہ میں نے اپنے اور سہیل کے بیچ سے کھنچاؤ کی کیفیت ختم محسوس کی۔ وہ صرف شرارت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ میری مدد بھی کر سکتا تھا۔

میں نے دوسری کتاب اور کاپی کھول لی۔

"تمہارا آگے فائن آرٹس پڑھنے کا ارادہ ہے؟" اس نے لکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ میں ڈاکٹر بنوں گی۔ بڑی اماں بھی کہتی ہیں، مجھے ڈاکٹر بننا چاہیے۔"

"میں سمجھا کہ فائن آرٹ پڑھو گی۔ اتنا خوبصورت کارڈ بنایا تم نے کہ میں حیران رہ گیا۔ واٹر کلرز کو ہینڈل کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔"

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "تھینک یو۔" اب مجھے اس سے گھبراہٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

وہ بھی جواباً مسکرایا۔ "تمہیں معلوم ہے تمہاری سائل (مسکراہٹ) کس قدر خوبصورت ہے۔ تم بہت حسین ہو۔"

میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کا انداز بہت جدا تھا۔ اس انداز سے جوار سلان بھائی کا انداز تھا۔

میں جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں اپنے کمرے میں جا کر ٹیسٹ یاد کر لوں۔"

وہ ہنس پڑا۔ "جاؤ۔"

ٹیسٹ یاد کرنا میرے لیے مشکل ہو گیا۔ اس کی آنکھیں، ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ اس کے الفاظ، اس کی ہنسی کھلی کتاب کے ہر صفحے پر بکھر گئی۔

"تمہیں معلوم ہے تمہاری سمائل کس قدر خوبصورت ہے۔ تم بہت حسین ہو۔"

اس کے الفاظ ابھی تک میری سماعت میں رس گھول رہے تھے۔

بس ایک لمحے کی بات تھی۔ پل بھر پہلے تک وہ مجھ سے کتنا دور تھا۔ مجھے اس سے کتنا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اور اب یوں جیسے وہ ہر طرف تھا۔ پورا کمرا اس کی مسکراہٹ سے بھرا ہوا

تھا۔ اس کی ہنسی سے گونج رہا تھا۔ چاروں اور سے اس کی آنکھیں مجھے تک رہی تھیں۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے تمہاری سمائل کس قدر خوبصورت ہے۔ تم بہت حسین ہو۔''

اپنے سنہری بال اور نیلی آنکھیں مجھ سے پہلے بھی کہا کرتی تھیں کہ وہ اردگرد پھرنے والی لڑکیوں سے مختلف تھیں اور چھوٹی امی تو اکثر کہتی تھیں۔

''دیکھو آسیہ کی جلد کتنی شفاف سی ہے۔ پتا نہیں یوسف کی بیٹی کو کیا ہے۔ ابھی سے منہ پر دانے نکلنے لگے ہیں۔ حالانکہ چھوٹی ہے آسیہ سے۔''

اور بجیا جو ایسے تبصرے کرنے میں ماہر تھیں فوراً کہتی تھیں۔

''ان لڑکیوں کے چہروں کو کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جتنی نوکرانیاں' جمعدارنیاں ہوتی ہیں' دیکھیں کسی کے چہرے پر بھی ایک دانہ' ایک کیل تک نظر نہیں آئے گا۔ یہ ہماری کھاتے پیتے گھروں کی لاڈلیوں کے نخرے ہیں۔ ستیاناس ہو جاتا ہے چہروں کا۔''

چھوٹی امی کہتیں۔'' یہ تو ہے ان کم بختوں کے چہرے اتنے صاف ہوتے ہیں مگر اپنی آسیہ کی تو بات ہی اور ہے۔ رنگت دیکھو تو ایسی کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہو۔ یہ کام کرنے والیاں تو سیاہ کالی ہوتی ہیں۔''

''ماں بھی خوبصورت تھی اس کی۔ بیچاری کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ آنکھیں اس کی بھی کچھ ایسے ہی رنگ کی تھیں۔''

''نہیں' اس سے ذرا ہلکا رنگ تھا بالکل ایسا ہی تھا جیسے تم نے نیلی قمیص پہنی ہوئی ہے۔ بس اس سے ذرا سا ہلکا اور کرلو۔'' چھوٹی امی کہتیں۔

یوں بہت سی باتیں میرے کان میں پڑتی رہتی تھیں جو مجھے بتاتی تھیں کہ میں خوبصورت تھی۔ اسکول میں بھی تعریف ہوتی تھی بلکہ ایک مرتبہ تو ایک لڑکے نے میرے ڈیسک میں خط بھی رکھ دیا تھا۔ میں نے اپنی مس سے شکایت کردی اور اس کی خاصی پٹائی ہوئی...... وہ تو شکر ہوا کہ وہ لڑکا سدھر گیا' بلکہ وہی نہیں' میرے معاملے میں اس جیسے باقی لڑکے بھی سدھر گئے۔

یہ سب اپنی جگہ تھا مگر جیسے میری تعریف سہیل نے کی تھی ویسی اس سے پہلے میرے کانوں نے نہیں سنی تھی۔ بات الفاظ کی ہی نہیں انداز کی بھی تھی۔ اس نے چھوٹی سی بات کی تھی پر ایسے کہ میرے کانوں میں گھنٹیاں سی بج اٹھی تھیں۔

میں بہت عام سی لڑکی تھی۔ محتاط تو تھی مگر عمر کے اس دور میں تھی جہاں اچانک کوئی بات دل میں اُتر جاتی ہے اور پھر دنوں اس بات کی تار پر جھولتے گزر جاتے ہیں۔ جب فلمی گانے دل میں ہلچل پیدا کرتے ہیں۔ کوئی ایک خوبصورت فقرہ دل کو چھو جاتا ہے۔ کوئی چھوٹی سی بات دل میں گدگدی پیدا کر دیتی ہے۔ صرف ایک مسکراہٹ نیند اُڑا دیتی ہے۔ ہر طرف خوشبو بکھر جاتی ہے۔ دھنک کے رنگ چرا کر چیزیں رنگنے کو جی چاہتا ہے۔ جاگتی آنکھیں خواب دیکھنے لگتی ہیں۔ مسکراہٹ بے وجہ ہونٹوں سے کھیلنے لگتی ہے۔ بے جان چیزیں یوں شرارت سے دیکھتی ہیں جیسے سب بھید جانتی ہوں۔

میں نے بھی ایک لمحے میں اسی وادی میں قدم رکھ دیا تھا۔ میری محدود سی روزمرہ معمولات میں بندھی زندگی کے لیے یہ بہت بڑا واقعہ تھا۔ ایسا واقعہ جس کے بارے میں دنوں نہیں ہفتوں سوچا جاسکتا تھا اور جس کے حوالے سے کتنے خواب بُنے جاسکتے تھے۔

کتاب پر نظریں جمائے میں بیتے لمحوں کو پھر سے بتا رہی تھی۔ جب سہیل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''آسیہ۔''

میں نے نگاہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ کل کی طرح دروازے میں کھڑا تھا۔

''اندر آسکتا ہوں؟''

میرا چہرہ گلابی ہوگیا۔'' آیئے پلیز۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''بھئی' یہ غلط بات ہے۔ یہ حق صرف صنفِ نازک کا ہے کہ ان کے آنے پر کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا جائے۔ عورتیں کب سے یوں کھڑے ہو کر مردوں کا استقبال کرنے لگیں۔'' وہ خوشدلی سے کہتے ہوئے وہیں میز کے کونے پر ٹک گیا۔

میں کنفیوز ہوگئی۔'' سوری۔'' میں نے دھیرے سے کہا اور بیٹھ گئی۔

''یہ رہی تمہاری سمری۔ تین نظموں کی لکھ دی ہیں عیش کرو اور مجھے دعائیں دو۔'' اس نے کاپی اور کتاب میرے سامنے سرکا دیے۔

''تھینک یو۔''

''پتا ہے آسیہ بہت عجیب سی بات ہوئی ہے جانتی ہو کیا؟'' اس کی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ بندہ جس کا نام سہیل ہے' پھنس گیا ایک ایسے پنجرے میں جس کے گرد سلاخیں بھی نہیں ہیں۔''

میں نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرے رخساروں پر تپش بڑھنے لگی تھی۔

''پوچھو گی نہیں صیاد کون ہے۔''

اگر تھوڑی دیر پہلے مجھ پر یہ سب نہ بیتا ہوتا تو میں وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتی اور پھر سہیل سے چھپتی پھرتی۔ دل میں ہزاروں وسوسے اور خوف لیے۔ مگر اب بات بالکل بدل گئی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بولتا جائے اور میں سنتی جاؤں وقت یہیں تھم جائے۔

''تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے آسیہ کہ تم میں کتنی دلکشی' کتنی کشش ہے۔ تم میں ہر وہ خوبصورتی ہے جو تم سے محبت کرنے اور کرتے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ تمہاری صورت ہی نہیں عادتیں بھی پیاری ہیں۔ آئی لو یو۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں اور یہ احساس بہت خوش کن ہے۔''

میں پلکیں جھکائے' دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے اس کی باتیں سن رہی تھی اور ان کی تار سے بندھ کر جھولا جھول رہی تھی ایک نشہ سا تھا جو میرے رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں خمار اتر آیا تھا۔

''تم سن رہی ہو آسیہ؟'' اس نے پوچھا پھر قدرے توقف سے بولا۔ ''کچھ نہیں کہو گی تم؟ کوئی ایک لفظ یا صرف ایک مسکراہٹ۔''

میرے لیے پلکیں اُٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ گال مزید تپنے لگے تھے۔ سب لفظ کہیں گم ہو گئے تھے۔ دور دور تک سہیل کی محبت کی پھوار تھی جس میں مَیں بھیگتی جا رہی تھی۔ باقی ساری دنیا فنا ہو چکی تھی۔ بس میں تھی اور وہ اور ہم محبت کے سمندر میں کھلے کنول پر بیٹھے تیر رہے تھے۔

وہ منتظر ہی رہا۔ نہ میں پلکیں اُٹھا سکی نہ ایک لفظ بھی کہہ سکی۔ وہ اُٹھ کر چلا گیا۔

مگر وہ صرف کمرے سے گیا۔ میرے دل پر اب اسی کی حکمرانی تھی اور جو دل میں رہتا ہو محبت کرنے والے کو ہر طرف' ہر گوشے میں اسی کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی تھا۔ میرے کمرے کے ہر گوشے میں سہیل براجمان تھا۔ میرے سامنے کھلی کتاب

کے ہر ورق ہر سطر پر وہی تھا جو کہہ رہا تھا۔

''تم سن رہی ہو آسیہ؟ کچھ نہیں کہو گی تم؟ کوئی ایک لفظ یا صرف ایک مسکراہٹ۔''

اور میں ہنس رہی تھی۔ یونہی بلا وجہ۔

''میں بھی تم سے محبت کرنے لگی ہوں..... سہیل اور میرے لیے بھی یہ احساس بہت خوش کن ہے۔ کتنی دعائیں مانگی تھیں میں نے کہ کوئی میرا اپنا ہو۔ جس سے میں اپنے دل کی بات کہہ سکوں۔'' مجھے لگتا تھا میری دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔

رات کو میں بلا وجہ کوارٹر سے گھر چلی آئی۔ شاید دل میں کہیں یہ خواہش تھی کہ سہیل کو دیکھ سکوں۔ اس وقت تو پلکیں اُٹھا کر اسے ایک نظر دیکھ بھی نہیں پائی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ کہیں بھی نظر نہ آیا کچن میں آ کر ماسی سے سرسری انداز میں پوچھا۔

''سہیل کہاں ہیں؟''

میں گھبرا بھی رہی تھی۔ گھر میں آنے والے ہر مرد' ہر لڑکے کے نام کے ساتھ میں عادتاً بھائی یا انکل ضرور لگایا کرتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ ماسی مشکوک ہو جائے گی۔

''ذرا عرفان کو لے کر امریکن بیکری تک گئے ہیں۔'' وہ پریشر ککر میں چمچ ہلاتے ہوئے بولی۔

میں خاموشی سے کچن سے باہر نکل آئی۔ اپنی نوخیز محبت کے خمار میں گم مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میں ارسلان بھائی کی نگاہوں کے حصار میں تھی۔ اپنی دھن میں چلتے ہوئے میں نے یہ بھی محسوس نہ کیا کہ صحن کا بلب روشن نہ ہونے کی وجہ سے گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کبھی کبھار ایسا ہو ہی جاتا تھا کہ صحن کا بلب فیوز ہو جائے۔ بہر حال میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا اور کوارٹر کی طرف بڑھتی گئی۔

بالکل اچانک ایک سائے نے میرا راستہ روک لیا۔

''ارسلان بھائی آپ؟'' خوف کے مارے میں دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ذہن ماؤف ہونے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ بھاگ کر کہاں جاؤں۔

وہ لمبا سا ڈگ بھر کر میرے قریب آ گئے۔ چیخنے کے لیے میں نے منہ کھولا ہی تھا کہ انہوں نے اپنا مضبوط ہاتھ میرے منہ پر جما دیا۔ میں ان کی گرفت میں مچل رہی تھی۔ مصیبت کی اس گھڑی میں زمین پر بسنے والوں میں سے میرا ذہن صرف سہیل کی طرف گیا۔

"یا اللہ میاں جی کہیں سے سہیل کو بھیج دے۔ یا پھر ابھی اسی لمحے موت آ جائے مجھے۔"
میں نے سوچا......

"میری بات سنو۔" انہوں نے سرگوشی کی۔ "آئندہ میں کبھی تمہیں سہیل کے ساتھ نہ دیکھوں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ رات بارہ بجے میں چھت پر تمہارا انتظار کروں گا۔ نہ آئیں تو نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔"

انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہاں نہ رُکی اور بھاگ کر کوارٹر میں داخل ہو کر نہ صرف اس کے دروازے کی کنڈی لگا دی بلکہ اپنے کمرے میں آ کر اس کی بھی اندر سے کنڈی لگا دی۔ خوف اور دہشت کے مارے میں تھر تھر کانپ رہی تھی سانس یوں پھولا ہوا تھا جیسے میلوں دوڑ کر آئی ہوں۔ دل و دماغ پر جیسے قابو ہی نہیں تھا۔ میں تو پہلے کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ انسان یوں بھی بدل جاتے ہیں۔ ارسلان بھائی کو دیکھ کر احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس قسم کی گھٹیا حرکتیں بھی کر سکتے ہیں۔ بظاہر وہ کتنے مختلف تھے۔ کچھ بیزار سے۔ کچھ غصے والے اور پیسے کے معاملے میں انتہائی فیاض۔ گھر والوں کے ساتھ ایک نارمل سا رویہ، کبھی خوش کبھی ناخوش۔ کبھی خوشگوار، کبھی ناگوار، کبھی اچھے موڈ میں اور کبھی موڈ آف۔ ان کی شخصیت کا یہ رنگ مجھ سے بالکل پوشیدہ رہا تھا

ماسی کے بے حد اصرار کے باوجود بھی میں رات کے کھانے کا اک لقمہ تک نہ لے سکی۔

"میں نہیں جانتی تو کھیر کی کتنی شوقین ہے۔ بڑی بیگم صاحب نے کہا تھا کہ آسیہ کے لیے چھپا کر لے جانا۔ چل کھا لے۔"

"نہیں ماسی! میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ تم کھا لو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں سونا چاہتی ہوں۔"

"کیا ہوا؟ لگ رہا ہے جیسے روئی ہوئی ہو۔"

"کل اسکول میں ٹیسٹ ہے۔ ہوم ورک بھی چیک ہونا ہے۔ میں نے نہ ہوم ورک کیا اور نہ ٹیسٹ یاد کر سکی۔ سر میں بہت درد ہو رہا تھا۔ اب اسی لیے مجھے رونا آ گیا ہے کہ اسکول میں بہت ڈانٹ پڑے گی۔" میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

"ارے ڈانٹ کیوں پڑے گی۔ ہر دفعہ تو اتنے اچھے نمبر لاتی ہو۔ تمہاری مِس کو حیا نہیں آئے گی ڈانٹتے ہوئے۔ یہ بھی نہ سوچے گی کہ بچی بیمار تھی۔"

ماسی ٹیچر کو صلواتیں سناتی رہی اور میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میری نگاہیں بار بار میز پر رکھی اپنی اس گھڑی کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ جو ابا جی نے مجھے آٹھویں کے بورڈ کے امتحان میں دوسری پوزیشن لینے پر دی تھی۔ کلائی کی اس خوبصورت سنہری گھڑی کی ننھی ننھی سی سوئیاں دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اپنے چھوٹے سے کمرے میں بے چینی کے ساتھ میں کبھی بستر پر لیٹ جاتی تھی کبھی کرسی پر بیٹھ جاتی تھی۔ کبھی کتاب کھول کر پڑھنے لگتی تھی۔ کبھی بتی بجھا کر سونے کی کوشش کرتی تھی اور کبھی تاریکی سے اُلجھن محسوس کرتے ہوئے پھر بتی جلا دیتی تھی۔ کتنی مرتبہ دبے پاؤں جا کر کوارٹر کے دروازے کی کنڈی بھی چیک کر چکی تھی جسے اب سے پہلے بند کرنے کی ضرورت کبھی محسوس ہی نہیں کی تھی۔

"انہوں نے کہا تھا کہ نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا نقصان پہنچائیں گے وہ مجھے۔" میں مسلسل سوچ رہی تھی۔ "وہ تو کچھ بھی کر سکتے ہیں کوئی بھی الزام لگا کر گھر تک سے نکال سکتے ہیں...... پھر میں کیا کروں؟ کیوں نہ جا کر ان سے منت کروں کہ پلیز میرے ساتھ یہ سلوک مت کریں۔ میں تو پہلے ہی بے سہارا ہوں۔ کیوں مجھ پر ایسا ظلم کرتے ہیں۔" میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ایک لمحے کو تو یہ ترکیب اچھی لگی مگر دوسرے ہی لمحے اسے رد کر دیا۔ "نہیں یہ تو خود کو ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے پیش کر دینے والی بات ہوگی۔ خدایا۔ میں کیا کروں، کس سے مدد لوں مشورہ مانگوں۔ اپنے دل کا بوجھ کس کے سامنے ہلکا کروں۔ اب بھی کسی سے کچھ کہہ نہ پائی تو میرا دل پھٹ جائے گا۔"

اپنے چھوٹے سے کمرے میں مجھے شدید گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کھلی ہوا میں سانس لوں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی دم گھٹ جائے گا۔ سر میں درد لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔ ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے ختم ہو رہی تھیں۔ اسی ذہنی کیفیت کے عالم میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر میں باہر نکل گئی۔

ایک تسلی یہ تھی کہ گھر کے ٹیرس سے جہاں ارسلان بھائی نے مجھے بلایا تھا۔ یہ حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا کیونکہ گھر کا ٹیرس سامنے کی طرف تھا جبکہ سرونٹ کوارٹرز گھر کے عقب میں واقع تھے اور میرے کمرے کی کھڑکی تو بالکل ہی پچھلی طرف کھلتی تھی۔ یہ بھی احساس تھا کہ رفعت بھابی گھر پر ہی تھیں اور ارسلان بھائی رات کے ایسے پہر زیادہ دیر تک اپنی خواب گاہ سے غیر

حاضر نہیں رہ سکتے تھے۔

باہر دریا کی لہریں ہمیشہ کی طرح کنارے تک آ کر میرے پاؤں بھگو کر لوٹ رہی تھیں۔ نرم نرم ہوا میں مَیں نے گہرے سانس لیے تو کچھ حواس بحال ہوئے۔ تھوڑی دیر تک وہیں کھڑی ٹھنڈے پانی میں پاؤں دھوتی رہی پھر ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی۔

یہ مسئلہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ کچھ تو کرنا ہوگا۔ مگر کیا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میرا ذہن اسی طرف نکل گیا۔

اسی لمحے کوئی میرے بالکل برابر آ بیٹھا۔

''ارسلان بھائی۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

دہشت کے اس لمحے میں مَیں نے تہیہ کر لیا تھا کہ ان کی ہوس کا نشانہ بننے سے پہلے ہی میں خود کو دریا کی لہروں کے حوالے کر دوں گی۔

لیکن ایک لمحے میں ہی منظر بدل گیا۔ وہ ارسلان بھائی نہیں سہیل تھا۔ چاندنی میں مَیں اسی قدر دیکھ سکی کہ اس کے چہرے کا خوشگوار تاثر ایک دم تبدیل ہو گیا تھا۔ بغیر ایک لفظ کہے وہ اُٹھا اور مکان کی سمت چل پڑا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرا دل نکال کر لے گیا ہو۔ میں نے اسے روکنا چاہا۔ آواز دینا چاہی مگر کچھ نہ کر سکی۔ اور وہ دیوار کی اوٹ میں گم ہو گیا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دوں اپنے نصیب کو۔ اپنی تقدیر کو۔ مگر میں یہ بھی نہ کر سکی۔ دل میں ٹیس سی اُٹھ رہی تھی۔

☆======☆======☆

میری ماں کا نام آسیہ تھا۔ ایک رات جب موسلا دھار بارش برس رہی تھی۔ ممی اپنے شوہر اقبال کے ساتھ میکے میں تھیں۔ سب لوگ رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ گھنٹی کی آواز نے چونکا دیا۔ اتنی طوفانی رات میں کون آ گیا۔ دروازہ کھولا تو ایک عورت بے ہوش پڑی تھی۔ اس عورت کے ہاں کسی بھی وقت ولادت متوقع تھی۔ اسے اندر لایا گیا۔ عورت بے پناہ خوبصورت تھی۔ رات میں کسی وقت وہ ایک بچی کو جنم دے کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ مرنے سے پہلے اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں صرف اتنا کہا تھا۔ ''میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ خدا کے لیے میرے بچے کو تنہا مت چھوڑنا۔ اسے دکھ مت دینا۔ اگر اسے دکھ دینا ہے تو یہیں ختم کر دینا۔ میرے اندر۔''

پولیس کی ضروری کارروائی کے بعد اس عورت کی تدفین کر دی گئی۔ اس کی بچی کو دادی جان نے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود یتیم خانے والوں کے حوالے نہ کیا۔

اس بچی کا نام آسیہ رکھا گیا۔ آسیہ اسی گھر میں رہ کر بڑی ہوئی۔ اس نے اپنی ماں کا حسن پایا تھا۔ دادی جان نے اس کی تربیت بہت اچھی طرح کی تھی۔ آسیہ کی خوبیوں کا پورا گھر معترف تھا۔ جوان ہو کر وہ اور بھی حسین ہو گئی تھی۔

اچانک ایک دن انکشاف ہوا کہ آسیہ ماں بننے والی ہے۔ گھر والوں کی مار پیٹ کے باوجود اس نے اس شخص کا نام نہ بتایا جس کا یہ گناہ تھا۔ دوسرے دن آسیہ گھر میں نہ تھی۔ سارا الزام گھر کی پرانی ملازمہ پروین کے بیٹے صادق کے سر رکھ دیا گیا کیونکہ آسیہ پروین کے کوارٹر میں رہتی تھی اور پروین کچھ عرصہ پہلے ملازمت چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

ممی' اقبال کے ساتھ مک کی کانیں دیکھ کر واپس آ رہی تھیں کہ پروین کی بیٹی انہیں نظر آئی۔ انہوں نے گاڑی رُکوا کر پروین کا ایڈریس لیا اور پروین کے گھر جا پہنچیں۔ پتا چلا کہ آسیہ وہیں رہ رہی تھی۔ پروین نے قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ آسیہ کے گناہ میں اس کا بیٹا شریک نہیں۔ ممی نے آسیہ کی ڈلیوری کے سارے اخراجات پورے کیے اور جو لڑکی پیدا ہوئی' اسے گود لے لیا کیونکہ ممی کو شبہ تھا کہ اس گناہ میں ان کے گھر کا کوئی فرد شریک ہے۔

اب یہاں سے دوسرا باب آسیہ کی زندگی کا شروع ہوتا ہے۔

وہ لڑکی میرے گھر سے نکلی ہے جسے میں بیٹی کہہ کر نہیں پکار سکتی۔ وہ میرے منہ پر تھوک کر چلی گئی ہے۔

میں نے آنکھ کھولی تو گھر میں انسانیت' شرافت کی پیکر بڑی اماں کو دیکھا' وہی میرا خیال رکھتی تھیں لیکن دوسرے لوگوں کی باتوں سے مجھے پتا چل چکا تھا کہ میرا اس گھر سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ ایک طوفانی رات میں میری ماں اس گھر میں پناہ کے لیے آئی تھی اور مجھے جنم دے کر دنیا کو خیر باد کہہ دیا تھا۔

بڑی اماں نے میری تربیت بہت اچھی کی تھی' مجھے پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ اسی طرح میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ بڑی اماں نے گھر میں سب کے کہنے پر مجھے گھر کی ملازمہ پروین کے کوارٹر میں منتقل کر دیا تھا۔

رات بھر ایک پل کو میری آنکھ نہ لگی۔ ٹیسٹ نہ ہوتا تو میں اسکول سے چھٹی کر لیتی۔ اب یہ بھی ممکن نہیں تھا اور مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ اس حال میں پورا دن اسکول میں گزارنا کس قدر مشکل کام تھا۔

صبح کے قریب بہر حال میں ایک فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔

''میں تمہیں نہیں کھو سکتی سہیل کسی بھی صورت نہیں میں ایسی تقدیر کو قبول نہیں کر سکتی جس میں میرے لیے خوف و دہشت کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔ کہیں کوئی ایک خوشی بھی نہ ہو۔ کوئی ایسا فرد نہ ہو جو سچ مچ میرا اپنا ہو۔ اب تم ملے ہو تو کیسے تمہیں کھو دوں۔''

صبح جب سہیل سویا ہوا تھا۔ میں دبے قدموں اس کے کمرے میں گئی۔ اس کا والٹ سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر کے ساتھ ہی میز پر پڑا ہوا تھا۔ اپنی اس تحریر کو کہیں اور چھوڑنا بہت بڑا خطرہ تھا۔ شدت سے دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے اس کا والٹ کھول کر اپنا خط اس

میں رکھ دیا اور خواب گاہ سے باہر نکل آئی۔

کچھ تو رات کے واقعات کا اثر تھا۔ اور کچھ یوں خط رکھ آنے کا کہ اسکول میں بھی میں سخت پریشان رہی۔ ...... کتنے ہی لوگوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''آسیہ اتنی پریشان کیوں ہو؟ خیریت تو ہے؟'' اور میں سب سے جھوٹ بولتی رہی۔ ''کل مجھے بخار اور سر میں درد تھا۔ آج میرا ٹیسٹ اچھا نہیں ہوگا اس لیے پریشان ہوں۔''

میری ٹیچر کو خبر ہوئی تو بولیں۔ ''اگر طبیعت خراب تھی تو آج چھٹی کر لیتیں۔ ٹیسٹ تو ہوتے رہتے ہیں۔''

میں ایسے کسی موقع پر اسکول سے غیر حاضر نہیں ہوتی تھی۔ چھٹی کرنا میری عادت نہیں تھی۔ اس لیے ٹیچر کی اجازت کے باوجود ٹیسٹ دینے بیٹھ گئی۔ گھر آتے ہی میں اپنے کمرے میں گھس گئی۔ سہیل کے والٹ میں خط تو رکھ دیا تھا۔ مگر اب عجیب عجیب سے وہم ستا رہے تھے۔

اگر کسی اور کے ہاتھ لگ گیا تو؟ ویسے رکھا تو اسی کے والٹ میں تھا لیکن اگر اس نے کسی کو دکھا دیا پھر؟ میرے لیے تو ڈوب مرنے کی بات ہو گی اور اگر اس نے بلیک میل کرنا شروع کیا تو؟ یہ خیال سب سے زیادہ خوفزدہ کرنے والا تھا۔ اس بات سے متعلق میں نے بزرگ خواتین کے منہ سے سینکڑوں قصے سنے تھے۔ جن کا انجام لڑکی کے حق میں بہت ہی بھیانک ہوا تھا۔

پھر یہ خیال آتا تھا کہ میں نے اس میں کوئی قابلِ گرفت بات بھی بہر حال نہیں لکھی تھی۔ بہت سادہ سے تین فقرے تھے مگر کیا خبر کون سی بات پکڑ کا باعث بن جائے۔ اپنے لکھے ہوئے خط کو خود میں نے اتنی مرتبہ پڑھا تھا کہ اس کا ایک ایک لفظ حفظ ہو چکا تھا۔ نہ کسی کو مخاطب کیا تھا اور نہ ہی اپنا نام لکھا تھا۔ بس اتنی سی بات کہی تھی۔

''جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں وہ غلط ہے۔ پلیز میری بات کا یقین کریں۔ میرے پاس نہ کوئی ثبوت ہے نہ کوئی دلیل۔ میں صرف ماں کی قسم کھا سکتی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔''

میں کوارٹر میں تھی اور گھر میں کتنے کام رُکے ہوئے تھے۔ بالآخر ماسی میرے پاس چلی آئی۔

''گھر بھر میں آسیہ آسیہ ہو رہا ہے۔ کسی کو کچھ چاہیے اور کسی کو کچھ۔ کوئی کپڑے استری

کروانا چاہتا ہے۔ کسی کو چائے کی ضرورت ہے۔ کوئی فائل ڈھونڈ رہا ہے۔ کسی کو اپنا جوڑا دھلوانا ہے۔ سب کو بیکار کر کے رکھ دیا ہے تم نے۔ عرفان الگ شور مچا رہا ہے کہ آسیہ کو بلاؤ میرے ساتھ کھیلے۔''

وہاں جانا میرے لیے پُل صراط عبور کرنے کے برابر تھا۔

''ماسی' میری طبیعت بہت خراب ہے۔ لگتا ہے سر درد سے پھٹ جائے گا۔'' میں نے ملتجی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے خبر ہے یہی کہہ رہی تھی میں مگر ارسلان صاحب کا غصہ توبہ توبہ۔ دس کام تیار کر رکھے ہیں انہوں نے میں نے کہا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو اتنی زور سے دھاڑے کہ بس کیا بتاؤں کہنے لگے۔

''مری تو نہیں ہوگی' بلا کر لاؤ اسے۔ تم سے ہوتا بھی ہے کوئی کام؟ گھنٹے سے چائے کے ایک کپ کے لیے چیخ رہا ہوں۔ اب تک وہ نہیں ملا۔ جاؤ بلاؤ اسے۔ دو کام کرنے سے مر نہیں جائے گی وہ...''

بس میں ادھر بھاگی آئی۔ سارا گھر تلپٹ ہوا پڑا ہے۔ ساس بہو میں الگ ٹھنی ہوئی ہے۔ نہ چھوٹی بی بی اُٹھ رہی ہیں کام کرنے کو' نہ بیگم صاحب' بڑی بیگم صاحب کا مزاج الگ بگڑ رہا ہے۔ شامت ہم نوکروں کی آئی ہوئی ہے۔'' ماسی نے گھر کی صورتِ حال بتائی۔

میں نے سر پکڑ لیا۔ کس مصیبت میں گرفتار تھی میں۔

''ارسلان صاحب کہہ رہے ہیں کہ جلدی بلاؤ آسیہ کو ورنہ میں خود آتا ہوں۔ اس کا دماغ درست کرنے کے لیے۔ کہہ رہے تھے کہ اس گھر میں سب نوکروں کو حرام خوری کا چسکا ہے۔ ہوتا کچھ نہیں ہے۔ بہانا بنا کر بستر پکڑ لیتے ہیں۔'' ماسی نے مزید تفصیلات گوش گزار کیں۔

میرا دل اُچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ یوں لگا۔ جیسے ابھی اگلے لمحے وہ یہاں موجود ہوں گے۔

''ماسی! بڑی اماں سے کہو' میری طبیعت سخت خراب ہے۔ ان سے کہو وہ یہاں آ جائیں۔'' میں نے اس کے ہاتھ پکڑ کر منت بھرے لہجے میں کہا۔ آنسو خود بخود میرے گالوں پر بہنے لگے۔

ماسی مجھے روتے دیکھ کر گھبرا گئی۔ ''تمہاری طبیعت تو واقعی ٹھیک نہیں لگ رہی۔ میں ابھی ارسلان صاحب سے کہتی ہوں کہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ انہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔ کہ تم سچ مچ بیمار ہو۔ بس غصے کے وہ ذرا تیز ہیں لیکن دل کے برے نہیں ہیں۔ یونہی حرام خور کہہ دیا تھا انہوں نے۔''

وہ اُٹھنے لگی۔

''نہیں نہیں۔'' میں اُچھل کر بستر پر بیٹھ گئی۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر کے پاس نہیں جاؤں گی۔ تم بس بڑی اماں کو بلا دو۔''

وہ کمرے سے نکلی تو میں نے دوڑ کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ باہر کی طرف کھلتی کھڑکی پر عموماً میں پردہ گرائے رکھتی تھی۔ اسے بھی اوپر نیچے دونوں طرف سے کنڈی لگائی اور بستر پر بیٹھ کر گھڑیاں گننے لگی۔

تھوڑی ہی دیر بعد دروازے کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی پھر دستک پر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے میں ہوں اور کون ہوگا۔ باقی سب کی تو شان گھٹتی ہے ناں یہاں آتے ہوئے۔'' بڑی اماں کی آواز آئی۔

میں نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

''اُف خدایا' کتنی گھٹن ہو رہی ہے کیوں دروازے کھڑکیاں بند رکھتی ہو۔ اب تو موسم بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ کھولو یہ کھڑکی بھی۔ غضب خدا کا تمہارا دم نہیں گھٹ جاتا۔ اس ڈربے میں۔ اس سے تو قبر بھی زیادہ کھلی ہوگی۔'' وہ میرے بستر پر بیٹھ گئیں۔

میں نے کھڑکی بھی کھول دی اور بستر پر ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

''کیا ہو گیا تجھے کمرا بند رکھے گی تو طبیعت ہی خراب نہیں ہوگی۔ گھٹن سے بھی مر جائے گی کسی دن۔''

''بڑی اماں میرے سر میں بہت زیادہ درد ہے بخار بھی تھا رات سے۔ ابھی اترا ہے۔''

میری آواز بھرا گئی۔

''دوا لی کوئی؟''

''نہیں۔''

''ان کم بختوں کو اپنے سوا کسی کا خیال نہیں ہے۔ کسی کو احساس نہیں کہ ننھی سی جان بیمار پڑی ہے تو اسے دوا کا ہی پوچھ لیں۔ میں ہی کروں مروں تو کام ہوتا ہے اس گھر میں۔ پروین بھی پتا نہیں کہاں دفعان ہوگئی جو اس سے گولیاں منگوالوں۔''

''بس بڑی اماں! آپ کی گود میں سر رکھ لیا ہے ناں۔ اب سکون ہے۔ آپ میرے پاس ہی رہیں میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''جیتی رہ۔'' انہوں نے میرا ماتھا چوما اور اپنے بوڑھے' جھریوں بھرے ہاتھ سے بہت ہولے ہولے میرا سر دبانے لگیں۔

''کاش بڑی اماں ہمارے درمیان کوئی ایسا رشتہ ہوتا کہ میں آپ کی محبت بھری آغوش میں سر رکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی۔''

وہ میری سوچ سے بے خبر کہہ رہی تھیں۔ ''اب اس دنیا میں اتنا کچھ دیکھ لیا ہے کہ مزید کچھ دیکھنے کی تمنا نہیں رہی۔ میرے ساتھ کے رشتے دار سکھی سہیلیاں سب کب کے مر کھپ گئے ہیں۔ ایک میں ہی زندگی سے چمٹی ہوئی ہوں۔ مگر کب تک؟ آخر تو جانا ہی ہے۔ سب بچے بیاہ دیئے۔ پورا باغ کھلا ہوا دیکھ لیا۔ اب بس ایک فکر جان کو لگی ہوئی ہے کہ میرے بعد تیرا کیا ہوگا۔ کوئی خیال بھی رکھے گا یا نہیں۔ سو جھنجھٹ ہوتے ہیں لڑکی ذات کے۔ مجھے تو تیری شادی کی فکر کھائے جاتی ہے۔ میں نہیں رہوں گی تو بوجھ کی طرح اتار پھینکیں گے۔ احسان الگ جتائیں گے۔ کیا ہو جو تجھے بھی اپنی بیٹی سمجھ لیں۔ مگر اتنا حوصلہ کس میں ہے۔ میں کہتی ہوں تو پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن جا۔ صورت سیرت تو ایسی ہے کہ جس گھر میں جائے اجالا کر دے' تعلیم بھی اچھی ہوگی تو ضرور اچھا رشتہ مل جائے گا۔ پھر دیکھنا سب کی زبانیں کیسے بند ہوں گی۔ بس محنت کرتی جا' دیکھنا اللہ تعالیٰ کتنا میٹھا پھل دے گا۔''

بڑی اماں باتیں کر رہی تھیں اور میرے ذہن میں سہیل کا سراپا گھوم رہا تھا۔ وہ جو ایک لمحے میں دل میں اتر آیا تھا۔ ان کی باتیں سن کر امید ہو چلی تھی۔

''یقیناً بڑی اماں میرا اور سہیل کا ساتھ دیں گی جب انہیں خبر ہوگی تو۔ پیدا ہوتے ہی تو میں ان کی گود میں آ گئی تھی۔ انہوں نے ہی میری پرورش کی۔ میری ایک ایک عادت کو جانتی ہیں وہ۔ مجھ سے محبت بھی کرتی ہیں۔ انہیں میرے اپنے خاندان میں شامل ہونے پر کوئی

اعتراض نہیں ہوگا۔'' میں نے سوچا۔ میرے دل میں پھول کھل رہے تھے۔ بہار باہر ہی نہیں میرے اندر بھی ڈیرا جمائے ہوئے تھی۔

مگر اس لمحے میں چونک گئی۔ بڑی اماں کی باتوں اور اپنی سوچوں میں گم مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب ارسلان بھائی وہاں آئے۔

''آپ یہاں ہیں دادی اماں۔'' انہوں نے کہا۔

اور میں نے بڑی اماں کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میرا سر ان کی گود میں تھا اس لیے میں ارسلان بھائی کو دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ اب مزید بڑی اماں کی گود میں گھس گئی۔ دل ایسی تیزی سے دھڑکنا شروع ہوا گویا ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

''خیر ہے بیٹا؟'' ان کا لہجہ نرم تھا۔ ''آسیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں یہاں آ بیٹھی کہ اکیلے کمرے میں بیچاری کا دل گھبرائے گا۔''

''مجھے کچھ کام تھا آسیہ سے۔ پروین تو ایک نمبر کی نکمی ہے۔ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے تو میں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔'' وہ بولے۔

''نہیں' نہیں۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا۔'' میں ایک دم اٹھ بیٹھی۔ کہنا تو مجھ کو یہ تھا کہ میں ارسلان بھائی کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا چاہتی مگر یہ کہنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

وہ بغور میرا جائزہ لے رہے تھے۔ میرے چہرے پر بکھرے خوف کو دیکھ کر مسکرائے۔

''مجھے تو تم بالکل ٹھیک لگ رہی ہو۔''

بڑی اماں بھڑک اٹھیں۔ ''تمہیں تو ٹھیک لگے گی ناں کیونکہ تمہارے کام رکے ہوئے ہیں۔ دیکھا ہے کیسا ہلدی سا ہو رہا ہے اس کا چہرہ۔ کچھ خوفِ خدا بھی ہے تم لوگوں کو۔ اپنے آرام کے لیے دوسروں کو کولہو کا بیل بنا لو۔ یہ غریب جتنا چپ چاپ کام کرتی جاتی ہے اتنا ہی تم لوگ بے حس ہوتے جاتے ہو۔ نوکر نہیں ہے یہ تمہاری۔ ویسے بھی تمہارے کام کرنا تمہاری بیوی کی ذمے داری ہے۔ میں تمہاری جگہ ہوں تو کان سے پکڑ کر اسے اٹھاؤں۔ اب بھی منہ سجا کر بیٹھی ہوئی ہے۔ ناشکری عورت ہے۔ ایسی فرشتہ صفت ساس ملی ہے۔ اس کا وجود بھی گوارا نہیں۔ میں تو کہتی ہوں یہ عورت ماں بیٹے کے بیچ دوری کرا کے ہی دم لے گی۔''

ارسلان بھائی کچھ کہے بغیر پلٹ گئے۔ میں نے دوبارہ بڑی اماں کی گود میں سر رکھ دیا۔

"یہ خوف کبھی میری زندگی سے ختم بھی ہوگا یا نہیں؟ یا اللہ! میں ایسے کہنے کی عادی تو نہیں۔ کیونکہ یہ خودغرضی کی انتہا ہے لیکن میں بھی کیا کروں۔ میرا اور کون ساٹھکانا ہے۔ اللہ میاں جی بس ارسلان بھائی کہیں اور چلے جائیں رہنے کے لیے۔ یہاں نہ رہیں اس شہر میں بھی نہ رہیں۔"

رات کا کھانا زبردستی کھلا کر اور پھر دو ڈسپرین دے کر بڑی اماں نماز پڑھنے چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی میں پھر سے خوفزدہ ہوگئی۔ ہر طرف سے کنڈیاں لگا کر بیٹھ گئی۔ اسی طرح نہ جانے کس وقت سوگئی۔

پتا نہیں کیا وجہ تھی لیکن بالکل اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میرے کمرے کی بتی شام سے اب تک روشن تھی اور میں بستر پر بیٹھی اتنی گہری نیند سے اٹھ بیٹھنے کی وجہ سوچ رہی تھی۔

"کیا ہوا تھا؟ کیا کسی نے کھڑکی بجائی ہے یا پھر گھٹن اور گرمی کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی ہے؟"

مگر میں کچھ سمجھ نہ پائی۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھی گھڑی اٹھا کر وقت دیکھا۔ سوا ایک بج رہا تھا۔ میں نے پھر سونے کی کوشش کی لیکن ایک مرتبہ نیند ٹوٹ جانے کے بعد کمرے میں گھٹن کا احساس اور بڑھ گیا تھا۔ کچھ دیر تک یونہی کروٹیں بدلتی رہی پھر اٹھ بیٹھی۔ گھٹن ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں نیند لیے سوچے سمجھے بغیر میں اٹھی اور کھڑکی کے پٹ کنڈی کی قید سے آزاد کردیئے بستر کی طرف واپس مڑتے مڑتے میں چونکی اور کھڑکی کی طرف پلٹی۔ وہاں کل رات والی جگہ پر دریا کی طرف رخ کیے سہیل بیٹھا ہوا تھا۔ نظر تو وہ پہلے بھی آیا تھا لیکن میرا ذہن غنودگی کی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ اس لیے توجہ نہ دے سکی۔ پلٹتے پلٹتے اس بات کا احساس ہوا۔ کھڑکی کا پٹ پکڑ کر میں نے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا وہ اب بھی ویسے ہی سوچ رہا ہے یا اسے میری بات کا یقین آ گیا ہے؟ اس کے پاس جاؤں یا واپس پلٹ جاؤں؟ وہی میری آخری امید اور آخری سہارا ہے اور وہی میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ کیا اسے اسی طرح چلا جانے دوں۔ دل میں میل لیے۔"

عجیب کشمکش تھی۔ اب سے پہلے کب ایسی پریشانیوں سے واسطہ پڑا تھا۔ میرا

ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے محروم لگ رہا تھا۔ کوئی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

مجھے خود بھی احساس نہ ہوا کہ یہ میرا وجدان تھا یا کوئی دلیل جس نے مجھے فیصلے تک پہنچایا اور میں کھڑکی کے راستے نکل کر اس کے برابر جا بیٹھی۔ اس نے چونک کر میری سمت دیکھا۔

"آسیہ!"

میں منہ سے کچھ نہ بول سکی۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور میں سسکیوں سے رونے لگی۔

"روؤ مت آسیہ پلیز۔ مجھے لگتا ہے کہ تم گھٹن کا شکار ہو۔ بہت کچھ ہے تمہارے اندر کہنے کے لیے اور تم کہہ نہیں پا رہیں۔ سب کچھ بتا دو مجھے کہہ دو۔"

مجھے لگا جیسے میرے دل پر لگے زخم پھر سے رسنے لگے ہوں رونے کی شدت میں اور اضافہ ہوگیا۔

"کل رات میں نے فیصلہ کیا تھا کہ صبح لاہور واپس چلا جاؤں گا۔ اپنا بیگ بھی تیار کرلیا تھا۔ چلتے چلتے والٹ کھول کر دیکھا تو اس میں تمہارا لکھا ہوا رقعہ تھا۔ میں ٹھہر گیا تاکہ تم سے بات کروں۔"

میں کچھ نہ بول پائی۔ دل میں جیسے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

"جانتی ہو کل رات میں نے کیسے گزاری؟ یہ تصور کہ تم ارسلان بھائی کا انتظار کر رہی تھیں میرے لیے اتنا تکلیف دہ تھا کہ تم جان نہیں سکتیں۔ اب بھی کچھ نہیں بولوگی تو میں کل صبح واپس چلا جاؤں گا۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ ہچکیوں سے میرا پورا وجود لرز رہا تھا۔

"تم کچھ نہیں بولوگی تو میں اسی کو درست سمجھوں گا جو کل ہوا اور جیسا میں نے سمجھا۔"

"نہیں پلیز نہیں۔" میں نے بے اختیاری کے عالم میں کہا۔ "جو آپ نے سمجھا وہ ٹھیک نہیں تھا۔"

"تو پھر کیا ٹھیک تھا؟"

"میرے پاس الفاظ نہیں ہیں وہ سب کہہ دینے کے لیے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ

میں کیا کروں۔'' بے بسی کی انتہا تھی۔

وہ خاموش رہا۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی جگہ کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہے۔'' بالآخر میں نے آنسوؤں کے درمیان کہنا شروع کیا مجھے خود بھی خبر نہیں تھی کہ میں کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ بس یہ علم تھا کہ اب جب میں نے کہنا شروع کیا ہے تو میں سب کچھ کہہ دوں گی۔

سہیل خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ اسے بتاتے ہوئے میں ہچکیوں کے ساتھ روتی جا رہی تھی۔ جب بول چکی تو اس نے مجھے خود سے قریب کرلیا۔

''تم اس طرح ان حالات میں رہ رہی ہو؟'' اس کی آواز میں غصہ بھی تھا اور رنج بھی۔'' اور ارسلان بھائی ایسی گھٹیا اور نیچ حرکت کر رہے ہیں۔ اوہ گاڈ مگر تم بالکل فکر مت کرو۔ میں اس سلسلے میں ضرور کچھ نہ کچھ کروں گا۔ میں تو بالکل غلط سمجھا تھا کل۔ مجھے تو یہ بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ تم کس قدر خوفزدہ تھیں۔ بس ایک خیال میرے دل میں گھر کر گیا تھا کہ اتنی رات گئے تم انہی کی منتظر تھیں تب ہی تو میری جانب دیکھے بغیر تم نے ان کا نام پکارا تھا۔''

میں اس کے کندھے سے لگی روتی رہی۔ اس وقت مجھے ایسے ہی کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں بہت تھک گئی ہوں مگر اب محفوظ تھی۔ ارسلان بھائی یا کوئی اور میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ کیونکہ اب میں سہیل کے ساتھ تھی۔ اس کے بازوؤں کے مضبوط حلقے میں تھی۔

کتنی دیر گزر گئی ہمیں ایسے بیٹھے ہوئے دریا کے پُرسکون پانی کی سطح پر پھیلی چاندنی اور آسمان پر روشن ستارے سب حیرت سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

پھر اچانک اس نے کہا۔ ''چلو آسیہ جا کر سو جاؤ۔ رات بہت بیت گئی ہے۔ بلکہ اب تو صبح ہونے والی ہے۔ اور صبح اسکول جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ تمہیں بخار بھی ہو رہا ہے۔ اب جا کر آرام کرو۔'' ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اب میں کیا کروں سہیل۔'' میں نے ہولے سے پوچھا۔

'' کچھ بھی نہیں بس اپنے ذہن سے پریشانیاں جھٹک دو۔ میں ہوں نہ تمہارے ساتھ پھر تمہیں فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ذرا دو ایک دن تک ارسلان بھائی پر نظر رکھنا

چاہتا ہوں پھر لاہور جانے کے ساتھ ہی ممی سے بات کروں گا۔ انہوں نے پہلے ہی کہہ رکھا ہے کہ میں اپنی پسند سے شادی کرسکتا ہوں۔ تھوڑا بہت انہوں نے ٹالنا چاہا تو بھی منوالوں گا۔ اکلوتا بیٹا ہوں اور آج تک اپنی ہر بات منواتا آیا ہوں۔ یہاں جب دادی اماں کو انکار نہیں ہوگا تو کسی کو بھی انکار نہیں ہوگا اس لیے اس طرف سے بھی مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

مجھے لگا جیسے میرے ذہن کا سب بوجھ اتر گیا ہو۔ مجھے شادی وغیرہ کی کوئی جلدی نہیں تھی بلکہ جیسے سہیل میری زندگی کا خواب تھا اسی طرح ڈاکٹر بننا بھی میری زندگی کا خواب تھا۔ میں بہت زیادہ پڑھنا چاہتی تھی لیکن حالات مجھے پلٹتے ہوئے لگ رہے تھے۔ کسی بھی خواہش اور خواب کی تکمیل سے قبل میرا محفوظ ہو جانا ضروری تھا ورنہ نہ کوئی خواہش رہتی' نہ کوئی خواب۔

اس نے اپنے گلے میں پڑی سونے کی بھاری زنجیر اتاری اور اس سے قبل کہ میں کچھ سمجھ سکتی۔ میرے گلے میں ڈال دی۔

''یہ میرے وعدے کی نشانی اور میری محبت کی گواہی ہے۔ مجھ پر اعتبار کرنا۔''

اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر میں خوابوں کی نئی وادیوں کے سفر پر نکل پڑی۔ کتنا کچھ تھا میرے پاس سوچنے کے لیے۔ اور جسم کا بند بند جیسے محبت کے خمار میں گندھ گیا تھا۔

یہ احساس کتنا نیا اور انوکھا تھا۔ اور پھر سونے کی وہ زنجیر جس کی کڑیوں نے ہمیں ایک دوسرے سے باندھ دیا تھا۔ میں اسے انگلیوں کی پوروں سے اٹھا کر اپنے ہونٹوں تک لے آئی۔ اس زنجیر میں اب تک سہیل کے جسم کا لمس تازہ تھا۔

صبح میری آنکھ بہت دیر سے کھلی مگر میں ہشاش بشاش تھی۔ اسکول جانے کا وقت نکل چکا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑکی کی طرف گئی۔ دریا اور اس کی لہریں سورج کی کرنوں میں نہائی ہوئی تھیں۔ میرے ذہن میں بیتی رات اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ روشن ہوگئی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہاتھ خود بخود گلے میں پہنی زنجیر کی طرف اُٹھ گئے۔ کتنا دلفریب احساس تھا۔ کیسی خوشگوار صبح تھی۔ یہ سب کچھ نیا اور انوکھا تھا۔

پہلا مسئلہ سونے کی اتنی بھاری زنجیر چھپانے کا تھا۔ میرے کمرے میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جو اس کام کے لیے مناسب ہوتی۔ ظاہر ہے میں یہ کسی کو دکھا نہیں سکتی تھی۔ نہ اس

بارے میں کسی کے سوال کا جواب دے سکتی تھی۔ بہت سوچنے کے بعد اپنی کاپی سے صفحے لے کر ان کا ایک لفافہ سا بنایا اور زنجیر اس میں ڈال کر بستر پر بچھے گدیلے اور دری کے درمیان رکھ دی۔ اپنا کمرا میں ہی صاف کیا کرتی تھی۔ اس لیے اس بات کا خطرہ کم تھا کہ کسی کو اس کی خبر ہوگی۔

دوپہر تک میں گھر میں اطمینان سے پھرتی رہی۔ ارسلان بھائی آفس گئے ہوئے تھے اس لیے مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ یوں بھی سہیل مستقل میرے قریب ہی تھا مگر ایسے کہ جیسے یہ نارمل بات ہو جیسے اس طرح روز ہی ہوا کرتا ہو۔ ارسلان بھائی واپس آئے تو انہیں دیکھتے ہی خوف نے مجھے پھر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ انہوں نے میری طرف بھرپور نظر ڈالی۔ میں جلدی سے کنی کترا کر وہاں سے ہٹ آئی۔

''ریلیکس آسیہ۔ یہ اُلو کا پٹھا کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر تم خوفزدہ ہونا چھوڑ دو تو۔'' سہیل نے مجھ سے کہا۔

پتا نہیں اس کے الفاظ اور انداز میں کیسا جادو تھا کہ میں پُرسکون ہوگئی۔ شام کو کام نمٹا کر میں حسبِ معمول سیڑھی پر پڑھنے بیٹھی ہوئی تھی۔ سہیل نہا رہا تھا اور مجھے پُرسکون رہنے کی تاکید کر کے گیا تھا۔ ورنہ میں کبھی وہاں بیٹھ کر نہ پڑھتی۔ میں کام کر رہی تھی کہ ماسی آگئی۔

''چھوٹے صاحب کہہ رہے ہیں کہ عرفان کا منہ ہاتھ دھلا کر تیار کروا دو۔ انہیں عرفان کی نانی کے گھر جانا ہے۔''

''میں پڑھ رہی ہوں۔ بھابی کیوں نہیں تیار کروا دیتیں۔'' اپنی عادت کے برعکس انکار کر کے میں نے راہِ فرار تلاش کرنے کی کوشش کی۔

''ارے وہ کہاں ہاتھ پاؤں ہلاتی ہیں۔ اُٹھ جاؤ تم ہی کو کرنا ہوگا۔ آ کر پڑھ لینا۔'' ماسی نے آہستہ سے کہا۔

مجھے بادلِ نخواستہ اُٹھنا پڑا۔ عرفان کے کمرے میں جا کر اسے تیار کروانا خود کو مصیبت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ میں اس کے کپڑے وغیرہ اُٹھا کر اور اس کا ہاتھ پکڑ کر جلدی سے بڑی اماں کے کمرے میں آگئی۔ وہ وہیں تھیں۔

''بڑی اماں! میں عرفان کو یہاں تیار کروا دوں۔ اس کا باتھ روم گندا ہو رہا ہے۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''اللہ جانے اس لڑکے کی عادتیں کب سدھریں گی۔ پورا اپنی ماں پر جا رہا ہے۔'' بڑی اماں باتھ روم کی گندگی کا سن کر بڑبڑائیں۔

''میرا باتھ روم گندا نہیں ہے۔ جا کر دیکھ لیں بے شک۔'' عرفان چلایا۔

''چلو اندر۔'' میں نے اسے باتھ روم میں دھکا دیا۔

''تمہاری ماں کو بھی پاس پڑی گندگی دکھائی نہیں دیتی۔ تمہیں کیا نظر آنے گی۔ کچھ نہ سیکھا اس گھر سے تم دونوں نے۔'' بڑی اماں بڑبڑا رہی تھیں۔

میں اسے تیار کر رہی تھی ارسلان بھائی چلے آئے۔

''ایک گھنٹہ لگ جاتا ہے تمہیں چھوٹا سا کام کرتے ہوئے۔ کب سے میں انتظار کر رہا ہوں عرفان کا۔''

خاموش رہنے میں ہی عافیت تھی سو میں سر جھکائے اسے جوتے پہناتی رہی۔

''کیا آتے ہی دہاڑنا شروع کر دیتے ہو۔ انسان ہے مشین نہیں ہے یہ۔ ایک تو پڑھنے سے اُٹھا دیتے ہو اسے اوپر سے چلاتے بھی ہو۔'' بڑی اماں بولیں۔

''دادی اماں آپ نہ فضول میں ہر بات پر اس کا ساتھ دیا کریں۔ اسی لیے زیادہ سر چڑھ گئی ہے۔''

''سر چڑھنے والے ایسے نہیں ہوتے کہ اتنے بڑے بچے کو جوتے بھی پہنائیں اور اس کے بال بھی سنواریں۔ ڈانٹتی میں بھی ہوں آسیہ کو مگر کوئی بات تو ہو ڈانٹنے والی۔ جو آتا ہے غریب کے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔'' بڑی اماں کب پسپا ہوتی تھیں۔

اتنے میں عرفان تیار ہوگیا اور میں پڑھنے چلی گئی۔ سہیل بھی نہا کر وہیں آ بیٹھا تھا۔ اس کے بال ابھی تک گیلے تھے۔ مجھے اسے دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔

''یہ تم سیڑھی پر بیٹھ کر کیوں پڑھتی ہو۔ آج بتا ہی دو۔'' وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''بس عادت ہے۔''

''عادت ہے یا کچھ اور بات ہے۔ دادی اماں آپ اس سے پوچھیں کہ یہ میز کرسی پر بیٹھ کر کام کیوں نہیں کرتی۔'' اس نے برآمدے سے آتی بڑی اماں سے کہا۔

''میں نے تو میز بھی بنوا کر دی اور کرسی بھی خریدی کہ آرام سے پڑھ سکے۔ اسی سے پوچھو کہ کیا مرض ہے کہ اس پر بیٹھ کر نہیں پڑھتی۔'' وہ باہر بچھے تخت پر بیٹھ گئیں۔

"بولو بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟ اتنی سی بات ہے کہ یہاں بیٹھ کر پڑھ بھی لیتی ہوں اور کوئی کسی کام کے لیے آواز دیتا ہے تو وقت بھی نہیں ہوتی۔ اپنے کمرے میں مجھے بس صحن کی آوازیں آتی ہیں۔ اندر کمروں سے کوئی پکارے تو پتا نہیں چلتا۔ بس اس لیے۔"

ہم باتیں کر رہے تھے اور میرے کان پیچھے کمرے میں چیختے ارسلان بھائی کی آواز پر لگے ہوئے تھے جو اپنی گھڑی اور اس کے ساتھ رکھے ایک ہزار روپے کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ ابھی ان کی تلاش کے لیے بھی میری ہی خدمات حاصل کی جائیں گی۔

"دیر ہو رہی ہے اور یہ گھڑی نہیں مل رہی۔" وہ خود تو غصے اور بیزاری کا شکار تھے ہی' گھر والوں کو بھی دوڑا رہے تھے۔

"دادی اماں! یہ اتنے کام کیوں کرتی ہے۔ ماسی کہاں ہوتی ہے۔" دوسری طرف سہیل کہہ رہا تھا۔

"بیٹا گھر کے کام سب مل جل کر ہی کرتے ہیں اور اچھی بیٹیاں تو گھر کے لیے جان مار دیتی ہیں۔" بڑی اماں بولیں۔

"لیکن جان مارنے کے لیے کچھ جان تو ہو۔ دیکھی ہے آپ نے اس کی حالت' پھونک مار دو تو اُڑ جائے۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔ میں بہت اسمارٹ ہوں۔ انسان کو موٹا تو بہر حال نہیں ہونا چاہیے۔" میں بولی۔

اسی وقت ارسلان بھائی بھی برآمدے میں آ گئے۔

"آسیہ تم نے دیکھی ہے میری گھڑی۔ ساتھ میں ہزار روپے بھی رکھے ہوئے تھے۔"

"نہیں۔" میں نے نظریں اُٹھائے بغیر جواب دیا۔

"کمال ہے کوئی جن آ کر لے گیا۔ تم جب کمرے میں آئی تھیں۔ اس سے...... تھوڑی دیر پہلے ہی تو میں نے اپنے ہاتھ سے میز پر دونوں چیزیں رکھی تھیں۔"

"مگر میں تو آپ کے کمرے میں گئی بھی نہیں۔" میں نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔

"کمال کرتی ہو تم۔ ابھی عرفان کو لینے نہیں آئی تھیں۔ وہاں نہیں ملا تو اس کے کمرے

میں گئی تھیں۔"

"نہیں تو۔ قسم سے میں تو۔ قسم سے میں تو آپ کے کمرے میں نہیں گئی۔"

"تو کیا میں اندھا ہو گیا ہوں یا پاگل کہ تم تو آئیں نہیں اور مجھے کمرے میں دکھائی دے گئیں۔" ان کا پارہ چڑھ رہا تھا۔

"ارے بیٹا! کہاں جائے گی گھڑی' وہیں ہو گی ورنہ پھر میز سے نیچے گر گئی ہو گی۔ ذرا غور سے دیکھو ناں۔" بڑی اماں نے مداخلت کی۔

"آپ کے خیال میں' میں گدھا ہوں جسے اتنی عقل نہیں ہے کہ چیز کہاں تلاش کی جائے۔"

گھر کے سبھی افراد یہاں تک کہ ماسی اور بشیر بھائی بھی برآمدے میں آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میں مارے شرمندگی کے پانی پانی ہو رہی تھی۔

"قسم سے ارسلان بھائی! میں نے آپ کے کمرے میں جھانکا بھی نہیں ہے۔" میری آواز بھرا گئی۔

"بس کریں ارسلان بھائی! وہ جب کہہ رہی ہے کہ آپ کے کمرے میں نہیں گئی تو اس کا مطلب ہے کہ یہ وہاں نہیں گئی۔ آپ جھوٹ نہیں بول رہے تو اسے بھی جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ خوامخواہ چھوٹی سی بات کا تماشا بنا دیا ہے۔" سہیل کے لہجے میں تیزی تھی۔

"تم چپ رہو' تم کون ہوتے ہو درمیان میں بولنے والے۔" وہ اسی پر الٹ پڑے۔

"ارے! یہ تم دونوں بھائی کیوں لڑنے لگے۔" دادی اماں جلدی سے اُٹھ کر ان کے بیچ میں چلی آئیں۔

"پتا ہے کتنی قیمتی گھڑی تھی۔ کوئی مذاق ہے یہ۔ ڈیڑھ لاکھ کی چیز گم ہو گئی۔ یہاں کسی کو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔" رفعت بھابی بھی میدان میں کود یں۔

"میں نے تو یہاں تک دیکھا تھا کہ کمرے سے نکلتے ہوئے تمہارے ہاتھ میں کوئی چیز بھی تھی۔" ارسلان بھائی بات کو پھر وہیں لے آئے۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تو وہاں گئی بھی نہیں صبح سے۔ میں نے کچھ نہیں اُٹھایا وہاں سے۔" میں بری طرح سے رو پڑی۔ ٹانگیں کانپنے لگیں۔

بات کہیں ختم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی گئی۔ سب ہی حسبِ توفیق بول رہے

تھے۔ میرے پاس اپنی بے گناہی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ پڑھتے ہوئے جب میں اُٹھی تھی تو ارسلان بھائی کے بیڈ روم میں جانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ میں تو عرفان کے کمرے میں بھی بس اتنی سی دیر رہی تھی۔ جتنے میں اس کے کپڑے صابن اور پاؤڈر لے سکتی۔ برآمدے کے ستون سے ٹکی میں اپنے اردگرد ہونے والا شورشرابا اور سوال و جواب سن رہی تھی۔

بالآخر غصہ در غصہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میرے کمرے اور بیگ کی تلاشی کی بات ہونے لگی۔ سہیل یہ بات سنتے ہی درمیان میں آ گیا۔ ''کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا اس کے بیگ کو۔ نہ کمرے کی تلاشی لی جائے گی۔ یہ کیا طریقہ ہے؟ سارا گھر آسیہ کے سامنے کھلا ہوتا ہے۔ کیا کبھی پہلے اس نے ایک چاول کا دانہ یا جھاڑو کا تنکا بھی اُٹھایا ہے؟ یہ جو آپ کرنے جا رہے ہیں' انتہائی غلط بات ہے۔ اور ارسلان بھائی! آپ کی گھڑی یہاں سے نہ ملی تو اور کس کس کی تلاشی لیں گے گھر میں؟ کیا دادی اماں' آنٹی اور انکل کی بھی؟ نہیں' اس لیے کہ وہ آپ کے اپنے ہیں اور آسیہ کی پکڑ اس کے بے داغ کردار کے باوجود بھی اس لیے ہو رہی ہے کیونکہ وہ یہاں کسی کی کچھ نہیں لگتی۔''

''اگر اس نے کچھ نہیں کیا تو ڈر کس بات کا ہے؟ میں کس کی تلاشی لیتا ہوں اور کس کی نہیں' یہ میری مرضی ہے۔ ایک ہزار روپے پر میں لعنت بھیجتا ہوں لیکن ڈیڑھ لاکھ کی گھڑی ایسی چیز نہیں ہے۔ جس پر میں خاموش ہو سکوں۔''

''آپ لے لیں تلاشی۔ مجھے کسی بات کا خوف نہیں ہے۔ میں آپ کے بیڈ روم میں صبح سے نہیں گئی۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''دادی اماں! آپ جانتی ہیں آسیہ کو' کیا یہ ایسی حرکت کر سکتی ہے؟ آپ سب جانتے ہیں اسے' آپ لوگوں نے ہی اپنے ہاتھوں میں اسے پالا ہے۔ کیا ایسے میں یہ بے اعتباری مناسب ہے؟ عین ممکن ہے کہ کسی نے شرارت میں یا کسی اور گھٹیا مقصد کو پورا کرنے کے لیے خود یہ چیزیں اس کے بیگ میں ڈال دی ہوں۔ یا کمرے میں چھپا دی ہوں۔ بات کو اس حد تک نہ بڑھائیں آپ لوگ۔'' سہیل کا مزاج سخت بگڑ گیا تھا۔

ارسلان بھائی نے اس انداز میں اس کی جانب دیکھا گویا کچا ہی چبا جائیں گے اور بغیر کچھ کہے میرا اسکول کا بیگ اُٹھا کر پلک جھپکتے میں الٹا دیا۔ کتابوں کاپیوں' پین'

پنسلوں' کاغذ کے ٹکڑوں اور میرے چند ہیئر بینڈز کے ساتھ ارسلان بھائی کی گھڑی اور سو سو روپے کے چند نوٹ بھی زمین پر گر پڑے۔

میں آنکھیں پھاڑے ان چیزوں کی طرف دیکھے گئی۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ یہ چیزیں کس وقت اور کیسے میرے بیگ میں آئی تھیں۔ اپنا سر مجھے چکراتا ہوا لگ رہا تھا۔ اردگرد سبھی لوگ کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ مگر مجھے ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ ہوش مجھے تب آیا جب بڑی اماں نے مجھے جھنجھوڑا۔

''بڑی اماں! میں نے کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہیں چرایا۔ مجھے میری ماں کی قسم۔'' میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

وہ اور چھوٹی امی مجھے بڑی اماں کے کمرے میں ہی لے آئیں اور صوفے پہ بٹھا دیا۔ چھوٹی امی نے مجھے اپنے سے لپٹا رکھا تھا۔

''تم روتی کیوں ہو جیسے ہمیں نہیں پتا کہ ایسا کوئی کام تم کبھی نہیں کر سکتیں۔ کیا خبر عرفان نے شرارت کر لی ہو۔ وہ تو نچلا بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ اور پھر ارسلان بھی غصے والا ہے اور اس کی بیوی سے تو اللہ بچائے۔ وہ تو جلتی پر تیل ڈالتی ہے۔ تم چپ ہو جاؤ۔ رونے کی بھلا کیا بات ہے اس میں۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔

''ہاں کوئی چیز...... تمہارے بستے سے ملنے کا یہ مطلب تو نہ ہوا کہ تم چور ہو گئیں۔ اللہ نیک ہدایت دے اسے جس نے بھی یہ شرارت کی ہے۔ نہ رو میری جان۔ سبھی کو تو پتا ہے کہ میری گڑیا رانی کبھی ایسی حرکت نہیں کر سکتی۔ ارے میرے سامنے تو عرفان کو لے کر گئی تھی نہلانے کے لیے۔ پھر ہم اکٹھے ہی برآمدے سے نکل آئے۔ بچی بیٹھی کام کر رہی تھی کہ اچانک یہ افتاد ٹوٹ پڑی۔ یہ تو اپنا بستہ چھوڑ کر ہزار کام نمٹانے اُٹھتی ہے۔ کوئی بھی نظر بچا کر کچھ بھی رکھ سکتا ہے اس میں۔'' بڑی اماں کہنے لگیں۔

بہت دیر تک بڑی اماں اور چھوٹی امی مجھے دلاسا دیتی رہیں پھر ابا جی اور سہیل بھی آ گئے مگر میرے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔ میں قصوروار نہیں تھی لیکن چوری کی چیزیں میرے پاس سے ہی ملی تھیں اور یہ شرمندگی ایسی تھی جو مجھے مارے ڈال رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ تھوڑی دیر پہلے کا منظر میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا وہ سب باتیں یاد آ رہی تھیں۔

ظاہر ہے' یہ تو میں سمجھ سکتی تھی کہ اس تمام تر صورتِ حال میں کس کا ہاتھ تھا۔ اور میرے ساتھ کیوں ہوا تھا۔ جانتی تو میں تھی ہی لیکن اس وقت مجھے ارسلان بھائی سے سخت نفرت محسوس ہوئی جب میں کچن میں برتن دھو رہی تھی اور وہ میرے قریب آ کھڑے ہوئے۔ پلیٹ میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ شکر ہے وہاں میں تنہا نہیں تھی۔ ماسی سر جھکائے چاول چن رہی تھی اور بشیر بھائی ایک کونے میں بیٹھا جوتے پالش کر رہا تھا۔

''یہ صرف چھوٹا سا نمونہ تھا۔''

انہوں نے کہا اور میرے قریب سے گزرتے چلے گئے۔ میرے ہاتھ پاؤں ایک دم ٹھنڈے ہو گئے۔

''کیا کہہ رہے تھے صاحب؟'' پروین نے ان کے جانے کے بعد سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں ڈانٹ رہے تھے۔'' میں بمشکل کہہ سکی۔

''عادت ہے۔'' بشیر نے تبصرہ کیا۔

برتن وہیں چھوڑ کر میں بڑی اماں کے کمرے میں آ گئی۔

رات کو اپنے کمرے کی تنہائی میں میں اتنی خوفزدہ تھی کہ اس سے قبل میں نے کبھی اتنا خوف محسوس نہیں کیا تھا۔

''اب آئندہ کیا ہوگا؟'' یہ سوال مجھے کسی پل چین نہیں لینے دے رہا تھا۔

میں آنسوؤں اور سوچوں میں گم تھی کہ کھڑکی پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ ہاتھ پاؤں سے جان نکل گئی۔ کمرے میں آج بھی بہت گھٹن تھی مگر میں اس طرح مرنے کے لیے بھی تیار تھی بجائے بے عزتی سے زندہ رہنے کے۔

دستک پھر ہوئی۔ میں نے سسکیاں تو کیا اپنی سانس تک روک لی۔ خوف اور دہشت کی وجہ سے میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہ پا رہی تھی۔

''یہ صرف چھوٹا سا نمونہ تھا۔''

ارسلان بھائی کی آواز اب بھی میری سماعت میں گونج رہی تھی۔

''تو کیا اب وہ کوئی اور مقصد پورا کرنے آئے ہیں؟ میں کیا کروں' کیسے اس درندگی

سے خود کو بچاؤں۔''

تیسری مرتبہ دستک ہوئی تو مجھے لگا جیسے میں پاگل ہو گئی ہوں۔ بغیر سوچے سمجھے کسی کی بھی پروا کیے' میں زور زور سے رونے لگی۔

''آسیہ' میں ہوں سہیل۔'' باہر سے آواز آئی۔ ''پلیز کھڑکی کھولو۔''

یوں لگا جیسے تپتے انگاروں پر چلتے ہوئے بالکل اچانک میرے پاؤں تلے شبنمی گھاس آ گئی ہو وہ ارسلان بھائی نہیں سہیل تھا۔ میرا اپنا سہیل جس سے میں سب کچھ کہہ سکتی تھی۔ جس نے وعدہ کیا تھا مجھے بچانے کا' مجھے یہاں سے دور لے جانے کا۔ اتنی دور جہاں کوئی ڈر' کوئی خوف نہیں پہنچ سکتا۔ جو مجھ سے محبت کرتا تھا اور جس سے میں محبت کرتی تھی۔ جس کی آغوش میں میں سب کچھ بھلا سکتی تھی' جو میری طرف آنے والے سب تیروں کے لیے ڈھال بن سکتا تھا۔ اپنے وجود پر روک سکتا تھا۔ خود زخم زخم ہو سکتا تھا لیکن مجھے خراش بھی نہ آنے دیتا۔

''آسیہ۔'' اس نے پھر پکارا۔

میں دوڑ کر کھڑکی تک گئی اور اس کے پٹ کھول دیے۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا کمرے میں آیا اور میرے بال بکھر گئے۔

وہ اندر آیا تو میں اس سے لپٹ کر بری طرح رو پڑی۔

''سہیل پلیز مجھے بچا لو۔ پلیز۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ وہ مجھے تباہ و برباد کر دیں گے۔ میں تو اتنی بدنصیب ہوں کہ یہاں سے کہیں اور بھی نہیں جا سکتی۔ میرا کوئی نہیں ہے اس دنیا میں۔ تمہیں پتا ہے یہ سب ارسلان بھائی نے کیا تھا کیونکہ میں ان کے کہنے کے باوجود بھی اس رات ان کے پاس نہیں گئی تھی۔ آج انہوں نے مجھے جتلا بھی دیا کہ یہ صرف چھوٹا سا نمونہ تھا۔ میں کب تک بچتی رہوں گی۔ آج نہیں تو کل وہ اپنی خواہش ضرور پوری کریں گے۔ پھر کیا ہوگا؟'' میں پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ رونے لگی۔

وہ مجھے بستر تک لے آیا۔ ''بیٹھ جاؤ۔ رونے سے بھی کبھی کچھ حاصل ہوا ہے۔''

اس نے مجھے خود سے الگ کرنا چاہا مگر میں اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ نفسیاتی طور پر مجھے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ ارسلان بھائی مجھ سے جو کھیل' کھیل رہے تھے اس نے مجھے ذہنی اور نفسیاتی طور پر توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اپنی ذات پر سے میرا اعتماد اُٹھ چکا تھا۔ میں خود کو حد درجہ غیر محفوظ سمجھنے لگی تھی۔ کسی کے ایسے مضبوط بازوؤں کی تلاش میں تھی۔ جن

کے حصار میں آ کر میں دنیا کے تیروں سے بچ سکوں۔ جو مجھے ہر تکلیف سے بچا لے۔ جس پر
میں بھروسا کر سکوں۔ اور اب جب میں ان بازوؤں کی پناہ میں تھی تو خود کو کیسے ان سے الگ
کر سکتی تھی۔

یہی میری غلطی تھی جس کا اس وقت مجھے شعور نہیں تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں اس قربت نے تسلی دلاسے سے ہٹ کر دوسرا رنگ اختیار کر لیا۔ میں
کم عمر تھی۔ میں نے دنیا کے رنگ دیکھے نہیں تھے۔ میں منہ سے نکلے اور صفحے پر لکھے لفظ کو
ایمان سمجھا کرتی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ہر ایک کا اپنا اپنا طریقہ واردات ہوا کرتا ہے۔ کوئی
دھمکی دے کر لوٹ لیتا ہے اور کوئی محبت سے ایسے وار کرتا ہے کہ اپنا سب کچھ خود ہی اس کے
قدموں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ میں دھمکی سے خوفزدہ ہوگئی اور محبت بھری قربت میں سب کچھ
کھو بیٹھی۔

میں نے کبھی بھی سہیل کو اکیلے قصوروار نہیں ٹھہرایا۔ اس نے مجھ سے کوئی زور زبردستی
نہیں کی تھی۔ میں برابر کی قصوروار تھی۔ صرف برابر کی اس سے زیادہ بھی نہیں۔ لیکن نتیجہ تنہا
مجھے بھگتنا پڑا جیسے صرف میں ہی گناہگار تھی۔ اس جرم میں کوئی اور شریک نہیں تھا۔

جاتے ہوئے میرے ٹھنڈے ہاتھ اس نے اپنے مضبوط گرم ہاتھوں میں لیتے ہوئے
کہا۔

"تم فکر مت کرنا آسیہ۔ میں چند دنوں میں ممی اور پاپا کو لے آؤں گا اور اگر وہ نہ آئے
تو بھی میں خود ہی چلا آؤں گا۔ ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنانے کو۔ دیکھو گھبرانا مت۔ میں ضرور
واپس آؤں گا۔"

وہ چلا گیا اور میں پل پل گن کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے جانے سے لگا گویا
سب کچھ مجھ سے چھن گیا ہو۔ اپنے ساتھ وہ میرا آرام سکون میری نیند بھی کچھ لے گیا تھا۔
ٹیلی فون کی ہر گھنٹی مجھے چونکا دیتی تھی۔ ڈور بیل بجتے ہی میں سب کام چھوڑ کر باہر بھاگتی
تھی۔ ڈاکیا نظر آتا تھا تو میں بے تابی کے ساتھ اس سے خط جھپٹ لیتی تھی۔ اور ہر رات
مایوس ہو کر دریا کی گھٹتی بڑھتی لہروں سے اپنے دکھ کہہ دیتی تھی۔

ارسلان بھائی کچھ عرصے کے لیے جاپان چلے گئے تھے اور رفعت بھابی اپنے میکے میں
تھیں۔ میں سارے میں گھومتی پھرتی تھی اور پھر سیڑھی پر بیٹھ جاتی تھی ہر طرف کتنی یادیں

بکھری پڑی تھیں سہیل کی۔ یہاں وہاں اس کے قہقہے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اس کی دلچسپ
باتیں، شرارتیں سب کچھ اسی طرح ادھر ادھر دکھائی دیتا تھا مجھے۔ بس وہ نہیں تھا۔ ہر رات میں
مایوس ہو جاتی تھی اور ہر نئے دن کا آغاز نئی امید سے کرتی تھی۔

اتنے سارے دن بیت گئے تھے۔

"کیا پتا سہیل خیریت سے بھی ہے یا نہیں؟ کہیں بیمار نہ ہو۔ کچھ ہو نہ گیا ہو۔"

طرح طرح کے وسوسے دل میں ہلچل پیدا کر دیتے تھے۔ میں اتنا تو جانتی تھی کہ
خدانخواستہ سہیل کو کچھ ہوتا یا وہ زیادہ بیمار ہی ہوتا تو یہاں بڑی اماں کو ضرور خبر پہنچائی جاتی۔ پھر
بھی میں اس حقیقت سے چشم پوشی کر لیتی تھی۔ دل کو بھی تو کسی صورت تسلی دینی تھی۔

پھر اچانک مجھے ایک عجیب سا احساس ہونے لگا جیسے میرے اندر تبدیلی ہو رہی ہو۔
پہلے تو میں نے توجہ ہی نہ دی۔ میرا ذہن تو کہیں اور بھٹکا ہوا تھا۔ جب توجہ دی تو سمجھ نہ سکی۔
اور جب سمجھ آئی تو خوفزدہ ہوگئی۔

میں نے کسی ڈاکٹر سے چیک اپ نہیں کروایا تھا پھر بھی یہ بات واضح تھی۔ میں ماں
بننے والی تھی۔

ابھی میری جسمانی ساخت سے یہ بات واضح نہیں ہوئی تھی مگر کب تک! جہاں اتنے
دن گزر گئے وہاں یہ دن بیتتے بھی کتنا عرصہ لگتا۔

اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوگئی تھیں۔ گھر میں بھی ارسلان بھائی' رفعت
بھابی اور عرفان کے چلے جانے کی وجہ سے ذرا سکون تھا۔ کاموں کا وہ بکھیڑا نہیں تھا۔ جو عموماً
ہوا کرتا تھا۔ میرے پاس بہت سا وقت تھا۔ سوچنے اور سوچتے رہنے کے لیے۔

میری طبیعت خراب رہنے لگی تھی اور خوف کے عالم میں اپنا بیشتر وقت میں اپنے کمرے
میں گزارتی تھی۔ بڑی اماں یہ سمجھ کر خوش ہوتی تھیں کہ میں پڑھ رہی ہوں۔

"میری آسیہ اب کے بھی بورڈ میں پوزیشن لائے گی۔" وہ ہر ایک سے فخر کے عالم
میں کہتی تھیں۔

اور انہوں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ کوئی بھی آسیہ کو تنگ نہ کرے۔

"پھر جب ارسلان اور اس کے بیوی بچے آ جائیں گے اور گھر کے بکھیڑے بڑھ
جائیں گے تو بیچاری کہاں پڑھ سکے گی۔"

کھانا یوں بھی مجھے کوارٹر میں ہی پہنچا کرتا تھا۔ ماسی صرف سونے اور کھانا کھانے آتی تھی پھر کھانے کی طرف میری بے توجہی دیکھ کر دو ایک دن نصیحتیں کرنے کے بعد اس نے وہیں گھر کے کچن میں کھانا کھانا شروع کر دیا۔

یہی وجوہات تھیں کہ میں بات کو اس حد تک چھپا سکی۔ پھر شاید کم عمری تھی یا کوئی اور وجہ۔ بہرحال میری طبیعت اس قدر خراب بھی نہیں ہوئی جتنی کہ عموماً میں عورتوں کے منہ سے سنا کرتی تھی۔

کبھی جب میں کوارٹر سے نکل کر گھر جاتی تو بڑی اماں چھوٹی امی سے کہتیں۔

''دیکھو گھر کے کام کاج چھٹتے ہیں تو روز بروز کیسی نکھرتی جا رہی ہے۔ یوں جیسے باغ میں کوئی خوبصورت سا پھول کھلا ہو۔''

اور میں حیران بھی ہو جایا کرتی تھی کہ میری روح خوف سے فنا ہونے کو ہے اور بڑی اماں اور چھوٹی اماں کو میں نکھرا ہوا خوبصورت پھول لگ رہی ہوں۔

وہ دن میری زندگی کے شاید سب سے اذیت ناک دن تھے۔ میرے پاس سہیل کا پتا بھی نہیں تھا اور بڑی اماں یا کسی اور سے اس بارے میں پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ بس انتظار کی سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔

''مگر کب؟ کہیں تب تک بہت دیر نہ ہو جائے۔''...... میں سوچتی۔

حالانکہ دیر تو اب بھی ہو چکی تھی مگر میں اس کے وعدوں پر یقین کرنا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

پھر برسات شروع ہو گئی۔ جہلم میں تو یوں بھی چھاجوں مینہ برستا ہے۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر بارش کا نظارہ کرتی رہتی۔ ہاتھ میں اس کی دی ہوئی زنجیر تھامے۔ دریا جو کبھی ریت میں سویا رہتا تھا۔ گرمیوں کے آغاز سے ہی پانی سے بھرنے لگتا تھا۔ اور ساون میں تو اس کی لہریں بپھرنے لگتی تھیں۔ میں دریا کو دیکھتی تو لگتا کہ میرے اندر بھی اتنی ہی طغیانی ہے۔ بس میں اپنا آپ، اپنا دل کھول کر کسی کو دکھا نہیں سکتی تھی۔ اوپر سے پرسکون نظر آنے کی کوشش کرتی تھی حالانکہ میرے اندر دکھ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ خوف کی گرہیں کھلتی بند ہوتی رہتی تھیں۔

انہی دنوں بڑی اماں بیمار ہو گئیں۔ بہت زیادہ۔ وہ سب جو انہوں نے میرے لیے کیا

تھا میں کبھی لوٹا نہیں سکتی تھی۔ مگر ان کی خدمت کر کے ان کی محبت کا کچھ تو حق ادا کر سکتی تھی۔ افسوس میں یہ بھی دل سے نہ کر سکی۔ میرا ذہن آنے والے وقت کے خوف نے جکڑ رکھا تھا۔ ہر دم میرے دل کو دھڑکا لگا رہتا تھا۔ دکھ کی دیمک مجھے اندر سے چاٹ رہی تھی۔

کتنی محبت دی تھی بڑی اماں نے مجھے۔ میں کس منہ سے ان کا سامنا کرتی۔ کیسے کہتی ان سے کہ مجھ پر کیا بیت رہی تھی۔ کیسے بتاتی انہیں کہ میں آسیہ، جس پر انہیں اتنا فخر تھا۔ کتنی نیچے گر گئی تھی جسے کسی نے لوٹا نہیں تھا، اس نے خود اپنا آپ لٹا دیا تھا۔ وہ مجھے کچھ بھی کہہ دیتیں۔ چاہے میرا گلا دبا دیتیں میں اُف تک نہ کرتی، لیکن انہیں اپنا چہرہ کیسے دکھاتی۔

میں ان کے نزدیک رہنے لگی تھی۔ چھوٹی امی کا بیشتر وقت بھی وہیں گزرتا تھا۔

''تو کیوں اتنی چپ ہو گئی ہے آسیہ۔'' بڑی اماں میرا ہاتھ پکڑ کر کہتیں پھر چھوٹی امی سے مخاطب ہوتیں۔ ''دیکھنا بہو یہ میری امانت ہے تمہارے پاس۔ اسے دکھ نہ دینا۔ یہ جتنا پڑھنا چاہے، اسے پڑھانا۔ بے شک ڈانٹنا ڈپٹنا مگر ویسے جیسے اپنی سگی بیٹیوں کو ڈانٹتی ہو اور محبت ایسی دینا جیسی اپنی سگی اولاد کو دیتی ہو۔ یہ غیر سہی لیکن ہم ایک انسان کو اتنی محبت بھی نہیں دے سکتے۔ اپنا سمجھنے لگو تو سبھی اپنے لگتے ہیں۔''

میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی۔ چھوٹی امی انہیں تسلی دیتیں۔

''اماں! آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ آپ تو آسیہ کو اپنے ہاتھوں سے دلہن بنا کر اس کے سسرال بھجوائیں گی۔''

''اب کہاں اتنی مہلت۔''

میرے رونے کی شدت میں اور اضافہ ہو جاتا چھوٹی امی بھی رو پڑتیں۔

''نہیں اماں ہمیں اب بھی آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کے وجود کی برکت سے گھر میں رونق ہے۔ اس گھر کا دسترخوان وسیع ہے۔ میں تو آپ کے بغیر اس گھر کو ادھورا ہی سمجھتی ہوں۔ آپ کی دعاؤں کی بدولت ہی تو میرے بچے خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔''

بڑی اماں کو ہر بیتتے دن کے ساتھ یقین ہو رہا تھا کہ اب ان کا آخری وقت بھی آ گیا تھا۔ ان کی باتیں سن کر مجھے لگتا تھا جیسے میرے سر پر جو گھنا سایہ دار درخت تھا وہ چھن جانے والا تھا۔ پہلے ہی پریشانی کم نہیں تھی اب اس صورتِ حال نے تو ذہنی طور پر مجھے بالکل ہی تباہ کر دیا۔

اس رات چھوٹی امی کچن میں تھیں۔ بڑی اماں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔

''آسیہ میری گڑیا اپنی چھوٹی امی کو تو بلانا۔''

میں خوفزدہ ہوگئی۔ ان دنوں میں بات بات پر خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ دوڑ کر میں چھوٹی امی کو بلا لائی۔ بڑی اماں نے ہم دونوں کو اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔

''بہو! میں اپنے سب بچوں کو آخری بار دیکھ لینا چاہتی ہوں۔ سب سے کہو آ کر مجھ بڑھیا سے آخری بار مل لیں۔ پھر نہ جانے کوئی کب آئے۔ میں اس سے مل سکوں یا نہیں۔ میں اس گھر کو پھر سے جوڑنا چاہتی ہوں۔ ٹوٹتے ہوئے رشتوں کو ایک لڑی میں پرونا چاہتی ہوں۔ بس یہی میری آخری خواہش ہے کہ تم سب مل جل کر رہو۔ چاہے ایک دوسرے سے دور رہو مگر دل میں کدورت نہ ہو ملو تو پیشانی پر بل نہ ہو۔''

چھوٹی امی رو پڑیں۔ بڑی اماں مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

''جاؤ اپنے ابا جی کو بھی بلا لاؤ۔''

میں روتے ہوئے انہیں بلانے چلی گئی۔ انہوں نے ابا جی کو بھی اپنے نزدیک بٹھا لیا۔ میں بستر کے قریب ہی کھڑی ہوگئی۔ بڑی اماں نے مجھے تکیے کے نیچے سے الماری کی چابی نکال کر دی۔

''جاؤ' اندر زیوروں کے ڈبے پڑے ہیں' وہ لے آؤ۔''

میں ان کے حکم کی تعمیل میں الماری سے ڈبے نکالنے لگی۔ میرے کان وہیں لگے ہوئے تھے۔ بڑی اماں ابا جی کے سامنے بھی وہی...... باتیں دہرا رہی تھیں۔ میں نے ڈبے لا کر بستر پر ہی ان کے سامنے رکھ دیے۔ بڑی اماں نے وہ تینوں ڈبے کھول دیئے پھر بولیں۔

''میں نے اپنا سب کچھ تم کو دے دیا ہے۔ اب مجھ پر تم میں سے کسی کا کوئی ایسا حق نہیں جو میں نے پورا کرنا ہو۔ یہ زیور میں آسیہ کے لیے چھوڑ رہی ہوں۔ یہ چاہے تو اسے پہلے دے دینا چاہے امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لینا اور اس کی شادی کے وقت اس کے حوالے کر دینا۔ اور یہ میری کانوں کی بالیاں۔'' انہوں نے اپنے کانوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ اس عورت کے لیے ہیں جو مجھے غسل دے گی' اور یہ انگوٹھی۔'' انہوں نے انگلی میں پہنی پرانی وضع کی بھاری انگوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ ''بہو یہ امانتاً اپنے پاس رکھنا۔ یہ آسیہ کی کسی بیٹی یا بہو کے لیے میری طرف سے تحفہ ہے۔''

مجھ میں ضبط کا یارا نہ تھا۔ وہیں قالین پر بیٹھ کر میں نے چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور چیخ چیخ کر رو پڑی۔ ابا جی اور چھوٹی امی مجھے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگے۔

''میں نے کیا کر دیا۔'' میرا دل چیخ رہا تھا۔ ''کیوں بڑی امی کے اعتماد اور اعتبار کا خون کر دیا۔ کیا بیتے گی ان کے دل پر جب انہیں خبر ہوگی۔ کیوں کیا میں نے ایسا۔ اس سے پہلے میں مر ہی کیوں نہ گئی۔''

میں اپنی اور اپنے کمرے کی طرف سے اتنی بے پروا ہوگئی تھی کہ ماسی جواب میری وجہ سے صفائی ستھرائی کی عادی ہوگئی تھی۔ اُلجھن میں مبتلا ہوگئی۔

''کتنا گندا ہو رہا ہے کوارٹر۔ کتنے دن سے دھلائی نہیں ہوئی۔ چادریں بھی میلی ہو رہی ہیں۔ نئی نہیں بچھیں۔'' وہ بڑبڑا رہی تھی۔

میرے پاس اب اس کے علاوہ بہت کچھ تھا سوچنے کے لیے۔ ماسی نے پہلے جھاڑو لگائی' باتھ روم دھویا پھر چادریں تبدیل کرنے لگی۔ ایسے میں ہی سہیل کی دی ہوئی سونے کی زنجیر بستر سے اس کے قدموں کے پاس گر گئی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ میں نے یہ دیکھ لیا تھا۔ میں اسے بلانے کے لیے آئی تھی۔ جب وہ زنجیر کا معائنہ کر رہی تھی۔ ایک ہی لمحے میں' میں نے وہ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔

''یہ...... یہ...... اسے اُٹھانے کی کیا ضرورت تھی تمہیں؟'' میرے منہ سے الفاظ تک نہیں نکل رہے تھے۔

''اتنی قیمتی زنجیر تمہارے پاس کہاں سے آئی؟'' اس نے سوال پوچھا۔

میں اس بات کا کیا جواب دیتی۔ میری عادت تھی ہر ایک سے سلیقے اور ادب سے بات کرنے کی۔ مگر خود کو بچانے کے لیے میں نے ماتھے پر بل ڈال لیے۔

''تمہیں اس سے کیا۔ جاؤ بڑی اماں بلا رہی ہیں۔'' میں نے زنجیر والا ہاتھ بے اختیار اپنی کمر کے پیچھے کر لیا۔

''مجھے کیا؟'' ماسی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''مجھے کچھ کیوں نہیں ہوگا۔ آخر اس گھر کا نمک کھایا ہے میں نے۔ سچ سچ بتاؤ' تم نے چوری تو نہیں کی؟''

میرے قدموں تلے سے زمین نکلتی لگ رہی تھی۔ ''نہیں ماسی! قسم سے میں نے چوری نہیں کی ہے۔''

"پھر یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟"

"مجھے ملی تھی۔" میں بمشکل بات کر پا رہی تھی۔

"کہاں سے ملی تھی؟"

"ایک سہیلی نے دی تھی۔"

"وہ کون سی سہیلی ہے تمہاری جو سونے کے زیور تحفے میں دیتی ہے۔ سچ سچ بتاؤ ورنہ میں بڑی بیگم صاحب کے پاس لے جاؤں گی تمہیں۔"

میں جھوٹ بولنے میں ماہر نہیں تھی۔ مجھے کچھ نہیں سُوجھ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ پھر ماسی کے تھانیداروں والے انداز نے رہی سہی کسر بھی نکال دی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ میرا دل زور زور سے رونے کے لیے چاہ رہا تھا۔

"یہ مجھے دریا کے کنارے سے ملی تھی۔ اچھی لگی اس لیے رکھ لی۔"

"تو پھر گھر میں کسی کو بتایا کیوں نہیں۔ کیوں چوروں کی طرح چھپالی؟"

"مجھے ڈر لگ رہا تھا۔" میں نے پھر بات بنانے کی کوشش کی۔ "کہ بڑی اماں کو بتایا تو وہ مجھ سے لے لیں گی۔ کہیں گی کہ اس پر تمہارا حق نہیں ہے۔ ہم مسجد میں اعلان کروا دیں گے۔ جس کی زنجیر ہوگی وہ آ کر لے جائے گا۔ مگر ماسی یہ مجھے بہت اچھی لگی ہے۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ کوئی مجھ سے لے لے۔ تم بڑی اماں کو مت بتانا۔" میں نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

پتا نہیں ماسی کو یقین آیا یا نہیں لیکن اس نے بڑی اماں سے کچھ نہیں کہا۔ ایک لمحے کو میں نے شکر ادا کیا کہ خطرہ ٹل گیا تھا۔ مگر پھر مایوس ہوگئی۔

"کب تک؟ آخر تو پتا چلنا ہی ہے۔ کب تک چھپاؤں گی میں۔"

مجھے نہیں معلوم کہ مجھے خوشی ہوئی تھی یا نہیں البتہ امید ضرور بندھی تھی جب ابا جی نے بتایا کہ انہوں نے بڑی اماں کی خواہش کے مطابق سبھی کو فون کر دیا تھا اور سبھی نے جلد سے جلد آنے کی یقین دہانی کروائی تھی۔

"ابا جی! راشد انکل بھی؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"وہ بھی تو بیٹا ہے آئے گا کیوں نہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ بیوی بچوں کو بھی لے کر آئے گا۔"

ارسلان بھائی کو بھی جاپان میں خبر کر دی گئی تھی۔ ان کا کورس ختم ہی ہونے والا تھا۔ بس چند دن کی بات تھی۔ رفعت بھابی اور عرفان البتہ دن کا کچھ حصہ یہیں گزارنے لگے تھے۔ بھابی کا موڈ ذرا بگڑا ہوا تھا۔ مگر میاں کی طرف سے ہدایت ملی تھی سو طوعاً و کرہاً پوری کرنا پڑ رہی تھی۔

"اب بھی بڑھیا نہیں مرے گی تو اور کب تک جیے گی۔ اس کے ساتھ والوں کی ہڈیاں تک گل سڑ گئی ہوں گی۔" بھابی بڑبڑا رہی تھیں۔

اور ان کی بڑبڑاہٹ سن کر میرا دل چاہا کہ ان کے منہ پر کس کر چانٹا لگا دوں۔

"کس لیے؟" میرے اندر کسی نے کہا۔ "جو کچھ میں نے کیا ہے' یہ اس سے بڑھ کر برا تو نہیں۔ میں کون ہوتی ہوں بھابی کے متعلق ایسا سوچنے والی جبکہ میں خود ان سے کہیں زیادہ بری ہوں۔ ان سے کہیں زیادہ کمینی حرکت کی مرتکب ہوئی ہوں۔"

بارشوں کا زور تھا۔ سیلابوں کا خطرہ تھا اور ہمارا تو گھر بھی دریا کے بالکل کنارے واقع تھا اس لیے آئے تو سبھی اپنے بچوں سمیت لیکن ایک آدھ دن سے زیادہ ٹھہرے نہیں۔ اب صرف راشد انکل اور ارسلان بھائی کا انتظار تھا۔

"ارسلان تو دیارِ غیر میں بیٹھا ہے مگر راشد اور اس کی بیوی کیوں نہیں آ رہے؟" چھوٹی امی دُکھ سے کہتیں۔

انہی کے اصرار پر ابا جی نے دوبارہ فون کیا۔ حالانکہ وہ بالکل بھی اس بات کے حق میں نہیں تھے۔

"کہہ رہا ہے آفس کا کام جان نہیں چھوڑ رہا۔ بہرحال کام کے سلسلے میں بائی روڈ ہی اسلام آباد جا رہا ہے۔ راستے میں تھوڑی دیر رُکتا جائے گا۔" ابا جی نے اطلاع دی تو ان کا مزاج بگڑا ہوا تھا۔

"چلیں آ تو رہا ہے۔ اماں کی خواہش بہرحال پوری ہو جائے گی۔" چھوٹی امی کو تسلی ہوگئی۔

جس روز انہیں آنا تھا میری عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ کسی پل چین نہیں تھا۔ سہیل کے تصور میں اب بھی بے پناہ کشش تھی لیکن اس سے بھی بڑھ کر اب دوسرا مسئلہ تھا جو میں جلد از جلد اس سے کہہ دینا چاہتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہی میری مدد کرے گا۔ اس کے کہے ایک

ایک حرف پر اعتبار تھا مجھے، وہ مجھے بے یارو مددگار نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا مجھ سے۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا میرے ہاتھوں میں سنسنی سی پیدا ہونے لگی تھی۔ پیٹ میں عجیب گرہیں سی پڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ صرف مجھے ہی آنے والے مہمانوں کا انتظار نہیں تھا۔ گھر میں سبھی ان کے منتظر تھے۔ پروگرام کے مطابق انہیں دوپہر کا کھانا جہلم میں ہی کھانا تھا۔ چھوٹی امی نے خوب اہتمام کر رکھا تھا۔ پھر فون آ گیا کہ گوجرانوالہ میں آنٹی کے بھائی کے گھر ٹھہر گئے ہیں۔ شام تک پہنچیں گے۔ چھوٹی امی نے بشیر کو فوراً امریکن بیکری دوڑایا۔ کچھ لوازمات گھر پہ تیار کیے۔ چائے کا وقت بھی گزر گیا۔ اندھیرا اپنے پر پھیلانے لگا چھوٹی امی ان کی خیریت کے لیے فکرمند تھیں جبکہ ابا جی غصے میں تھے۔

رات کے کھانے کا وقت ہوا تو چھوٹی امی نے چاہا کہ کچھ انتظار کر لیا جائے۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے انہیں کسی کا خیال نہیں ہے تو ہمیں بھی ان کا خیال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ابا جی نے حکم دیا۔

میں نے کھانا لگا دیا مگر کھانے کو کس کا جی چاہ رہا تھا۔ کتنے دن بعد میں ان کے درمیان کھانے کی میز پر بیٹھی تھی۔

میرا رونے کو دل چاہ رہا تھا۔

کھانے کے بعد بھی جب کچھ وقت گزر گیا تو ابا جی نے اعلان کیا۔

”مجھے یقین ہے کہ آج وہ لوگ نہیں آئیں گے۔ بتیاں وغیرہ بجھاؤ اور سونے کی تیاری کرو۔“

”میں بڑی اماں کے پاس رہ جاتی ہوں۔“ میں نے نظریں نیچی کر کے کہا مبادا کوئی حقیقت نہ جان جائے...

”نہ میری بچی۔ پچھلی دو راتوں سے میرے لیے جاگ رہی ہے۔ صبح سے بھی پریشان اور فکرمند پھر رہی ہے۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ تو جا کر سو جا۔“ بڑی اماں بولیں۔

میرے اصرار کے باوجود بھی انہوں نے مجھے میرے کمرے میں بھجوا دیا۔

رات جیسے جیسے بیتتی جا رہی تھی، میری بے کلی بڑھ رہی تھی۔ دماغ ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔

”کیا خبر رات کے کسی پہر آ جائیں اور مجھے پتا ہی نہ چلے۔“

یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں آیا۔ میں تیزی سے کوارٹر سے باہر نکلی۔ شاید اسی کو چھٹی حس کہتے ہیں۔ میں مکان میں پہنچی تو لیونگ روم روشن تھا اور اندر زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔

اندر سبھی موجود تھے۔ ابا جی، چھوٹی امی، اور اماں راشد انکل آنٹی، سہیل اور اس کی بہن گڑیا۔ میری نگاہیں سہیل پر ہی ٹک کر رہ گئیں۔ میری جانب اس کا پہلو تھا۔ وہ بڑی اماں کے پاس بیٹھا تھا جو رو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر تک میں اسی طرح کھڑی رہی پھر ابا جی کی آواز نے چونکا دیا۔

”آسیہ... آسیہ بیٹا۔“

سہیل نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی نگاہیں بس پل بھر کو ٹکرائیں۔

”آسیہ۔“ ابا جی نے پھر پکارا۔

”جی..... جی۔“ میں گھبرا گئی۔

”بیٹا تم جا کر آرام کرو۔“ انہوں نے کہا۔

واضح طور پر وہ کسی خاندانی مسئلے کے متعلق بات کر رہے تھے۔ اور ابا جی کے خیال میں وہاں میری موجودگی غیر مناسب تھی۔ حالانکہ خاندان کے تمام مسائل سے میں واقف تھی لیکن اس کی وجہ صرف بڑی اماں تھیں۔ جو اپنے دل کا حال مجھ سے کہہ دیا کرتی تھیں۔ یہ وقت اور مزاج کی بات تھی۔ کبھی ہر بات میرے سامنے کہہ دی جاتی تھی اور کبھی میں غیر ضروری قرار دی جاتی تھی۔ اگلے روز بڑی اماں کی زبانی مجھے سب کچھ معلوم ہو جاتا تھا۔

ابا جی کے حکم کے بعد بادل نخواستہ مجھے وہاں سے ہٹنا پڑا۔ صحن کی بتی رات سوتے وقت بجھا دی جاتی تھی۔ اب بھی وہاں تاریکی تھی۔ میں ٹھنڈے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے گرجتے بادلوں اور چمکتی بجلی کا کھیل دیکھ رہی تھی۔

دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ آنے والے مہمان واپسی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”آپ لوگ نکلیں، میں آپ کو جوائن کر لوں گا۔ بس پانچ منٹ میں۔“ سہیل اپنی ممی سے کہہ رہا تھا۔

”پانچ منٹ سے پانچ گھنٹے لگا دے گا یہ۔“ پھر سہیل سے مخاطب ہوئیں۔ ”میں گڑیا کو اپنی کار میں لے جا رہی ہوں اور تم نے پانچ منٹ کہا ہے تو اس سے زیادہ وقت مت لگانا۔“

چلیں راشد۔''

ابا جی' چھوٹی امی اور بڑی اماں انہیں گیٹ تک چھوڑنے چلے گئے۔ بڑی اماں زیادہ چل نہیں سکتی تھیں اس لیے اندر دروازے میں ہی کھڑی ہوگئیں۔ بوندا باندی بارش کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ سہیل تھوڑی دیر تک تو وہیں رہا پھر ان کی نظر بچا کر مجھے ڈھونڈنے لگا۔

''آسیہ...... آسیہ کہاں ہو۔'' اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

وہ میرے کوارٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں راستے میں آ گئی۔

''سہیل۔'' میرے منہ سے نکلا۔ اور میں بے اختیار ہوگئی...... ''کہاں چلے گئے تھے تم۔ تم نے تو کہا تھا کہ تم چلے آؤ گے۔ مجھے ہمیشہ کے لیے اپنانے کو کدھر کھو گئے تھے تم۔''

''آسیہ! زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس۔ تمہاری خاطر میں رُک گیا تھا کہ شاید چند لمحے کے لیے ہی سہی تم سے علیحدگی میں بات ہو جائے۔ ابھی دادی اماں بھی اندر آتی ہوں گی۔ آتے ہی مجھے ڈھونڈیں گی۔''

ابھی بات اس کے منہ ہی میں تھی کہ بڑی اماں کی آواز آئی۔

''سہیل بیٹا' کہاں ہو؟''

اس نے مجھے خود سے الگ کیا۔

''دادی اماں مجھے بلا رہی ہیں۔ تم یہ رکھ لو۔'' اس نے میرا ہاتھ اُٹھایا اور ہتھیلی پر سو روپے کا نوٹ رکھ دیا۔

''یہ کیوں؟ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے' مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں۔''

''سہیل۔'' بڑی اماں کی آواز میری سرگوشی پر حاوی ہو رہی تھی۔

''آ رہا ہوں دادی اماں۔'' سہیل نے میری بات پوری ہونے سے قبل کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''گڈ بائے۔''

اور پلٹ کر تیزی سے اندر چلا گیا۔ میں ہتھیلی پر رکھے سو روپے کو دیکھتی رہ گئی۔ مجھے لگا جیسے سارا خون میری کنپٹیوں میں جمع ہو رہا ہو۔

''یہ نہیں چاہیے مجھے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے سہیل۔'' میرا دل چلا رہا تھا اور میں پاگلوں کی طرح دیوار پر اپنا ہاتھ مار رہی تھی۔

پھر اچانک مجھے خیال آیا۔ میں جلدی سے اپنے کوارٹر کی طرف بڑھی۔ بارش بڑھتی جا

رہی تھی۔ اس وقت میں اپنے آپ میں نہیں تھی۔ ہوا کی شدت سے بجتے کھڑکی کے کواڑوں کی پروا کیے بغیر میں نے الماری سے اپنی چادر نکالی۔ بارش کی پھوار ہوا کے ساتھ کمرے میں آئی اور میرے چہرے اور بالوں کو بھگو دیا۔

میری ہمت نہیں تھی کہ سب کے سامنے اسی کمرے میں بیٹھ سکتی۔ جس میں سہیل تھا۔ اس صورت حال کا مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ میں صدر دروازے سے باہر نکل آئی۔ سہیل کی سفید ٹیوٹا کرولا روش پر کھڑی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ ابا جی اور چھوٹی امی لازماً اسے گیٹ تک چھوڑنے آئیں گے اس لیے اس خیال کو ترک کر کے گیٹ کھول کر باہر نکل گئی۔

تھوڑی ہی دور سڑک کے کنارے ایک اکلوتا گھنا درخت تھا جس کے سائے تلے بچپن میں میں بہت کھیلی تھی۔ اس رات بھی وہی درخت میری پناہ گاہ بنا۔ اس کے تنے سے ٹیک لگا کر میں بیٹھ گئی۔

وہاں سڑک کنارے' تاریک رات' برستی بارش اور دریا کی لہروں کے شور کے درمیان بیٹھ کر ایک ایک لمحہ بتانا کتنا اذیت ناک تھا۔ یہ وہی جان سکتا تھا جو کبھی اس سے گزرا ہو۔ وقت جیسے تھم گیا تھا۔ انتظار کی ایک ختم نہ ہونے والی کیفیت تھی۔

شاید گھنٹوں بیت گئے تھے یا پھر فقط چند منٹ' جب گھر سے نکلتی کار کی ہیڈ لائٹس نے سڑک کو روشن کر دیا۔ میں تیزی سے اُٹھی لیکن میرا سر چکرا گیا۔ وہ چند لمحوں کی بات تھی کہ سہارے کے لیے میں نے درخت کے تنے پر ہاتھ رکھا تھا اور ان چند لمحوں میں ہی کار تیزی کے ساتھ میرے قریب سے نکلتی چلی گئی تھی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں تیز بارش کی بوندیں لحظہ بھر کو چمکی تھیں پھر روشنی کی لکیر آگے نکل گئی۔

میں چادر کا خیال کیے بغیر کار کے پیچھے بھاگی تیز۔ بہت تیز۔

''سہیل۔ سہیل رُک جاؤ۔'' میں چلائی۔

مگر وہاں کچھ باقی نہ رہا۔ سوائے تاریکی' برستی بارش اور لہروں کے شور کے۔ کار کی سرخ بتیاں پرانے پل کی طرف مڑ گئی تھیں۔ پاگلوں کی طرح اندھیرے میں بھاگتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میں سب کچھ کھو چکی تھی۔ اپنی عزت' معصومیت اور کنوارا پن ہی نہیں۔ اپنی محبت' پناہ اور اپنے بچے کی شناخت بھی۔

وہ ایک لمحہ بہت تکلیف دہ تھا۔ درد کی ایک ٹیس سی میرے دل میں اُٹھی اور میں وہیں گیلی سڑک پر گر پڑی۔

شکستہ قدموں سے بالآخر میں اپنے کمرے میں ہی لوٹ آئی۔ وہی کمرا جس کی دیواریں بیتی ہوئی اس رات کی گواہ تھیں۔ جب میں پناہ گاہ میں پہنچ کر لُٹ گئی تھی۔ میں ان دیواروں سے لپٹ کر رو پڑی۔ اس لمحے مجھے خود اپنا ہوش نہیں تھا۔ جتنی برسات باہر تھی' اتنی ہی میرے اندر بھی تھی۔ خبر نہیں کہ کب میں چیخ چیخ کر رونے لگی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہی دنیا کا اختتام تھا۔ یہیں وقت کو تھم جانا تھا۔ اسی لمحے قیامت برپا ہونی تھی۔ اسی لمحے دروازے کی سمت سے ماسی کا ہیولا سا اندر داخل ہوا۔

''آسیہ' آسیہ کیا ہوا خیر ہے۔ تم تو بڑی بیگم صاحب کے پاس گئی تھیں ناں۔'' مجھے اس طرح روتے دیکھ کر وہ بری طرح سے گھبرا گئی۔

میں نے خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

''کیا ہوا' کچھ بولو تو سہی۔ اس کم بخت بتی کو بھی اسی وقت جانا تھا۔ تم ہی کچھ پھوٹ دو منہ سے ہوا کیا؟''

''یہاں آتے ہوئے بارش میں پھسل گئی تھی۔ گھٹنا چھل گیا ہے۔''

''مجھے تو تم نے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں نے سوچا پتا نہیں کیا ہوا ہے۔'' اس نے میرا گھٹنا اور اس کا زخم محسوس کرنے کی کوشش کی۔ ''اور تم تو بالکل بھیگ گئی ہو۔ کیا مصیبت پڑی تھی بارش میں آنے کی۔ صبح بارش تھمنے پر آ جاتی۔''

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''اب اس اندھیرے میں کیا کروں تمہارے گھٹنے کا۔ ایک تو یہاں موم بتی تک نہیں ہے۔''

''تم جاؤ ماسی۔'' میں نے دل میں اُٹھی ٹیس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''سو جاؤ' میری فکر مت کرو۔''

ماسی تسلی دلاسا دے کر چلی گئی اور میں چاروں طرف پھیلی مہیب تنہائی میں پانی کے شور کے ساتھ تنہا رہ گئی۔ کھڑکی میں بیٹھ کر بارش کی پھوار سے بھیگتی...... لہروں اور بوندوں کا کھیل

دیکھتی رہی۔

صبح اندھیرے منہ ہی ماسی کا بیٹا صادق اسے لے جانے آ گیا۔ صادق بھی عجیب لڑکا تھا۔ مجھ سے چار پانچ سال بڑا تھا۔ مگر بہت شروع سے اپنے ماموں کے پاس لاہور میں رہ رہا تھا۔ وہیں رہ کر کام سیکھتا اور استاد کی مار کھاتا رہا۔ چھٹیوں کے دنوں میں بہت باقاعدگی کے ساتھ وہ جہلم آیا کرتا تھا۔ رات کو ماں کے ساتھ باتیں کرتے کرتے سو جاتا اور دن میں ڈرائیور شکور بھائی کے ساتھ...... ابا جی اور ارسلان بھائی کی گاڑیوں کی دیکھ بھال میں لگا رہتا۔ جب وہ آیا کرتا تھا بڑی اماں مجھے اپنے کمرے میں بلوا لیتی تھیں۔

اس نے کبھی مجھے خود سے مخاطب نہیں کیا تھا۔ میں سلام کرتی تھی اور وہ جواب دیا کرتا تھا۔ سب کو سلام کرنا میری عادت تھی۔ کبھی میں حال چال بھی پوچھ لیا کرتی تھی۔

''صادق بھائی اچھے تو ہیں۔''

''اللہ کا شکر ہے۔'' وہ نیچی نظروں کے ساتھ جواب دیتا۔

''ٹی۔ وی میں سنا تھا کہ لاہور میں سیلاب کا خطرہ ہے۔'' میں کہتی۔

''جہاں میں رہتا ہوں وہاں تک سیلاب نہیں آتا۔''

''چلیں شکر ہے لیکن ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ کہیں بھی سیلاب نہ آئے۔ چاہے اس سے ہمیں نقصان ہو یا نہ ہو۔'' میں تقریباً نصیحت کر دیتی۔

کبھی ماسی البتہ آہ بھر کر کہا کرتی تھی۔

''دعا کرو آسیہ ہم بھی اچھے دن دیکھیں۔ میرا بیٹا اس لائق ہو جائے کہ نوکری سے میری جان چھوٹے۔ مالک کتنے بھی اچھے ہوں پر نوکر تو نوکر ہی رہتا ہے ناں۔ بس اب میرا دل چاہتا ہے کہ صادق کا سہرا دیکھوں۔ بہو آ جائے تو میں آرام کروں۔ بوڑھی ہڈیوں میں اب جان نہیں رہی اتنا کام نہیں ہوتا مجھ سے۔ بہت سخت دن دیکھے ہیں میں نے۔ یہ وہی عورت جان سکتی ہے جس نے اپنی جوانی بیوگی میں کاٹ دی ہو۔ صرف اپنے بچوں کی خاطر۔''

ماسی کی برسوں کی ریاضت کام آ گئی تھی۔ صادق آتے ہی کہنے لگا۔

''بس اماں' آج ہی سامان باندھو' میں نے اپنے رہنے کا الگ بندوبست کر لیا ہے۔ اب میں اس قابل ہوں کہ تمہیں لوگوں کے برتن بھانڈے مانجھنے کی ضرورت نہیں۔ میں کماؤں گا' تم چارپائی پر بیٹھ کر کھانا۔ اللہ کے فضل سے میں اتنا کمانے لگا ہوں کہ ہم خوشحال رہ

سکتے ہیں۔"

ماسی کی تو خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ وہ بڑی اماں کے پاس دوڑی۔

"ارے تم تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے لگیں۔ ایسی کیا جلدی پڑی ہے۔ ابھی تو صادق نے آ کر سانس بھی نہیں لیا۔ چند دن رُک جاؤ۔ میں کوئی انتظام کر لوں تو پھر چلی جانا۔ چھٹیوں کے فوراً بعد آسیہ کے امتحان ہیں اور بہو غریب میں اتنا دم کہاں کہ اتنے بڑے ٹبر کو سنبھالے۔ رہیں رفعت بہو تو انہیں کیا پڑی کہ گھر بار دیکھیں وہ خود بھی بھوکی رہیں گی عرفان کو بھی بھوکا رکھیں گی مگر اُٹھ کر کام کو ہاتھ نہیں لگائیں گی کہ کہیں ناخن نہ ٹوٹ جائیں۔"

"اصل میں صادق کو بس ایک دن کی چھٹی دی ہے اس کے استاد نے۔ کہا ہے کل صبح کام پر آنا ہے۔"

دونوں میں خاصی دیر بحث ہوتی رہی۔ بالآخر بڑی اماں کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑے۔

ماسی کا سامان ہی کتنا تھا۔ فٹافٹ باندھ کر دوپہر کو جانے کے لیے بھی تیار ہو گئی۔ اسے جاتے دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ ماسی میری کچھ بھی نہیں تھی پھر بھی جیسے سبھی کچھ تھی۔ وہ جانے لگی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرے دل میں اس کے لیے کتنی محبت تھی۔ میری ماں ایک نہیں تھی۔ بہت سی مائیں تھیں میری جنہوں نے مجھے پالا پوسا تھا۔ مجھ سے محبت کی تھی۔ میرے لیے راتوں کی نیندیں حرام کی تھیں۔ ماسی بھی انہی میں سے ایک ماں تھی۔ اس کے گلے لگ کر میں بری طرح سے رونے لگی۔

"ماسی مت جاؤ۔ تمہارے جانے سے اس کوارٹر میں مَیں بالکل اکیلی رہ جاؤں گی۔ کتنے عرصے کا ساتھ ہے۔ جب سے میں نے آنکھ کھولی، تمہیں اپنے ساتھ پایا۔ کیا ہے جو تم یہیں رہ جاؤ۔"

"پگلی میں کون سا بہت دور جا رہی ہوں۔" اس نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا۔ "صبح بس پکڑو اور دوپہر کو لاہور پہنچ جاؤ۔ کبھی میں آ جاؤں گی، کبھی تم آ جایا کرنا۔ ابھی صادق کی شادی کروں گی۔ اس پر تم ضرور آنا۔ ہم سب مل کر لاہور کی سیر کریں گے۔ جب دل چاہے مجھے چٹھی لکھ دینا میں صادق سے پڑھوا لیا کروں گی۔"

پھر اس نے صادق سے مجھے لاہور کا پتا سمجھانے کو کہا۔ پہلے میں صرف دو مرتبہ لاہور گئی تھی۔ وہ عمر اور وقت ایسا تھا جب ذہن پوری طرح مستعد ہوا کرتا ہے۔ سو مجھے کچھ نہ کچھ

اندازہ ہو ہی گیا۔

وہ چلی گئی اور تنہائی کا احساس اور بڑھ گیا۔ ارسلان بھائی بھی آنے والے تھے اور میں سوچ سوچ کر میں پاگل ہونے کو تھی کہ اب سے پہلے تو شاید ماسی کی موجودگی کا خیال کر کے وہ کوارٹر میں کبھی نہیں آئے تھے مگر اب کیا ہوگا؟ کوئی ایک پریشانی تو نہیں تھی۔

گھر کے کام کی ذمے داری خود بخود میرے سر پر آ گئی۔ نئی ماسی کی تلاش جاری تھی مگر پروین جیسی عورت ملنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ گھر کے سب حالات سے بخوبی واقف تھی۔ زیور کپڑے، روپے پیسے قیمتی سامان سب اس کے سامنے کھلا پڑا رہتا تھا۔ پر اس نے کبھی ہاتھ لگانا تو دور ان کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ گھر کی کوئی بات کبھی ادھر اُدھر نہیں نکالی تھی۔ کام گو آہستہ آہستہ کرتی تھی لیکن ذمے داری نبھانا جانتی تھی۔ ایسی خوبیوں والی کوئی اور عورت کہاں آسانی سے ملتی تھی۔ چھوٹی امی بلڈ پریشر اور شوگر کی مریضہ تھیں۔ رفعت بھابی نے بڑی اماں کے ٹھیک ہو جانے کے بعد آنا جانا بالکل ختم کر دیا تھا اور ارسلان بھائی کی آمد سے پہلے ان کا چلے آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لے دے کے میں ہی رہ گئی تھی۔ مجھے کمزوری محسوس ہوتی۔ سر چکراتا یا آنکھوں کے آگے اندھیرا آ جاتا۔ میں اپنی فکروں میں گھر کے کام کاج میں مصروف ہی رہتی تھی۔

اس روز ارسلان بھائی کا فون آیا تھا۔ وہ واپس آ رہے تھے اور پرسوں انہیں اسلام آباد پہنچنا تھا۔ گھر میں سب ہی خوش تھے اور میرے اندر جیسے زلزلہ سا آیا ہوا تھا۔

"کب تک چھپاؤں گی اس بات کو۔ اپنے جسم کی تبدیلی کو۔ اب تو میں بھی واضح طور پر محسوس کرنے لگی ہوں۔ کل سب کو اندازہ ہو جائے گا۔ کیا ہوگا۔ کچھ بتا پاؤں گی میں کسی کو یا نہیں۔ کیا جواب دوں گی؟ اتنے سوال اتنی زبانیں۔ اتنی انگلیاں۔ میں تو سب برداشت بھی کر لوں۔ بے غیرت تو بن ہی چکی ہوں۔ تھوڑی سی اور بے عزتی بھی برداشت کر لوں گی لیکن اس بچے کا کیا قصور جو بے خبر ہے۔ بے خطا ہے۔ جو ہر بچے کی طرح امیدیں لے کر پیدا ہوگا۔ محبت کی امیدیں، خوشیوں کی امیدیں، اسے کیا دے پاؤں گی میں۔"

"آسیہ!" چھوٹی امی نے پکارا۔

میں چونک گئی۔

"بیٹا! اماں کو چائے کی پیالی دے دینا اور ساتھ میں ایک سلائس پر مکھن بھی لگا دینا۔

میں کہتی ہوں کہ خالی چائے نہ پئیں تو بہتر ہے۔"

چائے کی ٹرے لے کر لیونگ روم میں پہنچی تو ابا جی چھوٹی امی اور بڑی اماں بھی وہاں تھے اور باتوں میں مصروف تھے۔

"آخر میرا حق ہے اپنی اولاد پر۔" بڑی اماں کہہ رہی تھیں۔ "آج تک میں نے کچھ مانگا بھی نہیں ہے اپنے بچوں سے' پر اب ڈنکے کی چوٹ پر مانگوں گی' اس گھر کو اکٹھا دیکھنا چاہتی ہوں میں' مجھے لگتا ہے کہ میں مرگئی تو تم بہن بھائی بالکل بکھر جاؤ گے' کوئی ایک دوسرے کے دکھ درد کو بھی نہیں پوچھے گا۔ خاص کر مجھے راشد سے کوئی اچھی امید نہیں ہے۔ وہ چاہے بھی تو اس کی بیگم صاحبہ کو کب یہ گوارا ہوگا' اس لیے مرنے سے پہلے میں یہ رشتے مضبوط کرنا چاہتی ہوں۔"

میں نے خاموشی سے چائے بنا کر سب کو پیالیاں تھمائیں اور بڑی اماں کے لیے سلائس پر مکھن لگانے میں مصروف ہوگئی۔

"میں نے راشد کو چٹھی لکھی ہے کہ اس کی ماں کی یہ آخری خواہش ہے۔"

بڑی اماں کی گفتگو جاری تھی۔ "گڑیا کی شادی پھوپھو کے گھر ہو' ناصرہ کے بیٹے انور سے۔ اچھا کھاتا کماتا لڑکا ہے' ڈاکٹر ہے' گڑیا کی طرح ہی تیز تیز انگریزی بولتا ہے' اس کے برابر کا رشتہ ہے پھر سہیل ہے تو اس کے لیے میں نے یوسف کی بیٹی سائرہ کا لکھا ہے۔"

میرے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ مکھن لگی ڈبل روٹی نے قالین بھی خراب کر دیا۔

"دیکھ کر کام کیا کرو آسیہ' تمہارے ہاتھوں سے برتن بہت گرتے ہیں۔" چھوٹی امی نے بیزاری سے مجھے مخاطب کیا اور پھر بڑی ماں کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

"اماں! سائرہ کا ذکر یونہی کر دیا آپ نے بھابی سوچیں گی کہ میں نے آپ کو پوتی کے لیے اکسایا ہے۔ پتا نہیں کیا بات کر دیں وہ۔"

"ارے کمال ہے' تمہاری بیٹی میری کچھ نہیں لگتی کیا؟ کیا اب تم لوگ مجھے پٹیاں پڑھاؤ گے تب ہی میں کوئی بات کروں گی اپنی عقل بھی ہے میرے پاس' بس میں نے طے کر دیا ہے گڑیا کی شادی انور سے ہی ہوگی اور سہیل کی سائرہ سے۔ ایک سے ایک بڑھیا رشتہ جب خاندان میں موجود ہے تو ادھر ادھر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے وقتوں میں تو ایسا سوچا

بھی نہیں جاتا تھا۔"

بڑی اماں کے الفاظ سیسے کی طرح میری سماعت میں اتر رہے تھے۔ وہاں کھڑے رہنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں پھر کچن میں پیڑھی پر آ بیٹھی۔

پتا نہیں کیا ہوگیا تھا' چاہتے ہوئے بھی میں رو نہیں پا رہی تھی۔ عجیب کیفیت طاری تھی۔ کتنی دیر تک جھاڑو کے تنکے سے زمین پر نادیدہ لکیریں کھینچتے ہوئے میں نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی بے شمار باتیں تھیں اور سب ایک دوسرے سے پیوست۔ ایک ہی سوچ کے آگے ہزاروں راستے تھے۔ میں ہر راستے پر چلنا چاہتی تھی مگر راہیں بند تھیں۔ بھول بھلیوں میں کھو رہی تھی میں' سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ سہیل' ارسلان بھائی' سائرہ' بڑی اماں اور سب سے بڑھ کر میری کوکھ میں سانس لیتا میرا بچہ۔ کس کس کے بارے میں سوچتی اور کیا کیا سوچتی۔

"آسیہ! اماں کے سر میں درد ہو رہا ہے بیٹا ذرا ان کا سر تو دبا دینا۔" چھوٹی امی نے برآمدے سے ہی مجھے پکارا۔

میں آہستہ سے اٹھی اور بڑی اماں کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ بستر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوگیا آسیہ! کیوں اتنی چپ چپ سی ہوگئی ہو میری بچی' دیکھو بال کیسے روکھے ہوگئے ہیں تیل نہیں لگا رہیں آج کل۔" بڑی اماں نے مجھے اندر داخل ہوتے دیکھا تو بولیں۔

میں کچھ کہنا چاہتی تھی ان کی تسلی کے لیے' کچھ ہوں ہاں کر دینا چاہتی تھی مگر میرے منہ سے کچھ بھی نہ نکلا شدید تھکن اور لامتناہی تنہائی کے احساس نے مجھے گھیر رکھا تھا۔

"تھکی ہوئی لگ رہی ہو' بس بیٹا یہ کمبخت پروین بھی ایک دن نہ رک سکی' ذرا ٹھہر گئی ہوتی تو میں کوئی اور بندوبست کروا لیتی۔ اب سارا ٹبر تجھ پر ہی آ پڑا ہے۔ پر تو فکر نہ کر' میں نے ناصرہ سے کہا ہوا ہے' اس کی کام کرنے والی کی بھتیجی ہے' اگلے ہفتے سے وہ کام پر آ جائے گی۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں بھی اب جان نہیں رہی کہ میں ہی کچھ کام سنبھال لیتی۔"

وہ کہہ رہی تھیں اور میرا ذہن انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔

"کب تک چھپاؤں گی' نہیں چھپا سکتی' اب کچھ نہیں چھپ سکتا۔ سہیل کا باب ختم ہوگیا۔ میری زندگی میں اب اس کا کوئی حصہ نہیں' وہ کچھ نہیں ہے میرے لیے' میرے ہونے والے بچے کے لیے' بہت پستی میں گر چکی ہوں میں اور اب ارسلان بھائی بھی آنے والے

ہیں۔ وہ پھر وہی کھیل شروع کر دیں گے۔ میں اسی غلاظت میں گرتی جاؤں گی' لتھڑ جاؤں گی' میرے اندر ایک اور کیڑا پلنے لگے گا جس کا دنیا کی کسی نعمت پر کوئی حق نہیں ہوگا۔ شناخت اور محبت تک نہیں' اس کھیل کو کہیں تو ختم ہونا چاہیے اور یہ کھیل آج ہی یہاں ختم ہو جائے گا۔''

''آسیہ! خیر تو ہے بیٹا؟ کیوں چپ چپ ہے بات ہی نہیں کر رہی' کسی نے کچھ کہہ دیا کیا؟''

''بڑی اماں!'' فیصلہ کن لمحہ آ پہنچا تھا۔

''میں ماں بننے والی ہوں۔''

ایک لمحے کو تو وہ میری بات سمجھ ہی نہ سکیں۔

وہ سب آنسو جو کہیں اندر گم ہو چکے تھے' ایک دم آنکھوں میں امڈ آئے۔ میں دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بری طرح سے رو پڑی۔

''میں بہت بری ہوں بڑی اماں' بہت بری۔ میں آپ کی محبت کے قابل نہیں ہوں میں...... میں......!'' الفاظ ساتھ چھوڑ گئے۔

میں نے بڑی اماں کی طرف دیکھا۔ وہ پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ آنکھوں میں بے یقینی کی دھند تھی۔ پھر انہوں نے اپنا کلیجہ تھام لیا۔

''آسیہ! یہ تُو نے کیا کیا؟'' ان کے منہ سے نکلا۔

اور وہ چکرا کر بے ہوش ہوگئیں۔ میرے منہ سے چیخ نکلی اور میں ان سے لپٹ گئی۔

''بڑی اماں...... بڑی اماں! آنکھیں کھولیں۔'' میں پاگلوں کی طرح چلا رہی تھی۔

میری آوازیں سن کر ابا جی اور چھوٹی امی دوڑے چلے آئے۔ پھر ابا جی تو ڈاکٹر کی طرف دوڑے' میں اور چھوٹی امی ان کے تلوے اور ہاتھ سہلانے لگے' پانی کے چھینٹے ڈالے۔ ڈاکٹر کے آنے سے قبل ہی بڑی اماں کو کچھ کچھ ہوش آنے لگا تھا۔

''ہائے آسیہ! یہ تُو نے کیا کیا؟'' وہ کراہتے ہوئے ہولے ہولے کہہ رہی تھیں۔

چھوٹی امی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے میری جانب دیکھا ان کے تاثرات میرے لیے سوالیہ نشان تھے۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جواب دے چکی تھیں' اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ میرے پاس کسی کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔

میں اٹھی اور بھاگ کر اپنے کوارٹر میں چلی آئی۔ میری کھڑکی سے باہر جیسے دریا کی

موجیں بے قرار تھیں' اسی طرح میرے اندر بھی طوفان برپا تھا۔ میں چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ ان لمحوں کا ماتم کر رہی تھی جو اب لوٹ کر نہیں آ سکتے تھے۔ اس بچے کی قسمت پر رو رہی تھی جسے بے قصور اور بے خطا ہوتے ہوئے بھی طعنے سننے تھے' جسے معاشرے کی سب سے بڑی گالی بننا تھا۔

خبر نہیں اسی طرح کتنا وقت بیت گیا تھا۔ جب بڑی اماں اپنے ناتواں وجود کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ دکھ اور غصے سے ان کا جسم کانپ رہا تھا۔ آتے ہی انہوں نے میری چٹیا پکڑی اور مجھے باہر گھسیٹنے لگیں۔ نہ جانے ان کے بوڑھے وجود میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ انہوں نے مجھے بری طرح سے پیٹ ڈالا۔

''تجھے کچھ شرم حیا نہ آئی۔ مجھے بتانے سے پہلے تُو ڈوب کیوں نہ مری۔ کون ہے وہ بدبخت' بتا دے ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔''

میں روتے ہوئے مار کھائے جا رہی تھی۔ وہ مارتے مارتے پوچھتے پوچھتے تھک گئیں۔ ان کا سانس پھول گیا تھا۔ خود بھی ساتھ روتی جا رہی تھیں۔ چھوٹی امی بھی روتے ہوئے مجھے کوستی جا رہی تھیں اور ابا جی صدمے کی کیفیت میں تھے جاتے جاتے صرف اتنا کہہ گئے۔

''کاش کہ تم میری بیٹی ہوتیں' میں اسی وقت تمہیں ذبح کر کے اسی جگہ گاڑ دیتا۔''

چھوٹی امی چلائیں۔

''ہماری بیٹی کیوں ہوتی۔ پتا نہیں اس کی ماں کس کے گناہ کا بوجھ اٹھا کر لے آئی تھی۔ کیا کچھ نہ کیا ہم نے اس لڑکی کے لیے' مگر اس احسان فراموش کو حیا نہ آئی۔ بیچ بازار میں ہماری عزت کا جنازہ اٹھا دیا۔ کیا کچھ نہ باتیں کریں گے لوگ' ہماری بیٹی ہوتی تو اسے ہماری عزت کا پاس ہوتا۔ گندا خون تھا نا' گندا ہی رہا ورنہ کوئی عزت دار لڑکی اپنی عزت کا سودا نہیں کرتی۔''

''دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے اور اب اپنی منحوس صورت مت دکھانا مجھے کبھی' مر گئی میں تیرے لیے اور تُو میرے لیے۔'' بڑی اماں نے نفرت سے کہا۔

میں نیل و نیل جسم کو گھسیٹتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ دماغ میں سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا' وہ سب' جو میں نے ابھی تھوڑی دیر قبل سنا تھا' وہ سب جو مجھ پر بیتا تھا' وہ سب جو بیتنا باقی تھا' بس ایک بات یاد تھی' بڑی اماں کے الفاظ۔

''میں اس گھر کو پھر سے جوڑنا چاہتی ہوں' ٹوٹتے ہوئے رشتوں کو ایک لڑی میں پرونا چاہتی ہوں' بس میری آخری خواہش ہے کہ تم سب مل جل کر رہو۔''

مجھے کوئی ہزار احسان فراموش کہتا مگر میں اتنی احسان فراموش بھی نہیں تھی کہ بڑی اماں کی آخری خواہش کی راہ میں حائل ہو جاتی۔ وہ جن کے دل میں حسرت تھی کہ راشد انکل پھر بہن بھائیوں میں آملیں' اور پھر میرا کیا تھا' میں سہیل کا نام لے دیتی تب بھی کیا اس نے مان جانا تھا؟ نہیں وہ تو خاندانی تھا اعلیٰ خاندان اور نسل کا خون اس کی رگوں میں گردش کر رہا تھا۔ اسے میرا بنا ہوتا تو اس روز تاریک سڑک کے کنارے' برستی بارش کے دوران مجھے اس کا انتظار نہ کرنا پڑتا' نہ وہ میری ہتھیلی پر سو روپے رکھ کر مجھے طوائف کی سطح پر اتارتا۔ طریقہ واردات مختلف تھا' لیکن اس نے جو حاصل کرنا تھا' کر لیا اب اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ ایک بے نشان لڑکی کو اپناتا' سب کے سامنے سینہ ٹھونک کر کہتا کہ ہاں میں اس کے ہونے والے بچے کا باپ ہوں۔ میں اس کا نام لے لیتی تو ایک جانب اپنے محسنوں کو مزید دکھ اور کرب میں مبتلا کر دیتی اور دوسری طرف احسان فراموشی کا ایک اور تمغہ سجا لیتی۔ کوئی چاہے دل میں مان لیتا لیکن اوپر سے کون تسلیم کرتا کہ اس فعل میں ایک اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ بھی ملوث تھا۔ میں ہی جھوٹی سمجھی جاتی' جھوٹی اور احسان فراموش۔

رات بھر میں یونہی بیٹھی رہی' سوچتی رہی۔ رات بھیگنے سے پہلے پہلے میری سماعت میں اور کتنے الفاظ اترے تھے۔

''اب یہ لڑکی یہ نہ سمجھے کہ جیسے اسے پالا پوسا تھا ویسے ہی اس کی ناجائز اولاد کو بھی اس گھر میں پالا پوسا جائے گا۔ زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر بیٹھے ہیں اور آج اس کے لیے سر پکڑ کر رو رہے ہیں۔'' چھوٹی امی کی آواز تھی۔

اور کل ارسلان بھائی کو بھی آ جانا تھا چنانچہ ان کی بیگم بھی سسرال آ گئی تھیں۔ وہ کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔

''ارے ہماری کون سنتا ہے اس گھر میں' سب ارسطو' افلاطون ہیں یہاں' میں تو کہتی تھی کہ اسے اس کی حیثیت سے بڑھ کر نہ دیں' مگر کسی نے سنی میری؟ الٹا اس لڑکی کے پیچھے بے عزتی ہوتی رہی۔ اسی خاندان کا رواج ہے یہ کہ بے ننگ و نام لوگوں کو سر پر بٹھایا جائے' انہیں سونے کے زیورات تک بانٹے جائیں ہم نے تو اور کہیں نہیں دیکھا یہ سب' آج پھر روتے

کیوں ہیں' میں تو پہلے دن سے جانتی تھی کہ ایسا ہی ہوگا جو ماں نے گل کھلایا' وہی بیٹی نے بھی کھلانا تھا۔ وہ بھلا کیوں پیچھے رہتی۔''

''کوئی شرم حیا نہیں اس لڑکی میں۔'' تھوڑی دیر بعد چھوٹی اماں کی آواز سنائی دی۔ ''ڈوب نہ مری یہ بتانے سے پہلے' میں تو حیران ہوں کیسے مزے سے اپنی بے حیائی کی داستان سنانے لگی کیا کیا نہ کیا تھا اس لڑکی کے لیے' میں تو کہتی ہوں اس دن ارسلان کے پیسے اور گھڑی بھی اسی نے چرائی ہوگی۔''

میں پتھر کے مجسمے کی طرح بیٹھی سب کچھ سنتی رہی' وہ بھی جو کہا گیا اور وہ بھی جو نہیں کہا گیا۔ میرے ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا' لیکن سوچ کہیں ایک نکتے پر مرتکز نہیں تھی۔ سب سو گئے تھے پھر بھی مجھے لگ رہا تھا' جیسے سب جاگے ہوئے ہوں۔ سب چپ تھے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ سب متکلم تھے۔ میں بیٹھی رہی' بیٹھی رہی یہاں تک کہ صبح کا نور رات کی تاریکی پر چھانے لگا۔ مشینی انداز میں' میں اٹھی اور اپنی میز کی دراز سے کتابوں تلے رکھے سو روپے کے نوٹ کے پرزے نکال کر جوڑنے لگی۔ یہ نوٹ مجھے سہیل نے دیا تھا۔ ٹیپ سے اسے جوڑتے ہوئے میرے ذہن میں اپنی اور اس کی ملاقات تمام تر جزئیات کے ساتھ روشن ہو گئی تھی۔

اس لمحے مجھ پر انکشاف ہوا کہ دھوکا اور فریب کسے کہتے ہیں' جھوٹ کیا ہوتا ہے اور میرے جیسی لڑکی کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ میں بک گئی تھی' اپنا سودا کر لیا تھا میں نے یہ عوض سو روپے سکہ رائج الوقت۔ میں معزز تھی یا نہیں' لیکن یہ دھبہ میرے ماتھے پر نہیں تھا جو سو روپے تھما کر وہ لگا گیا تھا۔ اس لمحے سے میں عصمت فروش بن گئی تھی۔ سو روپے کے عوض میں نے اپنی معصومیت' اپنا کنوارپن اور اپنی عزت بیچ دی تھی۔

اسی گیلی سڑک پر گر کر روتے ہوئے مٹھی میں دبا وہ سو روپیہ میں نے پرزے پرزے کر دیا تھا۔ میں اپنے آپ میں نہیں تھی۔ جب اپنے کمرے میں پہنچ کر کچھ ہوش آیا تو وہ پرزے میرے ہاتھ میں ہی تھے اس منحوس لمحے کی یادگار کے طور پر' اور وہ میرے پاس ہی رہے۔

آج جب میں بے بس تھی' بے ٹھکانہ تھی' بے یار و مددگار تھی تو میں نے سرخ کاغذ کے وہ پرزے جوڑ لیے تھے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ میں بک چکی تھی۔ یہ روپے میری ضرورت تھے۔ اب

سے پہلے میں نے انہیں عبرت کی نشانی کے طور پر محفوظ رکھا تھا' آج اپنی جسمانی ضروریات کے لیے انہیں استعمال کرنے لگی تھی۔ زندگی نے مجھے جو سبق دیا تھا۔ میں اسے یاد کر لینا' سیکھ لینا چاہتی تھی۔ میرے جیسی لڑکی کے لیے یہ بہت مشکل تھا۔ مگر یہی حقیقت تھی۔

انہی کپڑوں کے اوپر چادر اوڑھ کر سہیل کی دی ہوئی سونے کی زنجیر' اپنی بالیاں' سو روپے اور ان کے اوپر چھٹیوں میں بڑی اماں سے ملے ہوئے چند روپے لے کر میں گھر سے نکل آئی یہاں میرا دانہ پانی ختم ہو چکا تھا۔

چلتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ کہاں جاؤں۔ ایک دم خیال آیا پروین ماسی' بس وہی آخری امید تھی۔ لاہور کی بس پر بیٹھ کر میں سوچنے لگی کہ کیا میں ماسی کو ڈھونڈ سکوں گی اور ڈھونڈ لیا تو کیا وہ مجھے اپنے گھر رکھنے پر تیار ہو جائے گی۔ ان سوالوں کے میرے پاس کوئی جواب نہیں تھے۔ بس ایک امید تھی' موہوم سی آس تھی۔

دورانِ سفر میں چہرہ چھپائے بیٹھی رہی' کسی سے بات تک نہ کی' بھوک پیاس سے بے حال ہوتی رہی مگر کچھ نہ کھایا پیا۔ اس وقت ایک ایک روپیہ میرے لیے اہم تھا۔ ایک پیسہ بھی میں فالتو خرچ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ نہ جانے کب کہاں ضرورت پیش آ جائے۔

اڈے پر اتر کر میں ویگن کی تلاش میں نکلی۔ ایک بات میں سمجھ چکی تھی۔ میں تنہا تھی' لاہور شہر کی بیشتر لڑکیاں ویگنوں پر تنہا سفر کرتی تھیں اور محفوظ رہتی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ وہ راستے پہچانتی تھیں' بااعتماد نظر آتی تھیں۔ میں راستے تو نہیں پہچانتی تھی مگر میری کوشش تھی کہ شکل سے چلنے پھرنے کے انداز سے میں بااعتماد نظر آؤں۔ اس طرح میں زیادہ پریشانی کے بغیر ماسی کے گھر تک پہنچ سکتی تھی۔ سو میں نے ایسا ہی انداز اپنا لیا جیسے میں شہر کے ایک ایک راستے سے واقف ہوں' جیسے یہیں کسی کالج یا اسکول کی طالبہ ہوں۔

مطلوبہ نمبر کی ویگن ملنے میں مجھے دقت نہ ہوئی اسٹاپ سے ماسی کا گھر دور نہیں تھا اور راستہ بھی آسان تھا۔ ہاں اس کچی آبادی میں بہت سے گھروں کے درمیان وہ ایک گھر ڈھونڈنے کے لیے مجھے ایک بچے سے پوچھنا پڑا۔

وہ ایک چھوٹا سا' غلیظ سا مکان تھا' جس کے گرد کیچڑ اور کچرا بکھرا ہوا تھا۔ دروازے کے سامنے ایک بوسیدہ سا ٹاٹ کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا' ماسی چھوٹے سے کچے صحن میں بیٹھی نلکے کے نیچے برتن دھو رہی تھی۔

''ماسی۔'' میں نے اسے آواز دی۔

اس نے حیرت سے دروازے کی طرف دیکھا۔

''آسیہ؟''

میں اندر آ گئی۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ بہت گرم جوشی سے ملی گھر والوں کی خیر و عافیت دریافت کی۔

ایک مرتبہ پھر میں ایک پناہ گاہ میں تھی اور میری فطری کمزوری مجھ پر غالب آ رہی تھی۔ میں بہادر نہیں تھی یہاں تک نقاب پہن کر آئی تھی۔ اب جب اس کی ضرورت ختم ہو گئی تو میرے اندر کی کمزور لڑکی باہر نکل آئی۔ ماسی مجھ سے گھر والوں کے متعلق پوچھ رہی تھی اور میرا دل بھر آ رہا تھا۔ وہ بھی کچھ مشکوک ہوتی جا رہی تھی۔

''دیکھ آسیہ! مجھے سچ سچ بتا دے کہ تُو اکیلی کیسے آ گئی بڑی اماں نے تجھے کسی کے بغیر اکیلی کیسے بھیج دیا۔''

میں پہلے سے زیادہ مضطرب ہو گئی۔ اپنی انگلیاں ایک دوسرے کے بیچ پھنسا کر بولی۔

''ماسی مجھے اپنے پاس رکھ لو میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔''

کتنی مشکلوں سے میں یہ بات کہہ پائی تھی' آنسو باہر نکلنے کو بیتاب تھے اور میں ان پر بند باندھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب پھر اسی کرب سے اپنے بک جانے کا اعتراف کرنا بہت اذیت ناک تھا۔

اب سے چند لمحے پہلے تک یوں لگ رہا تھا' جیسے ماسی میری مدد ضرور کرے گی اور اب اچانک ہی یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ میری روح کی غلاظت دیکھتے ہی مجھے دھکے مار کر اپنے گھر سے نکال دے گی۔ بڑی اماں کی طرح کہے گی۔

''دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے اور اپنی منحوس صورت مت دکھانا مجھے کبھی۔''

میری بات سن کر ماسی کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔

''ہیں' ہیں کیا بکواس کر رہی ہے۔ اتنے بڑے گھر میں مالکوں کی طرح نہ سہی لیکن رہ تو رہی تھی کسی نے تجھے نوکر بھی تو نہیں سمجھا' کیا کر کے نکلی ہے وہاں سے جلدی بتا میں کان سے پکڑ کر تجھے وہاں واپس چھوڑ آؤں گی۔''

''نہیں ماسی۔'' میں تقریباً چیخ پڑی۔ یہ ٹھکانہ بھی نہ رہتا تو میں کہاں جاتی؟ اب ضبط کا

یارا بھی نہیں رہا تھا۔ میں ایک دم رو پڑی۔

"میرا کوئی نہیں ہے نہ گھر بار نہ رشتہ دار' میں کیا کروں کہاں جاؤں۔"

ماسی بری طرح سے گھبرا گئی۔ "کیا کر کے آئی ہے وہاں' جلدی بتا۔"

یہ وہ سوال تھا جو مجھے توڑ پھوڑ دیتا تھا۔ میں آنکھیں بند کر لینا چاہتی تھی۔ جو ہو چکا اس سے نگاہیں چرا لینا چاہتی تھی۔ ان لمحوں کو اپنی زندگی سے مٹا دینا چاہتی تھی' مگر یہ کسی کے بس میں کہاں ہوتا ہے۔

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ماسی حقیقت جانتے ہی مجھے گھر سے نکال دے گی۔ مایوسی نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا سو روپے کا نوٹ اسے دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ نوٹ جس پر میرے بکنے کی داستان تحریر تھی' جس سے مجھے نفرت تھی' لیکن جو میرے جینے کا آسرا بن سکتا تھا۔ مجھے دو وقت کی بھوک سے بچا سکتا تھا۔ چند لمحوں کے لیے ہی سہی میں بھی اس کے عوض کسی کی ہمدردی خرید سکتی تھی۔ پیسہ بھی کتنا بے حس ہوتا ہے۔

"ماسی میرے پاس یہی ہے تم یہ رکھ لو لیکن مجھے اپنے پاس رہنے دو' بس چند ایک مہینے کے لیے پھر میں چلی جاؤں گی۔ میری آخری امید تم ہی ہو۔ تم نے بھی سہارا نہ دیا تو میں جان دے دوں گی۔ دریا میں کود جاؤں گی یا ریل کی پٹڑی پر لیٹ جاؤں گی تمہیں اللہ اور اس کے سچے نبی کا واسطہ۔" میں شدت کے ساتھ رو دی۔ مایوسی' بے چارگی' شکستگی اور منت میرے لفظوں اور آنسوؤں میں کتنا کچھ تھا۔

ماسی ہکا بکا سی میری صورت تکے جا رہی تھی میں وہ لڑکی تھی جو اس کے ہاتھوں میں پلی بڑھی تھی جس کی سادگی اور معصومیت کی مثالیں دی جاتی تھیں' جس پر فخر کیا جاتا تھا۔ آج وہی اتنے قبیح فعل میں ملوث ہو کر اس سے رحم اور احسان کی بھیک طلب کر رہی تھی۔

"آسیہ! یہ کیا کیا تُو نے' بد بخت' کم ذات' کوئی شرم حیا نہ آئی تجھے' کچھ خدا' رسول کا خوف نہ ہوا۔"

میں کس منہ سے اپنی صفائی پیش کرتی۔ کیا کہتی کہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ تھا۔ کیسے بتاتی کہ میں لٹیرے کو محبوب سمجھتی رہی اور اپنے ہاتھوں سے خود کو اجاڑ دیا۔ اپنے آنسوؤں کے سوا میرے پاس تھا ہی کیا۔

"اللہ تجھے غارت کرے' تجھے یہ بھی پاس نہ آیا کہ بڑی بیگم صاحبہ نے کیسے تجھے پالا پوسا تھا۔"

ماسی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے پیٹ ڈالتی۔ دیر تک وہ مجھے کوستی' طعنے دیتی رہی۔

کافی دیر تک میں یہ سب سنتی رہی پھر اپنے آنسو پونچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مرنا اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔ خودکشی حرام ہے تو کیا ہوا۔ جب ایک حرام چکھ لیا تو دوسرا چکھنے میں کیا حرج؟ اب مزید مجھ سے یہ سب نہیں جھیلا جاتا۔ یہ در چھوٹا تو بھی میرا ٹھکانا کوئی ایسی جگہ ہی بنے گی جہاں انسانیت اور شرافت کی دھجیاں بکھرتی ہوں گی۔ ایک مرتبہ تو جو ہوا وہ بے وقوفی' نادانی اور نادانستگی کی وجہ سے ہوا۔ یہاں سے نکل کر گناہ کی جو دلدل راستے میں آئے گی' اس میں مجھے جانتے بوجھتے اُترنا ہوگا جو مجھے منظور نہیں۔" میں نے سوچا۔

ماسی سے ایک بھی لفظ کہے بغیر میں نے چادر سر پر ڈالی اور باہر کی طرف چل دی۔

"کدھر دفع ہو رہی ہو اب۔" ماسی میرے پیچھے دوڑی آئی۔

آنسو پھر رواں ہو گئے۔ "خودکشی کرنے' اپنی جان دینے جا رہی ہوں۔ میرا کوئی نہیں ہے اس جہاں میں۔"

اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور اندر لاتے ہوئے بولی۔ "جان ہی دینی تھی تو پھر چلو بھر پانی لیتی اور اس میں ڈوب مرتی' چل اب اندر آ' باہر نکلے گی تو لوگ کتوں کی طرح تیرے پیچھے پڑیں گے' اب اندر مر' یوں تو تجھے نہیں جانے دے سکتی۔"

اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں میرے لیے رحم ڈالا اور وقتی طور پر میں بے ٹھکانا ہونے سے بچ گئی۔ وہ مجھے ہدایات دینے لگی۔

"دیکھ آسیہ! یہاں کسی سے زیادہ بات نہ کرنا اِدھر لوگوں کو دوسروں کی بہت کرید لگی رہتی ہے۔ میں کہہ دوں گی کہ تیرا سسرال میرے پرانے مالکوں کے گھر کے ساتھ تھا۔ گھر والا حادثے میں مر گیا تو سسرال والوں نے نکال دیا۔ ماں باپ پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ دنیا میں اب کوئی نہیں رہا' لاچار ہو کر میرے پاس آ گئی ہے۔"

میں خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اب تو ساری عمر جھوٹ ہی بولتے رہنا تھا۔

"مگر وہ کم ذات کون تھا' جس نے تیرے ساتھ منہ کالا کیا۔" ماسی کے ہونٹوں پر وہ سوال آ ہی گیا' جس کے لیے میں خود کو تیار کر رہی تھی۔

"ماسی! کم ذات تو ہم ہیں۔ میں اور تم۔ وہ تو بہت اونچے گھر کا تھا' اونچی ذات والا۔"

میری نگاہوں کے سامنے سہیل کا سراپا گھوم گیا۔

"تھا کون کچھ تو بتا۔ میں مالکوں کو بتاؤں گی۔ وہ ضرور تیری مدد کریں گے۔ دیکھ بڑی بیگم صاحبہ تجھے کتنا چاہتی ہیں۔"

"کچھ نہ پوچھنا ماسی' تجھے قرآن کی قسم ہے۔" میرے دل میں درد کی ٹیسیں اُٹھیں۔

"پھر یہ سوال مت پوچھنا۔ یوں بھی اب کیا رکھا ہے' میں ایسی نہیں تھی' جیسا اس نے مجھے بنا دیا۔ میں نے کب کسی کو جھوٹ بولتے سنا تھا۔ اس نے تو مجھے طوائف بنا دیا۔ دیکھو یہ سو روپیہ میری ہتھیلی پر رکھ گیا۔ میری معصومیت' میرے کنوار پن اور میری عزت کی قیمت کے طور پر۔" میرا ضبط پھر جواب دے گیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ماسی نے مجھ سے ہزار سوال کیے کہ میں اس شخص کا نام لے دوں جس نے مجھے اس حال تک پہنچا دیا تھا مگر میرے ہونٹ سِلے رہے۔ میں احسان فراموش نہیں تھی کہ بڑی اماں کی زندگی کی آخری خواہش کی راہ میں رکاوٹ ڈالتی۔

صادق کام سے واپس آیا تو مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ بس سلام دعا کے بعد ہمیشہ کی طرح دور ہو بیٹھا۔ میرے اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے۔ وہ بھی ماسی کی طرح اس کے گھر کا ایک فرد تھا اور میرے وہاں رہنے یا نہ رہنے کے لیے اس کے رائے بھی ضروری تھی۔

رات کو ماسی نے اس کا بستر صحن میں لگایا اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ میں جانتی تھی کہ اس سے اجازت لینے کی خاطر اب ماسی کو میری یہاں موجودگی کا جواز بھی بتانا ہوگا۔ یوں بھی یہ کب ایسی بات تھی جو اس سے یا کسی سے بھی پوشیدہ رہ سکتی۔ میں چاہتی تھی کہ ان کی گفتگو سنوں۔ یہ میرے مستقبل کا معاملہ تھا۔ دوسری جانب ہمت بھی نہیں تھی۔ میری بدنامی کے چرچے ایک اور مرد کے کان میں بھی پہنچ رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ جس جھلنگا سی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی بغیر گوند کے اسی سے چپکی رہی۔ دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ عجیب کیفیت تھی۔ سب جاننا بھی چاہتی تھی اور مارے شرمندگی کے اُٹھ بھی نہیں پائی تھی۔

کتنی دیر تک باہر ماسی اُسے میرے متعلق بتاتی رہی۔ اس کی آواز مدھم تھی۔ میں لفظوں کو شناخت نہیں کر سکتی تھی بس مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح اس کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

پھر اچانک صادق کی آواز واضح طور پر میری سماعت سے ٹکرائی۔

"اماں! تم نے گندگی کی پوٹ اپنے گھر رکھ لی تاکہ یہاں نئے گل کھلائے' بے عزت کر کے نکلوائے گی ہمیں یہاں سے' پلس سے چھتر لگیں گے سو الگ' تمہیں کچھ تو عقل سے کام لینا چاہیے تھا۔" وہ بھڑک اُٹھا تھا۔

"ہاں اب میں تجھ ہی سے عقل سیکھوں گی' بیچاری سیدھی سادی لڑکی سے کسی نے زبردستی کر لی تو اس کا کیا قصور۔ انسان ہی انسان کا پردہ رکھتے ہیں۔"

"میں باز آیا ایسی انسانیت سے۔ کسی نے زبردستی کی یا خود چل کر گئی۔ ایک ہی بات ہے۔ غیرت نہ آئی اسے' وہیں مر نہ گئی یہ۔"

"ارے کیوں مرتی' اسے نہ غیرت آئی جس نے زبردستی کی اس کے ساتھ۔"

ماسی اور صادق کے درمیان دیر تک تُو تُو میں میں ہوتی رہی۔ میں کمرے میں بان کی چارپائی پر بیٹھی ساری بحث اس طرح سنتی رہی جیسے پھانسی پانے والا ملزم رحم کی آخری اپیل کا نتیجہ سنتا ہے۔ صادق کا پلا بھاری تھا۔ کچھ اس لیے کہ ماسی اسے بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی اور اس لیے بھی کہ اسے اپنی آواز کے والیوم کی پروا نہیں تھی۔

بالآخر ماسی نے آنکھوں میں آنسو بھر لیے۔

"یہ اس گھر میں نہیں رہے گی تو میں بھی نہیں رہوں گی' اپنا گھر خود سنبھالو۔" پھر وہ کمروں کی طرف منہ کر کے بولی۔

"چل آسیہ! ایک در بند ہو جائے تو خدا سو در کھولتا ہے۔ کہیں نہ کہیں ہمیں بھی سر چھپانے کا ٹھکانا مل ہی جائے گا۔ اب بھی میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنی جان ہے کہ لوگوں کے برتن مانجھ کر اپنا اور تیرا پیٹ پال سکوں۔ اللہ کبھی اولاد کا بھی محتاج نہ کرے کسی کو۔"

"اماں! اس کی وجہ سے تم گھر چھوڑ دو گی؟" صادق نے تعجب سے کہا۔

"مجھ سے بات نہ کر۔ میں نے تیری منت کی' تجھے سمجھایا' حکم دیا' پھر بھی تُو نہیں مانتا تو کون سی ماں' کیسی ماں؟"

میں کمرے کے دروازے کی چوکھٹ تھام کر کھڑی ہوگئی۔

"ماں اس سے کہہ دو اندر جائے' صرف تمہاری خاطر گندگی کی اس پوٹ کو برداشت کر رہا ہوں لیکن اس سے کہو کہ مجھے اپنی صورت نہ دکھائے۔ ایسی غلاظت میری برداشت سے

باہر ہے۔''

کیسے دل پر کچوکے لگے تھے یہ وہ شخص تھا جسے میں نے کبھی اپنے برابر بھی نہیں سمجھا تھا۔ آج میں اس کی جوتی کے نیچے تھی۔ کاش میں وہ لمحے اپنی زندگی کی کتاب سے پھاڑ کر پھینک سکتی، جنہوں نے مجھے اتنی پستی میں گرا دیا تھا۔

ماسی کب کہیں جا سکتی تھی یہ جو کچھ اس نے بیٹے کے سامنے کہا تھا۔ محض ایک دھمکی تھی۔ بیٹا اس دھمکی کے زیر اثر مان گیا تھا تو اسے اور کیا چاہیے تھا۔ اب وہ چاہے مجھے کچھ کہتا رہتا ماسی کو یہ تسلی تو تھی کہ میں بے ٹھکانا ہونے سے بچ گئی تھی۔

اس جانب سے بے فکر ہو کر ماسی نے اپنی توجہ دوسری جانب مبذول کی۔ اگلے ہی روز سے ایسی دائی کی تلاش شروع کر دی جو ایسے کیس کرتی ہو۔

تیسرے ہی دن وہ خیراں کے ساتھ گھر میں تھی۔ خیراں نے میرا معائنہ کیا اور نفی میں سر ہلایا۔

''بہت دیر ہو گئی ہے، اب بچہ ضائع تو نہیں ہو سکتا۔ لڑکی کی بھی ساتھ ہی جان جائے گی۔''

ماسی نے پوری کوشش کی کہ خیراں بچہ ضائع کرنے پر راضی ہو جائے مگر وہ نہ مانی۔

''نہ نہ پُلس کیس بن جائے گا۔ لڑکی مر جائے گی۔ جتنا تم مجھے دو گی، اس سے زیادہ مجھے پُلس کو دے کر جان چھڑانی پڑے گی۔''

''کس مصیبت میں تُو نے گرفتار کروا دیا آسیہ'' ماسی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''ارے تُو اس کی فکر نہ کر، لڑکی ہوئی تو میں لے لوں گی تیری آسیہ خالی ہاتھ یہاں پہنچ جائے گی۔ ہاں لڑکا میرے کسی کام کا نہیں ہوگا۔'' خیراں بولی۔

میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ جس نے ابھی دن کا سورج بھی نہیں دیکھا تھا اس کی تقدیر کا فیصلہ، کتنی سنگدلی سے کیا جا رہا تھا۔

''میں کسی کو اپنا بچہ نہیں دوں گی، خواہ بیٹا ہو یا بیٹی۔'' خوف سے پیلے پڑتے چہرے کے ساتھ میں نے کہا۔

''کدھر سے کھلائے گی اسے۔ میں تو کہتی ہوں بیٹا ہوا تو کسی بے اولاد کو بیچ دینا، بس دیکھنا امیر لوگ ہوں، ساتھ کے ساتھ اور پیسے بھی نکلواتی رہنا ان کے کھیسے سے۔ بیٹی ہوئی تو

میں رکھ لوں گی۔ پھر میں جانوں اور میرا کام۔''

''تم..... تم!'' میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا منہ نوچ لیتی۔

''کتنی گھٹیا عورت ہو تم، دفع ہو جاؤ، میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔''

''ارے واہ نخرے تو دیکھو۔ میں گھٹیا ہوں تو تم بھی دودھ سے نہائی ہوئی نہیں ہو۔ بڑی آئی مجھے گھٹیا کہنے والی۔ میرا کیا ہے لیے پھرنا اپنے ساتھ ایک دُم چھلا، لیکن بتائے دے رہی ہوں تم جیسی ہزاروں لڑکیاں میرے پاس آ چکی ہیں، جو لاوارث نہیں تھیں، ان میں سے بھی آدھی سے زیادہ کوٹھوں پر ہی پہنچی تھیں بالآخر اپنے بچوں کے ساتھ۔ تُو تو پھر لاوارث ہے نہ آگے نہ پیچھے کوئی، تُو کہاں جائے گی؟''

''ماسی!'' میں نے سہارے کی خاطر اس کی طرف دیکھا۔ شرمندگی اور اپنی روح کی پستی پر میری آنکھوں میں پھر آنسو اُمڈ آئے۔

''تُو اپنی بکواس بند کر آسیہ! مجھے بات کرنے دے۔'' ماسی نے مجھے جھڑک دیا پھر خیراں سے بولی۔

''وہ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی تُو پہلے وقت نبھا جا۔''

اس کے جانے کے بعد میں ماسی سے لپٹ کر رو پڑی۔ ''ماسی! میں خیراں کو اپنی بیٹی نہیں دوں گی۔ یہ عورت تو اسے بیچ دے گی۔ پتا نہیں کیا ہوگا میرے بچے کا، میں کسی کو نہیں دوں گی اپنا بچہ اپنے ہاتھ سے اس کا گلا دبا دوں گی، لیکن اسے کسی ایسی راہ پر نہیں چلنے دوں گی۔''

''اللہ بہتر کرے گا۔ اب دیکھ ناں تُو بھی اتنی کم عمر ہے اس مصیبت سے چھٹکارا ملے تو میں کہیں تجھے بیاہنے کی فکر کروں۔ بچہ ساتھ ہوگا تو سب اس کے باپ کے بارے میں پوچھیں گے۔ تُو کیسی بھی حسین سہی، کم عمر سہی پر ایک بچے، وہ بھی ایسے بچے کے ساتھ جس کے باپ کا بھی کسی کو پتا نہیں، کیسے کوئی تجھ سے شادی کرے گا۔''

''میں شادی نہیں کروں گی۔ نفرت ہے مجھے اس لفظ سے۔ میں محنت مزدوری کر کے اپنے بچے کا پیٹ پال لوں گی لیکن کسی کو اسے ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔''

''جھلی ہے تُو ابھی دنیا دیکھی نہیں ہے تُو نے، یہ لوگ تجھے بیچ کھائیں گے اور تجھے خبر نہیں ہوگی۔ اتنا آسان نہیں ہے محنت مزدوری کرنا۔ باہر نکلے گی تو لوگ ایسے تیری طرف

لپکیں گے جیسے کتے ہڈی کی طرف بڑھتے ہیں۔ یہ تو ان لڑکیوں کو نہیں بخشتے جن کے باپ بھائی ہوتے ہیں تو تجھ جیسی کو کوئی کہاں چھوڑے گا۔ مرد ہو تو تحفظ ملتا ہے کوئی تیرے سر پر دوپٹا ڈالے گا تو لوگ عزت کریں گے۔ شادی کر کے گھر کی چار دیواری میں رہے گی تو عزت اور جان سلامت رہے گی۔'' ماسی کا انداز سمجھانے والا تھا۔

''خود محفوظ ہو جاؤں اور بچے کو رُلنے کے لیے چھوڑ دوں۔ بیٹی ہو تو اسے کسی کوٹھے کی زینت بنا دوں۔ یہ میں نہیں کر سکتی۔''

''رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یا تو تجھے اسے مار کر کہیں پھینکنا ہوگا یا پھر کسی کو دے دینا ہوگا۔ جب ایک قدم غلط اُٹھ جائے تو راستہ ہی بدل جاتا ہے۔ کانٹے تو چبھتے ہیں۔ افسوس کہ یہ احساس بعد میں ہوتا ہے۔ بچہ تیرے ساتھ رہا تو دونوں سکھی نہیں رہیں گے دوسری صورت میں تُو تو سکون سے رہ سکتی ہے۔''

''کبھی نہیں۔ میں اپنے بچے کو خود سے جدا نہیں کر سکتی۔'' میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ماسی مجھے روتا ہوا چھوڑ کر گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی اور میرے دل میں پہلے سے بھی بڑھ کر خوف چھوڑ گئی۔

ماسی میرے آرام اور کھانے پینے کا خیال رکھنے لگی تھی، لیکن وہ خود غریب عورت تھی کہاں تک کر سکتی تھی پھر صادق کا مزاج بھی ہر وقت بگڑا رہتا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ اس نے کبھی میرے ساتھ ایک لمحے کے لیے بھی اچھا سلوک کیا ہو۔ اس کا رویہ انتہائی اہانت آمیز ہوا کرتا تھا۔ بلا وجہ مجھے گالیاں دے دیا کرتا تھا۔ ماسی کبھی اسے ٹوک بھی دیتی تھی، ورنہ شرمندہ ہو جاتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میری دلجوئی کیا کرتی تھی۔ اس عورت کے احسان میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اس نے اس وقت میری مدد کی تھی۔ جب میرے سر پر کوئی سایہ نہیں تھا اور خود ماسی کے پاس بھی کچھ نہیں تھا۔ وہ اپنی غربت میں بھی فیاض تھی۔

میں ایسے مقام پر تھی کہ اگر صادق گالیاں دینے کے بجائے مجھ پر ہاتھ اُٹھا لیتا تب بھی مجھے خاموشی سے برداشت کرنا پڑتا کہ یہی میرا آخری ٹھکانا تھا اور میری پناہ گاہ تھی۔ یہ نہیں کہ مجھے صادق پر غصہ نہیں آتا تھا میں تو بلکہ اس سے نفرت محسوس کرنے لگی تھی، لیکن مجھے اس گھر کی ضرورت تھی اور یہ گھر اس کا تھا۔

دن بھر ماسی کے منع کرنے کے باوجود میں گھر کے کاموں میں خود کو مصروف رکھتی تھی اور رات کو جب تھک ٹوٹ کر بستر پر لیٹتی تو کتنے ہی خوف مجھے گھیرتے تھے۔ سب سے بڑھ کر اپنے بچے کے مستقبل کا خوف۔

وقت بیت رہا تھا میں ہر قسم کی ذلت کی عادی ہو رہی تھی۔ خیراں آتی تھی تو وہ کتنی باتیں سنا جاتی تھی۔ صادق کا تو معمول یہی تھا کہ مجھے میرے منہ پر ذلیل کرتا رہے۔ پھر انہی دنوں ماسی نے صادق کے رشتے کی بات شروع کر دی۔ یہ خود صادق کی بھی خواہش تھی، جس روز اس کا رشتہ طے ہوا، اسی دن اس نے ماسی سے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

''اب گندگی کی اس پوٹ کو گھر سے چلتا کرو۔ اب اس گھر میں ایک عزت دار شریف لڑکی آ رہی ہے۔ میں تو اپنی بیوی پر اس کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔''

ماسی نے احتجاج کیا۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے، اب تو اس کے آخری دن میں بچہ ہونے والا ہے، ایسے میں بیچاری کہاں جائے گی؟''

''ہم نے ٹھیکہ لیا ہوا ہے کیا؟ جس کا گناہ اٹھائے پھر رہی ہے اسی کے پاس جائے۔''

دونوں میں پھر جھگڑا ہو گیا۔ ماسی نے پھر بہت سے جذباتی وار کیے، لیکن اب کے صادق بھی اکڑ گیا تھا۔ انجام کار ماسی کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑے۔

''دو ایک روز ٹھہر جا، میں کہیں غریب کا انتظام کر لوں، ایسے دھکا تو نہیں دے سکتی۔''

بالآخر ماسی نے خیراں کو ہی راضی کیا کہ وہ وقتی طور پر مجھے اپنے پاس رکھ لے۔ خیراں کھل اُٹھی، لیکن کاروبار کی پکی تھی مجھے اپنے گھر رکھنے اور کھلانے پلانے کے الگ سے پیسے کھرے کیے۔

''بہت برا ہوا آسیہ، لیکن میں مجبور ہوں، اب تجھے اور نہیں رکھ سکتی، کوشش کروں گی کہ صادق کو راضی کر لوں، لیکن مرد ذات کی ضد ہے، اب تو اسی کے آسرے پر پڑی ہوں، پھر میرا اکلوتا بیٹا ہے کیا کروں، میں پتا کرنے آتی رہوں گی۔''

میں اس کے گلے لگ کر رو پڑی۔

''ماسی میں تو بالکل برباد ہو گئی۔ کاش میرا بھی کوئی ہوتا اس دنیا میں۔''

''بس اللہ سے مدد مانگ، اسی سے معافی مانگ وہ بہت رحیم و کریم ہے، جس کا کوئی نہیں

ہوتا اس کا اللہ ہوتا ہے۔ اس سے دعا کر تیری آزمائش ختم ہو تیری اولاد کو اگر دن کی روشنی دیکھنی ہے تو اسے نیک بنائے' اچھی زندگی دے۔'' وہ مجھے سمجھاتی اور چپ کراتی رہی۔

''ماسی میرے لیے اتنا کچھ کیا تم نے' میں کبھی یہ احسان نہیں بھول سکتی۔ میرے پاس تو کچھ ہے بھی نہیں لوٹانے کے لیے۔ ہاں یہ گلے کی چین ہے تم رکھ لو اتنا خرچ کیا ہے تم نے مجھ پر۔ اب بھی خیراں اتنے پیسے اینٹھ گئی ہے۔'' میں نے سہیل کی دی ہوئی زنجیر اس کی طرف بڑھائی۔

''یہ کیا کر رہی ہے؟'' اس نے میرا ہاتھ پرے کیا۔ ''میں تیری ماں نہیں ہوں' لیکن تجھے میں نے بھی پالا ہے۔ کیا کوئی ماں اپنی بیٹی سے پیسے وصولتی اچھی لگتی ہے۔ یہ رکھ لے اپنے پاس' تیرے کام آئے گی اور سن خیراں کو اس کی بھنک بھی نہ پڑنے دینا۔ کسی بہانے یہ بھی نکلوا لے گی تجھ سے۔ اس نے جتنے پیسے مانگے تھے اس میں سے آدھے میں دے چکی ہوں بقایا کیس ہونے کے بعد دوں گی' وہ تجھ سے کتنے بھی پیسے مانگنے کی کوشش کرے خبردار اسے ایک دھیلا بھی نہ دینا بہت لالچی عورت ہے وہ۔''

خوب سمجھا بجھا کر ماسی نے مجھے خیراں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ وہ کرشن نگر کے ایک پکے مکان میں رہتی تھی۔ نیچے کا حصہ اس کے پاس تھا اور اوپر کا کرائے پر دیا ہوا تھا' جہاں وہ رہتی تھی۔ وہاں تین کمرے تھے اور ایک ڈرائنگ اور ڈائننگ روم اکٹھا تھا۔ دو کمرے بطور خواب گاہ استعمال ہوتے تھے جبکہ ایک میں ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ سبھی کمرے چھوٹے اور گھٹن زدہ تھے۔ مکان بے شک پکا تھا اور جدید گھروں کی طرح اس میں ڈرائنگ اور ڈائننگ روم بھی تھے' لیکن وہاں کے باسیوں کو رہنے سہنے کا سلیقہ نہیں تھا۔ پورے گھر میں گھٹیا قسم کا سستا سا فرنیچر تھا جو ہمیشہ بے ترتیبی کا شکار رہتا تھا۔ کوئی چیز اپنے درست مقام پر نظر نہیں آتی تھی۔ کھائے ہوئے پھلوں کے چھلکے کہیں بستر پر' کہیں فرش پر بکھرے رہتے تھے۔ میلے کپڑے یہاں وہاں ڈھیر رہتے تھے۔ چائے کی پیالیاں اکثر ٹی وی کے اوپر دکھائی دیتی تھیں۔ بستروں کی چادریں میلی رہتی تھیں جن کا کوئی کونا فرش پر لٹک رہا ہوتا تھا اور کوئی بستر کے سرے پر پہنچا ہوتا تھا۔ فرش پر آنے جانے والوں کے جوتوں کے ساتھ مٹی چر چر کرتی رہتی تھی۔ کچن میں استعمال شدہ برتنوں کے ڈھیر پر مکھیاں بھنبھناتی رہتی تھیں۔ اندر جگہ ہونے کے باوجود برتن باہر بنی چھوٹی سی جگہ میں ہی دھلتے تھے جو پانی اور مٹی کی وجہ سے ہر وقت کیچڑ زدہ سی رہتی تھی۔

اس گھر کو دیکھ کر میری طبیعت خراب ہونے لگی تھی۔ بات یہاں تک رہتی تب بھی برداشت کرنا آسان تھا۔ اس گھر میں بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ خیراں کا سارا میکہ ہی وہاں آباد تھا۔ کافی سارے جوان لڑکے بھی تھے جو گھر کے ہر کونے میں دندناتے پھرتے تھے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان میں سے کون کون مستقلاً وہاں رہائش پذیر تھا اور کون ملنے کی خاطر آتا تھا اس لیے کہ کبھی ان میں سے کوئی دن بھر کسی بستر پر پڑا سوتا یا گانے سنتا رہتا اور رات کو غائب ہو جاتا۔ جو ایک رات گھر میں گزارتے' ان میں سے بیشتر اگلی رات گھر پر نہیں ہوتے تھے۔ یہ لڑکے میری پریشانی کی سب سے بڑی وجہ تھے۔

گھر میں سارا وقت ٹیپ ریکارڈر پر اونچی آواز سے گانے بجتے رہتے تھے۔ بہت احسان ہوتا تو اذان کے وقت کوئی بٹن دبا کر ٹیپ بند کر دیتا۔ جس کمرے میں میں ہوتی وہاں لڑکوں کا آنا جانا کچھ زیادہ ہی ہوتا۔ بڑھے ہوئے بال' شوخ کپڑے' تیز خوشبو' لوفرانہ انداز۔ میری ذہنی اذیت میں پل پل اضافہ کرتا تھا۔ آتے جاتے وہ کوئی نہ کوئی فقرہ اچھال جاتے۔ کبھی بظاہر بے خیالی میں میرے دوپٹے کا کونا پکڑ لیتے۔ میری حالت رونے والی ہو جاتی۔ ڈلیوری کے دن قریب آ رہے تھے۔ کبھی تکلیف ہوتی تو میں منہ سے آواز تک نہ نکال پاتی' لیٹنے کو دل چاہتا تو لیٹ نہیں سکتی تھی۔ ایک دن خیراں سے غصے میں کہہ ہی دیا۔

''یہ کیا طریقہ ہے' جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آ رہا ہوتا ہے۔ ان لڑکوں کو منع کرو' میرے کمرے میں نہ آیا کریں۔''

''واہ رے تیرے نخرے' یہاں کیوں پڑی ہے کسی بڑی ڈاکٹرانی کے کلینک میں کیوں نہیں داخل ہو جاتی' یہاں تو ایسے ہی ہے۔ ایک تو رہنے کو جگہ دی ہوئی ہے' بیٹھے بیٹھے کھانے کو مل رہا ہے اوپر سے بیگم صاحبہ کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔''

میں تاؤ کھا کر رہ گئی۔

ماسی آئی تو میں رو پڑی۔

''ماسی! مجھ سے یہاں نہیں رہا جاتا۔ ٹھیک ہے میں برقعہ نہیں اوڑھتی مگر ایسی بے پردگی مجھے گوارا نہیں ہے۔''

''مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔'' وہ بے چارگی سے بولی۔ ''میں اب بھی صادق کو راضی کر رہی ہوں مانے تو بات ہے۔ اس کے علاوہ کہاں لے جاؤں تمہیں۔ ہر جگہ ایسے ہی ہے غیر

قانونی کام کر رہی ہیں عورتیں' تو کسی ایک قانون کو توڑنے پر تو بس نہیں کریں گی۔ پیسہ کمانے کو ہزار غلط دھندے کرتی ہیں۔ کسی بڑی جگہ لے جاؤں تو پولیس پکڑ لے گی۔ صادق بتا رہا تھا کہ کتنی عورتیں جیل میں سڑ رہی ہیں۔ بس چند دن کسی طرح گزار لو میں پھر کہیں پر کوشش کرتی ہوں۔''

''میرے لیے ایک ایک لمحہ عذاب ہے' اب تکلیف شروع ہو گی تو کیا کروں گی' اتنے مرد اتنے لڑکے ہیں اس گھر میں سب کی نظر میں تماشا بن جاؤں گی۔'' میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''صبر کرو' اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔'' اس نے مجھے خود سے لپٹا لیا اور چپ کرانے لگی۔

میں جانتی تھی کہ اس کے ہاتھ میں بھی کچھ نہیں تھا وہ میرے اخراجات ادا کر رہی تھی' مجھے دیکھنے آ رہی تھی تو یہ بھی اس کا احسان تھا۔ جاتے جاتے ماسی البتہ خیراں کے ساتھ خوب تُو تُو مَیں مَیں کر کے گئی۔

''مانا تمہارا گھر ہے' مگر اڈا بنا ہوا ہے۔ میں نے تمہیں پیسے دیئے ہوئے ہیں تو کس لیے؟ تا کہ بچی سکون سے یہاں رہے' یہاں تو اُلٹا ایک میلہ لگا ہوا ہے نہ وہ بیچاری لیٹ سکتی ہے نہ بیٹھ سکتی ہے' یہ طریقہ نہیں چلے گا۔''

''اتنے پیسوں میں ہوٹل کا کمرا تو ملنے سے رہا۔ ایسی ہی جگہ مل سکتی ہے۔ ہاں کچھ پیسے میں کچھ اور مال ہو تو نکالو میں کمرا علیحدہ کر دوں گی۔ یہ وارا نہیں کھاتا تو لڑکی کو لے جاؤ اور کہیں اور اس کا کیس کروالو۔ تمہاری تو لڑکی کے بہت نخرے ہیں' خود کو شہزادی سمجھتی ہے' بیٹھتی ہے تو ناک پر دوپٹا رکھ کر۔ اسے کسی محل میں لے جاؤ' ہم غریبوں کے گھر تو یہی بدبو ملے گی۔ اتنے ٹبر میں یہ تو ممکن نہیں کہ میں شہزادی صاحبہ کو الگ کمرے میں رکھوں۔''

دونوں میں دیر تک تکرار ہوتی رہی۔ میں ان حالات اور رویوں میں گھٹنوں گھٹنوں تک دفن ہو گئی تھی جن سے مجھے انتہائی نفرت تھی۔

اُس روز مجھے تکلیف شروع ہوئی تو مجھ پر احسان کرتے ہوئے خیراں نے لڑکوں اور مردوں کو گھر سے باہر بھیج دیا۔ تکلیف کے ساتھ مجھے شدید قسم کا ڈپریشن بھی تھا۔ کبوتر کب تک آنکھیں بند رکھ سکتا ہے بالآخر جب بلی دبوچ لیتی ہے تو وہ بھی بلبلا کر آنکھیں ضرور کھولتا

ہو گا۔ سو اب جب وقت آیا تو اپنی اولاد اور اس کے متعلق سوچتے ہوئے میں شدید ترین مایوسی کا شکار تھی۔ میں خود تو رُل چکی تھی۔ پستی اور ذلت کی وہ کوئی انتہا نہیں تھی جس کا ذائقہ میں نے نہ چکھا ہو لیکن اپنی اولاد کو میں ہر طرح سے محفوظ دیکھنا چاہتی تھی اور یہ میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ یہ سوچ مجھے مارے ڈال رہی تھی کہ میری اولاد جسے تھوڑی دیر بعد اس دنیا میں آ جانا تھا اسے میرے ساتھ میرے مستقبل میں شریک ہونا تھا۔

شام ڈھلے ماسی آئی۔ وہ کچھ اُلجھی اُلجھی سی تھی' لیکن میرے پاس اس پر توجہ دینے کا وقت کہاں تھا۔

''بس آسیہ' ذرا سا مشکل وقت ہے' ہمت سے کام لینا'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر تسلی دی۔

''ماسی! میرے بچے کا کیا ہو گا؟ میں اب مزید زندہ نہیں رہنا چاہتی' اتنی ذلت مجھے گوارا نہیں ہے میں مر جانا چاہتی ہوں۔ تم میرے بچے کو بچا لینا۔ تمہیں اللہ کا واسطہ۔ میں نے بہت دُکھ اُٹھائے ہیں۔ مجھ میں اور ہمت نہیں ہے۔ بس میرے بچے کو بچا لینا۔'' میں تڑپ تڑپ کر رو پڑی۔

وہ مجھے تسلی دیتی رہی۔ ''اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے ناں تمہارا' تو مان لو وہ سب سے زیادہ حکمت والا ہے۔ ان شاء اللہ وہی تمہارے دُکھ ختم کرے گا اور رہی تمہارے بچے کو محفوظ کرے گا۔ بس اس اوپر والے کو مدد کے لیے پکارو۔''

مگر میں روتی تڑپتی رہی۔ ''میرے بچے کا کیا بنے گا؟'' میرا رواں رواں مجھ سے سوال کر رہا تھا۔

پھر رات گئے وہ وقت بھی آن پہنچا جب میں نے پیاری سی بیٹی کو جنم دیا۔ اس کا رُوئی کے گالوں جیسا نرم' گورا' ننھا منا سا بے لباس وجود میرے سامنے تھا اور مجھے اپنا سانس بند ہوتا لگ رہا تھا۔

''بیٹی!'' میں نے جیسے سرگوشی میں خود سے کہا اور تڑپ تڑپ کر رو پڑی۔ ''کیوں آئی یہ اس دنیا میں۔ پہلے میری ماں' پھر میں اور اب یہ۔ نہیں۔ میں اسے مار دوں گی یہ بھی ذلت کی اسی پستی میں گرے گی جس میں میری ماں گری تھی' جس میں مَیں گری ہوں۔ ماسی اس کا گلا گھونٹ دو۔ اسے مار دو۔'' چارپائی کی پٹی سے پاگلوں کی طرح میں اپنا سر ٹکرا رہی تھی۔

ماسی نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ ''آسیہ' ہوش میں آؤ۔''

کافی دیر بعد جب میری کیفیت کچھ سنبھلی تو ماسی نے آہستہ سے کہا۔

''آسیہ! ایک بے اولاد جوڑا ہے۔ بہت بڑے افسر ہیں صاحب۔ وہ بچی گود لینا چاہتے ہیں۔ بہت اچھے اور امیر لوگ ہیں اور بہت خدا ترس بھی۔ زبردستی نہیں ہے لیکن تم چاہو تو اپنی بیٹی ان کو دے دو۔ کم از کم وہ در بدر نہیں ہوگی۔ بے آسرا اور بے یارو مددگار نہیں رہے گی پڑھے گی' لکھے گی۔ وہ اسے کبھی نہیں بتائیں گے کہ یہ ان کی اولاد نہیں ہے۔ اکلوتی بن کر رہے گی۔ تمام جائیداد کی وارث ہوگی۔ ان کی محبت کی حقدار۔ یوں بھی ان کی اولاد نہیں ہو سکتی۔ یہ خدشہ بھی نہیں کہ اولاد ہو گئی تو اس کے مقابلے میں یہ کمتر ہو جائے گی۔''

میں آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہی تھی مجھے لگا جیسے غیب سے مدد آئی ہو۔ میں نہیں جانتی تھی کہ جو کچھ ماسی نے بتایا' وہ درست تھا یا نہیں لیکن میں اس پر یقین کر لینا چاہتی تھی۔ ان کی خصوصیات اس سے آدھی ہوتیں تب بھی وہ میرے مقابلے میں میری بیٹی کی زیادہ بہتر پرورش کر سکتے تھے۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

ماسی منتظر نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

''میرے خیال میں یہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی ہے میں کہتی تھی ناں اس سے مانگو وہ ضرور دے گا۔''

ماسی کی بات سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ''اسے اسی وقت لے جاؤ ماسی! میں اس بچی پر اپنی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دینا چاہتی۔ میں اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔ کہیں میری بدنصیبی کا سایہ اس معصوم پر...... نہ پڑ جائے۔ تم اسے ابھی لے جاؤ۔'' میں پھر رو پڑی۔

''وہ کہہ رہے تھے کہ تم اس پر دستخط کر دو۔'' ماسی کے انداز میں تذبذب تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے کاغذ کے اس ٹکڑے کی طرف ہاتھ بڑھائے بغیر پوچھا۔

''پتا نہیں' میں کب پڑھنا جانتی ہوں۔''

میں نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور آنکھیں صاف کر کے تحریر پر نگاہیں جما دیں۔

''میں آسیہ' ولدیت نامعلوم' آج بارہ دسمبر 1980ء...... بقائمی ہوش و حواس اپنی

نومولود بچی جس کی ولدیت ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ اقبال حسن ولد احمد حسن کے حوالے کر رہی ہوں۔ اب اس بچی پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔ نہ ہی مستقبل میں اس سے کسی قسم کا واسطہ رکھوں گی۔''

نیچے گواہوں کے اور میرے دستخطوں کی جگہ تھی۔ تحریر پڑھ کر میری آنکھیں پھر بھر آئیں۔ اپنی بیٹی یوں کسی کے حوالے کر دینا کب آسان تھا لیکن یہ اسے مار کر کچرے کے ڈبے پر پھینک دینے کی نسبت بہتر ضرور تھا۔ دل میں ہزار ٹیسیں اٹھیں۔

آنسوؤں نے آنکھوں کو دھندلا دیا' سینے میں بے شمار چیخیں دفن کیں' دل پر پتھر رکھا اور اپنے دستخط کر دیئے۔

ماسی بچی کو لے جانے لگی تو میرا دل چاہا کہ اسے واپس بلا کر کم از کم ایک مرتبہ اسے پیار کر لوں۔ اپنے سینے سے بھینچ لوں کتنی مشکلوں سے خود پر قابو پایا یہ میں ہی جانتی ہوں۔

میری بچی بظاہر محفوظ ہو گئی تھی لیکن میری ذلتوں کا سفر تمام نہیں ہوا تھا۔

صادق کی شادی ہونے والی تھی اور ماسی کب تک اپنا گھر بار چھوڑ کر میری دیکھ بھال کر سکتی تھی۔ اپنی بیٹی کا نام دل ہی دل میں مَیں نے طیبہ رکھ لیا تھا۔ پاک صاف جیسے کیچڑ میں کنول۔ میں بہت گناہگار تھی لیکن ماں تھی۔ میرا رواں رواں ہمیشہ اس کی عزت و حرمت کی سلامتی کے لیے دعا گو رہا۔

طیبہ کی پیدائش کے تقریباً دو مہینے بعد خیراں ماتھے پر ڈھیر سارے بل ڈال کر آ گئی۔

''اب کہیں اپنا ٹھکانا کرو۔ تم تو یہاں پڑی ہی گئی ہو اور اوپر سے ایسا نخرا کہ ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتیں۔ تمہاری ماسی نے مجھے اتنے پیسے نہیں دیئے کہ ساری عمر تمہیں کھلاتی رہوں اور تمہاری باتیں بھی سنتی رہوں۔''

''مگر میں کہاں جاؤں گی؟ میرا تو اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔'' خوف نے پھر مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

''یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ ساری دنیا کھلی پڑی ہے۔ کہیں چلی جاؤ۔'' وہ بگڑ کر بولی۔

''مگر میرا تو اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔'' میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''تو یہ میرا قصور ہے؟''

قصور اس کا کب تھا۔ قصور تو سارا میرا تھا۔ کاش وہ لمحے میری زندگی میں نہ آئے ہوتے

جنہوں نے مجھے یوں دربدر کر دیا تھا۔ ان لمحوں کو یاد کر کے میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"اچھا بس کر۔ اب میرے سر پڑ گئی ہے تو میں ہی کچھ کروں مروں گی۔ پرسوں جب تیری ماسی آئی تھی۔ وہ بھی مجھ سے کہہ گئی تھی کہ یہ لڑکی تو میری جان کا عذاب ہو گئی ہے۔ اب تو میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ اس پر لٹاؤں۔ بیٹے کی شادی کرنی ہے۔ ایک ایک پیسے کی ضرورت ہے۔ اب میں مزید یہ جنجال نہیں پال سکتی۔ خیراں اب تم ہی اپنی مرضی سے کچھ کرو چاہو گھر سے نکال دو چاہو رکھ لو۔ میں اب یہ بوجھ نہیں اُٹھا سکتی۔"

اس کی بات سن کر میری ہچکیاں بندھ گئیں ماسی سے مجھے بہت امیدیں تھیں لیکن وہ اس سے زیادہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے زیادہ تو میرے لیے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

مگر یہ سوال بدستور قائم تھا۔ اب کیا ہو گا؟ میں کہاں جاؤں گی؟ خیراں کی بات سے کچھ آس تو بندھی تھی۔

"ایک بیگم صاحبہ ہے۔ کچھ واقفیت ہے اس سے میری' اسے اپنے کام کاج کے لیے ایک لڑکی کی ضرورت ہے بس کہتی ہے تھوڑی سی پڑھی لکھی ہو۔ رہنا اس کے ساتھ ہی ہو گا۔ کھانا' کپڑا مفت' اب تیری مرضی۔"

"میں...... میں تیار ہوں۔ میں سب کام جانتی ہوں۔ دسویں تک پڑھی ہوئی بھی ہوں۔ بہت اچھی اسٹوڈنٹ تھی میں اپنے اسکول کی۔ گھر کا ہر کام مجھے آتا ہے۔ سب کھانے پکا لیتی ہوں۔ سلائی' کٹائی' کڑھائی سب کاموں سے واقف ہوں۔ تم اس بیگم صاحبہ سے بات کر لو۔" ڈوبتا ہوا شخص اپنی جان بچانے کے لیے جیسے تنکے کو پکڑتا ہے ویسے...... ہی میں بھی اس موقعے کو ہاتھ سے نہیں نکلنے دینا چاہتی تھی۔ مجھے لگا جیسے یہیں میری بچت کا سامان ہو۔

"دیکھتی ہوں' کافی دن سے کہہ رکھا تھا مجھے بیگم نے۔ اب تک کوئی اور لڑکی ہی نہ رکھ لی ہو۔"

"تم پتا تو کرو۔ پلیز۔ اللہ تمہیں بہت اجر دے گا۔"

"ہم نے کون سے اجر والے کام کیے ہیں۔ جو وہ اجر دے گا۔ بس تیرا مسئلہ حل ہو جائے۔ خواہ مخواہ کا بوجھ سر پر آن پڑا ہے۔" کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

شام کو ہی ایک بنی سنوری بڑی عمر کی عورت آ گئی۔ میں چارپائی پر لیٹی چھت کو تکتے

ہوئے انہی باتوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"اُٹھ آسیہ...... بڑی بیگم صاحبہ آئی ہیں۔ سلام کر۔"

خیراں کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں اُٹھ بیٹھی۔ وہ جسے خیراں نے بیگم صاحبہ کہہ کر تعارف کروایا تھا میرا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور عورت بھی تھی۔ جو معاشی لحاظ سے اس سے قدرے کم لگ رہی تھی۔ وہ بھی بہت باریک بینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"بیٹھو بیگم صاحبہ۔" خیراں نے جلدی جلدی دوپٹے سے ایک کرسی صاف کی۔

بیگم صاحبہ نزاکت سے اپنے کپڑے بچاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی آسیہ۔"

"ماں باپ کہاں ہیں؟"

میں نے سر جھکا لیا۔ "وہ نہیں ہیں۔"

"کوئی یار دوست تو نہیں ہیں؟"

میرا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ مارے شرمندگی کے میں نے گردن جھکا لی اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"کتنا پڑھی ہوئی ہو؟"

"ابھی میٹرک میں گئی تھی۔ درمیان میں ہی پڑھائی چھوٹ گئی۔"

"انگریزی تو نہیں آتی تمہیں؟"

"لکھ لیتی ہوں بولنے کی جھجک ہے۔" میں نے سچ سچ کہہ دیا۔

"تمہیں اعتراض تو نہیں ہے اگر ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں؟"

"نہیں' بالکل نہیں۔ آپ جو چاہیں گی۔ میں مانوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" میں نے جلدی جلدی کہا۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "خیراں میرے ساتھ آؤ۔" کہہ کر باہر نکل گئی۔

اس کے پیچھے دوسری عورت اور خیراں بھی باہر نکل گئیں۔ میں امید وبیم کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ پتا نہیں وہ مجھ سے مطمئن ہوئی تھیں یا نہیں۔ کیا خبر وہ مجھے نوکری دیتی ہیں یا نہیں۔

چند منٹ بعد ہی خیراں روشن چہرہ لیے اندر آئی۔

"چلو بڑی بیگم بلا رہی ہیں۔"

میں یوں اُچھل کر کھڑی ہوگئی جیسے نیچے اسپرنگ لگے ہوں۔ اس گھر اور اس کے مکینوں سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ یہاں گزارا ہوا ایک ایک لمحہ میرے لیے عذاب تھا۔ اب جب سر چھپانے اور پیٹ کی آگ بجھانے کا آسرا ہوا تھا تو میں ایک لمحہ بھی یہاں نہیں رُکنا چاہتی تھی۔

اس تنگ سی گلی میں بیگم صاحبہ کی کار داخل نہیں ہوسکتی تھی لہٰذا ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی گلی کے سرے پر آگئی۔ باوردی ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور ہم اس بڑی سی کار میں سوار ہوگئے۔ بیگم صاحبہ کا رعب اتنا تھا کہ میں خود سے کوئی بات کرنے کی ہمت نہیں کرسکی۔ ان دونوں نے مجھے اپنے درمیان میں بٹھا رکھا تھا اور آپس میں انگریزی میں محوِ گفتگو تھیں۔

کافی سڑکوں سے ہوتے ہوئے بالآخر ہم گارڈن ٹاؤن کے ایک خوبصورت دو کنال پر پھیلے بنگلے میں پہنچ گئے۔ وہ نہایت شاندار مکان تھا۔ جدید طرز پر بنا ہوا۔ ڈرائیو وے پر پہلے سے چار کاریں کھڑی تھیں۔ لان میں سبز گھاس اور رنگا رنگ پھول تھے۔ مکان کی تین منزلیں تھیں ایک تہہ خانہ اس کے اوپر ایک منزل اور پھر سب سے اوپر ایک اور منزل اندر سے بھی گھر انتہائی خوبصورت تھا۔ آج سے پہلے میں نے ایسا سجا ہوا گھر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بڑی اماں والا گھر بھی سجا سجایا تھا مگر اس طرح نہیں۔

یہاں آ کر یہ احساس بہت شدت سے ہوا تھا کہ جہلم والے گھر میں گھریلو پن کی مہک رچی ہوئی تھی جبکہ اس گھر میں روپے پیسے کی مہک تھی۔ شاید اس احساس کی وجہ یہ تھی کہ بہت پیسہ ہونے کے باوجود بھی وہاں ایسی جدت نہیں تھی اور میں ویسے ہی گھر کی ہمیشہ سے عادی رہی تھی۔

اس گھر میں یہاں سے وہاں تک قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواریں بہترین لکڑی سے مزین تھیں۔ نیم برہنہ عورتوں کے مجسمے تھے۔ چمکتے شیشوں سے بنی سجاوٹی اشیاء تھیں۔ اندر داخل ہو کر ایک لمحے کے لیے میں ٹھٹک کر رہ گئی۔ مبہوت ہو کر گھر دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

''رک کیوں گئیں؟'' بیگم صاحبہ نے کہا۔

''جی۔ جی نہیں۔'' گھبرا کر میں نے اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔

''اس وقت مجھے کچھ کام کرنے ہیں۔ تم سے صبح کے وقت تفصیلی بات چیت ہوگی۔''

انہوں نے کہا پھر اپنے ساتھ والی عورت سے مخاطب ہوئیں۔ ''انیسہ اسے اس کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔''

انیسہ نامی وہ عورت مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے گیلری کی طرف مڑ گئی۔ وہاں دونوں اطراف کمرے تھے اور سبھی کے دروازے بند تھے۔ داہنے کونے کا آخری دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوگئی۔ میں اس کے پیچھے چلی آئی۔

پہلے تو مجھے شک گزرا کہ انیسہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں یہاں آئی تھی اور ابھی مجھے سرونٹ کوارٹر میں لے جائے گی۔ وہ کمرا تھا ہی اتنا خوبصورت اور آرام دہ کہ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی وہاں مجھے رہنا تھا۔ ابھی میں نگاہوں ہی نگاہوں میں اس کمرے کی سجاوٹ کو سراہ رہی تھی کہ انیسہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''تم آرام کرو۔ میڈم صبح تم سے ملاقات کریں گی۔ ساتھ باتھ روم ہے چاہو تو نہا دھو لو۔ کپڑوں کے کچھ جوڑے ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں مل جائیں گے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بستر کے ساتھ ہی گھنٹی ہے بجا دینا۔''

''کک۔ کیا میں یہاں رہوں گی۔ اس کمرے میں؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں تم یہیں رہو گی۔''

''لیکن......'' میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔

''لیکن کیا؟''

''یہ تو بہت اعلیٰ کمرا ہے۔ میں سرونٹ کوارٹر میں رہ لوں گی۔''

''تمہاری جگہ یہیں ہے۔ تم یہیں رہو گی۔ سرونٹ کوارٹر تم بہت پیچھے چھوڑ آئی ہو۔ اب وہ ذہنیت بھی اپنے جوتوں کی گرد کے ساتھ باہر جھاڑ آؤ۔''

میں متذبذب تھی۔ یہ مہربانی بلاوجہ تو نہیں ہوسکتی۔ اور اتنا دوڑنے کے بعد میں اس قدر تھک چکی تھی کہ اب اس بارے میں کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ کم از کم ایک رات سکون کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ اسی لیے سب سوچیں اپنے ذہن سے جھٹک دیں۔

انیسہ مڑ کر جانے لگی تو مجھے خیال آیا۔

''سنیں۔''

اس نے پلٹ کر میری جانب دیکھا۔

''جاءنماز ہوگی؟''

اس نے پہلے کچھ لمحے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر مسکرا دی۔

''نماز پڑھتی ہو؟''

اس کی مسکراہٹ حوصلہ افزا تھی۔ جواباً میں بھی مسکرا دی۔ ''نماز تو کسی حالت میں بھی معاف نہیں ہے۔''

''ان باتوں پر یقین ہے تمہارا؟''

''یہ یقین نہیں ایمان ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے پتا چلا ہے کہ پچھلے دنوں تم ایک ناجائز بچی کو جنم دے چکی ہو۔ اس کے باوجود بھی؟'' انیسہ کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔

''میں نے اپنی بیٹی کا نام طیبہ رکھا ہے۔ وہ ناجائز نہیں تھی۔ ہاں اس کے ماں باپ کا آپس کا تعلق ناجائز تھا۔ میری بیٹی' میری طیبہ کا کوئی قصور نہیں تھا یہ ٹھیک ہے کہ نادانی اور نادانستگی میں میں نے اپنی عزت کھو دی لیکن میرا ایمان سلامت ہے۔ میں جب تک زندہ رہوں گی اس کے حضور اپنے اس فعل کی معافی مانگتی رہوں گی۔ وہ رحیم و کریم ہے۔ اک دن مجھے ضرور معاف کر دے گا۔ میری آزمائشوں کو ضرور ختم کر دے گا۔'' میں جذباتی ہوگئی۔

وہ آہستہ سے ہنس دی۔ ''ہاں انسان ایسے ہی جذباتی سہارے تلاش کرتا رہتا ہے۔''

''اللہ تعالیٰ جذباتی سہارا نہیں حقیقت ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

''بھئی' میں کوئی فلسفی نہیں کہ اس کے وجود کے ہونے یا نہ ہونے پر بحث کروں۔ بہرحال اس نے تمہیں یہاں تک پہنچا کر تم سے کوئی اچھا سلوک بھی نہیں کیا۔'' وہ شرارت آمیز انداز میں بولی۔

''میں بھی کوئی فلسفی نہیں کہ کوئی دلیل دے سکوں۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ انسان کل میں اللہ تعالیٰ کا محتاج اور جز میں آزاد ہے۔ وہ اپنی آزادی ایک حد کے اندر بھرپور طریقے سے استعمال کر سکتا ہے۔ اب یہ اس کا اپنا فعل ہے کہ وہ اس آزادی کو کیسے استعمال کرتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ یہاں سے آگے اللہ تعالیٰ اپنا حکم استعمال کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ۔

وہی ہوا جو خدا نے چاہا۔

جو اختیارِ بشر پہ پہرے بٹھا رہا ہے۔

''وہی خدا ہے۔''

انیسہ کی آنکھوں کی شرارت کم نہیں ہوئی۔

''یہ جو تم نے کہا یہ Pessimisim (قنوطیت) ہے یا Reality (حقیقت)؟''

''میرے لیے یہ صرف اظہارِ بندگی ہے۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

چند لمحے وہ بغور میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

''تم بہت غیر موزوں جگہ پر آ گئی ہو۔ اپنی دے نے میں تمہیں جاءنماز لا دیتی ہوں لیکن یہ یقین سے نہیں بتا سکتی کہ قبلہ کس سمت میں ہے۔ شاید کسی نوکر کو پتا ہو۔ میں پتا کرتی ہوں۔''

وہ باہر نکل گئی تو میں بستر پر بیٹھ گئی۔ انیسہ کی باتوں سے' اس گھر سے' اس آرام دہ کمرے سے' ہر چیز سے مجھے اُلجھن ہونے لگی تھی۔ انیسہ کو گئے پندرہ بیس منٹ ہونے کو تھے۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو میں نے اُٹھ کر خواب گاہ کا جائزہ لینا شروع کیا۔

یہاں سے وہاں تک نرم دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ جہازی سائز پلنگ تھا۔ اسی کے ساتھ کا صوفہ سیٹ اور دیگر فرنیچر تھا۔ رنگین ٹی۔ وی اور وی سی آر تھا۔ اکائی کا ڈیک بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ آرائش' بجھتے سفید اور سیاہ رنگ کے امتزاج سے کی گئی تھی۔

ساتھ ہی بہت بڑا اور حیران کن حد تک سجا ہوا باتھ روم تھا۔ ایسا باتھ روم اس سے قبل میری نگاہوں سے نہیں گزرا تھا۔ جس میں خوبصورت پردے' منفرد ٹائلز' قیمتی باتھ روم فٹنگ اور صوفہ سیٹ تک موجود تھے۔ داخل ہوتے ساتھ بائیں ہاتھ پر دیوار گیر الماریاں' سامنے باتھ روم میٹ۔ تھوڑا آگے ایک گول میز جس پر رسالے اور موبائل ایکسٹینشن پڑے ہوئے تھے اور اردگرد دو ون سیٹر صوفے تھے۔ ایک کونے میں واش بیسن تھا جس کے قریب ہی کموڈ ہینڈ شاور اور...... اس کے پہلو میں دوسرے کونے کے ساتھ پردے لگے ہوئے تھے۔ اور تین سیڑھیاں چڑھ کر بڑا سا باتھ ٹب تھا جو اس وقت پانی سے خالی تھا۔ خوبصورت نیلگوں رنگوں کے تولیے بہت اسٹائل کے ساتھ اسٹینڈ سے ہوتے ہوئے باتھ ٹب تک چلے آئے تھے۔ قریب ہی غسل سے متعلق ڈھیر ساری غیر ملکی اشیاء سجی ہوئی تھیں۔ انہی کے نزدیک ایک اور موبائل ایکس ٹینشن رکھا ہوا تھا۔

میں یہ سب دیکھنے میں اس قدر محو تھی کہ انیسہ کی آواز پر ایک دم چونک کر مڑی۔

''تمہارے لیے بازار سے جاء نماز لانی پڑی۔'' وہ ہولے سے ہنس کر بولی۔

''جی شکریہ۔''

''مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ قبلہ کی سمت کون سی ہے۔'' وہ اندر آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''میں کل صبح سورج یا قریبی کسی مسجد کے میناروں سے اندازہ لگالوں گی اور رات کو یہ سوچ کر نماز پڑھ لوں گی کہ اللہ ہر جگہ' ہر سمت میں موجود ہے۔ اور قبول کرنے والا ہے۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ جاء نماز لے آئیں۔''

''اچھا اب آؤ کچھ اور چیزیں دیکھ لو۔'' وہ اُٹھ کر خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے ایک نگاہ نیلگوں ٹائلز والے باتھ روم پر ڈالی اور اس کے پیچھے باہر نکل آئی۔

بستر پر چند پیکٹ پڑے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں کھول کر اندر سے کپڑے نکالے کچھ قیمتی قمیص شلواریں' کچھ ٹائٹس ..... اور جمپرز' ٹی شرٹس دو شب خوابی کے لباس۔

''میرے خیال میں وقتی طور پر یہ بہت ہیں۔ پھر تم خود جا کر اپنے لیے خریداری کر لینا۔''

میری اُلجھن میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔ وہ تمام سوچیں اور سوال جو اپنے ذہن سے جھٹک دیئے تھے۔ اب وہ ایک دم پھر سے میرے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ آخر اس مہربانی کی وجہ؟

''آپ یہ سب میرے لیے کیوں کر رہی ہیں؟'' بالآخر میں نے پوچھ لیا۔

''تم اتنی بیوقوف تو نہیں ہو سکتیں ظاہر ہے ہر بزنس مین کو انویسٹ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی ریٹرن ملا کرتا ہے۔'' وہ شاپرز کو ایک طرف سمیٹتے ہوئے بولی۔

''لیکن آپ کے بزنس میں میرا کیا کام؟'' میں نے تذبذب کے عالم میں پوچھا۔

انیسہ نے آنکھیں قدرے میچ کے میری طرف دیکھا پھر سر ہلا کر بولی۔ ''خیراں کے ساتھ یہی پرابلم ہے کہ وہ پوری بات نہیں کرتی۔ بہر حال اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ تم یہاں آ ہی گئی ہو۔ اس بارے میں میڈم سے صبح بات کر لینا۔''

''میڈم کون؟ وہی بیگم صاحبہ؟''

''ہاں' لیکن انہیں یہ بیگم ویگم مت کہنا میڈم کہنا۔'' وہ اُٹھنے لگی۔

''پلیز میری بات سنیں' مجھے کچھ تو بتا دیں آپ مجھے یہاں کیوں لائی ہیں۔'' اس کی بات نے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔

''تمہیں ہم تو نہیں لائے' تم اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ آئی ہو۔ اس بارے میں میڈم نے تم سے پوچھا تھا اور تم نے واضح طور پر رضامندی ظاہر کی تھی۔''

''میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ مجھے گھریلو کام کاج کے لیے لے جائیں گے۔'' میری حالت رونے والی ہو گئی۔

''اس بارے میں تمہیں پہلے ہی ہم سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ تم نے تو ہم سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ تم ہمارا ہر حکم مانو گی۔''

''میں تو گھر کے کام کاج کے حوالے سے کہہ رہی تھی۔'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''یا تو تم بہت بھولی ہو یا پھر بہت ہوشیار' بھولی ہو تو کچھ نہ کچھ سیکھ جاؤ گی' اور ہوشیاری دکھائی تو اپنے ساتھ ہی برا کرو گی' ہم نے تمہیں بہت مہنگے داموں خریدا ہے اور تمام پیسے واپس وصول کرنا بھی ہم جانتے ہیں۔''

میرا منہ کھل گیا۔ ایک لمحے کو تو اپنی سماعت پر اعتبار ہی نہ آیا۔ ''کیا؟ میں سمجھی نہیں؟''

''رفتہ رفتہ سب سمجھ جاؤ گی۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے خریدا ہے مجھے' یہ کیسے ہو سکتا ہے' یہ نہیں ہو سکتا۔'' مجھے لگا میں پاگل ہونے لگی ہوں۔

''اگر یہ سبق واقعی تمہارے لیے نیا ہے تو رات بھر اسے دہرا کر اپنے اندر جذب کرو' کل نیا سبق ہو گا۔'' وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

میرا دل چیخنے چلانے کو چاہ رہا تھا۔ اس کے نکلتے ہی میں دروازے کی طرف لپکی اور ہینڈل گھمایا لیکن دروازہ باہر سے بند تھا۔ بے اختیاری کے عالم میں مَیں نے دروازہ پیٹ ڈالا۔

''کھولو' کھولو دروازہ۔'' میں چلائی۔

مگر بے سود' یہاں سے مایوس ہو کر میں فون کی طرف لپکی' میرا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ لاہور کے فون نمبرز کس قسم کے تھے' ان میں ہندسوں کی تعداد

کیا تھی' میرے ذہن میں بس ایک ہی نمبر تھا۔ اپنے جہلم کے گھر کے فون کا۔

ریسیور اُٹھا کر جلدی سے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ ابھی دو نمبر ہی گھمائے تھے کہ مجھے احساس ہوا وہ فون محض شوپیس تھا۔ اس کا اگر کوئی کنکشن تھا تب بھی وہ کٹا ہوا تھا۔ ریسیور پٹخ کر میں کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی مگر وہاں بھی کوئی راہِ فرار نہیں تھی' شدید مایوسی نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بستر پر بیٹھ کر میں پھر رو پڑی۔

''یہ سب کیا ہے میرے مالک؟ اتنی بڑی سزا۔ یہی سب ہونا تھا تو تُو نے خودکشی حرام نہ کی ہوتی۔ کم از کم کوئی راستہ تو ہوتا۔''

بہت دیر تک میں روتی رہی پھر انکل سے ایک سمت کا تعین کر کے جاءنماز بچھالی اور آدھی رات تک نماز اور نوافل میں مصروف رہی۔ اسی دوران انیسہ اپنی نگرانی میں ایک نوکرانی کے ہاتھ کھانا رکھوا گئی۔ کھانا پینا ہر شے مجھے بالکل بیکار لگ رہی تھی' بس ایک خیال تھا کہ اپنے مالک و معبود کے سامنے سر جھکا کر' رو کر' اپنے گناہوں کی معافی مانگوں اور رحم طلب کروں۔

جب ذہنی اور جسمانی طور پر بہت تھک گئی تو سوگئی۔

صبح ساڑھے دس بجے مجھے ناشتے کے لیے بلایا گیا۔ خوبصورت گول ڈائننگ ٹیبل کے گرد میڈم اور انیسہ کے علاوہ تین اور لڑکیاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ تینوں ہی جدید تراش کے ملبوسات زیب تن کیے ناشتا کرنے اور گپیں لگانے میں مصروف تھیں' میڈم کے سامنے انگریزی کا اخبار کھلا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں جلتا ہوا سگریٹ تھا۔

''بیٹھو!'' میڈم نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ تینوں لڑکیاں بھی دلچسپی سے میری طرف متوجہ ہوگئیں' سب کو اپنی طرف متوجہ پا کر میں بہت زیادہ کنفیوز ہو رہی تھی۔ ابھی کرسی کھینچ کر بمشکل بیٹھی ہی تھی کہ میڈم مخاطب ہوئیں۔

''یہ کل تم نے کیا تماشا مچایا تھا' دروازہ کیوں پیٹ رہی تھیں؟''

ان لڑکیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی' مجھے حد درجہ سبکی اور احساسِ شرمندگی نے گھیر لیا۔

''میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔'' سر جھکا کر میں اتنا ہی کہہ سکی۔

''کہاں جانا چاہتی ہو؟''

''پتا نہیں' بس یہاں نہیں رہنا چاہتی۔'' میری آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

''میں وجہ نہیں پوچھوں گی' اس لیے کہ چند تم جیسی احمق لڑکیاں بھی آ ہی جاتی ہیں۔''

اس نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''اس دنیا میں تم تنہا ہو' اگر تمہارا کوئی خاندان ہوتا تو بھی اس صورتِ حال میں تم تنہا ہو چکی ہوتیں کیا اب تک تمہیں احساس نہیں ہوا کہ باہر کی دنیا کیسی ہے؟''

''ایک ہی بات ہے' آپ کی دنیا کون سی مختلف ہے۔'' میرا لہجہ تلخ ہوگیا۔

''پہلی بات تو یہ سمجھ لو کہ ہم نے تمہیں خریدا ہے۔''

میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''میں کوئی بکاؤ مال نہیں ہوں کہ آپ نے مجھے خریدا ہے' کہاں دیکھ لیا آپ نے کہ میں فار سیل (For Sale) ہوں؟ کس نے بیچا مجھے؟ کس نے رقم وصول کی؟ میں جیتی جاگتی لڑکی ہوں' کوئی دوکان پر رکھی گڑیا نہیں کہ کوئی خرید کر لے جائے۔''

''تم جیسی لڑکیاں جن کی تحویل میں ہوتی ہیں وہی سوداگر ہوتے ہیں۔'' میڈم نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر اطمینان سے بات جاری رکھی۔ ''اور میرے اندازے کے مطابق تم پہلی مرتبہ نہیں بکی ہوگی' اس سے پہلے جس کے ساتھ تم نے تعلقات استوار کیے اس نے بھی تمہیں کچھ دے کر ہی خریدا ہوگا اور اگر نہ اس نے دیا اور نہ تم نے وصول کیا تو یہ تمہاری بہت بڑی حماقت تھی۔

بہرحال تم نے کہا کہ باہر کی اور یہاں کی دنیا ایک سی ہے' ایسا نہیں ہے' تم یہاں سے باہر نکلو گی تو بھی تمہیں یہی سب کرنا پڑے گا' نہیں کرنا چاہو گی تب بھی کون آئے گا تمہیں بچانے؟ کام دونوں جگہ ایک ہی ہوگا' لیکن باہر زبردستی اور چھینا جھپٹی ہوگی۔ جبکہ یہاں آرام دہ اور پُرسکون ماحول ہوگا' تمہارے کام کے عوض تمہیں معاوضہ ملے گا' کوئی ایرا غیرا تمہاری طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ زیادہ تر لوگوں کے نزدیک تم ایک اعلیٰ خاندان کی چشم و چراغ ہوگی' تمہاری پڑھائی بھی جاری رہے گی' فرمائش بھی پوری ہوگی' بس تمہیں کچھ وقت دینا ہوگا ہمیں۔''

میڈم بات کر رہی تھیں' اور میرے آنسو بہے چلے جا رہے تھے۔

''جانا چاہو تو میں تمہیں آزاد کر دوں گی مگر سوچ لو' تم عام مزدوروں' ٹھیلے والوں' قصائیوں' نائیوں وغیرہ کے قبضے میں چلی جاؤ گی' نہ پیٹ بھر کر روٹی نصیب ہوگی اور نہ معاوضہ

دھکے ہی دھکے ملیں گے۔ اس کے برعکس یہاں سب مالدار اور عموماً تعلیم یافتہ لوگ آتے ہیں' جنہیں رہنے سہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ خوش ہوتے ہیں اور خوش کر کے جاتے ہیں۔ باہر تم ہرایرے غیرے کی پہنچ میں ہوگی' کبھی ٹھکانا مل جائے گا اور کبھی ٹھوکروں میں پڑی رہو گی' یہاں تمہارے سر پر چھت ہوگی' جب لمبی گاڑی میں باہر نکلو گی تو لوگ خود جھک کر سلام کرنے لگیں گے۔''

میں پھوٹ پھوٹ کر رہ پڑی۔ ''میری کچھ سمجھ نہیں آتا میں کیا کروں' کہاں جاؤں' میں اکیلی ہوں' میرا کوئی نہیں ہے۔''

''کوئی کیوں نہیں ہے ہم جو ہیں۔ ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔'' میڈم اپنی جگہ سے اُٹھ کر آئیں اور مجھے خود سے لپٹا لیا۔

''میں یہ کام نہیں کرنا چاہتی۔''

''یہی تمہارا مقدر ہے جسے تم بدل نہیں سکتیں چاہے کھلے دل سے قبول کر لو یا رو دھو کر' بہتر یہی ہوگا کہ خوشی سے قبول کر لو۔'' میں روتی رہی۔

''اچھا اب ناشتا کر لو' رات کو بھی تم نے اپنی ضد میں کھانا نہیں کھایا۔ اس بھوک ہڑتال کا کوئی فائدہ نہیں ہے' جب بھوک شدید ہوتی ہے تو انسان حرام کھانے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اپنے آپ کو مت آزماؤ' پیٹ بری چیز ہے اس کے آگے سبھی ہار جاتے ہیں۔''

میڈم کے اصرار کے باوجود میں ایک لقمہ بھی حلق سے نہیں اُتار سکی۔

مگر کب تک' میڈم نے ٹھیک کہا تھا کہ پیٹ بری چیز ہے' اس کے آگے سبھی ہار جاتے ہیں۔ میں بھی ہار گئی۔ پہلی مرتبہ انسان لڑ سکتا ہے' لیکن جب ایک مرتبہ ہارتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کی لڑنے کی صلاحیت ہی دم توڑنے لگتی ہے' میں اسی لمحے سے خوفزدہ تھی جس لمحے میں مکمل ہار تسلیم کر لیتی۔

وہاں تین لڑکیاں مستقل رہتی تھیں۔ جبکہ کچھ آتی جاتی رہتی تھیں۔ صائمہ' نازیہ' فرزانہ تینوں بہترین کالجوں میں زیر تعلیم تھیں' نازیہ نے انہی دنوں ایک اشتہاری فلم میں ماڈلنگ سے اپنے کیریر کا آغاز کیا تھا۔ وہ تینوں اتنی خوبصورت نہیں تھیں' جتنی اسٹائلش تھیں' جو لباس پہنتیں وہی ان پر سج جاتا' خوبصورت لب و لہجے میں انگریزی بولتیں' ان کی اداؤں میں نزاکت تھی' اپنے پیشے سے ہٹ کر وہ تینوں ہی خوش مزاج نرم خو اور اچھی لڑکیاں تھیں' بہت جلد

وہ میرے قریب آ گئیں۔

میڈم ابھی مجھے اس پیشے کے لیے موزوں نہیں سمجھتی تھیں' انہیں ایک غیر معمولی حسین لڑکی کی ضرورت تھی جو میری صورت میں انہیں مل گئی تھی لیکن جو کام وہ مجھ سے لینا چاہتی تھیں اس کے حوالے سے ابھی مجھ میں بہت خامیاں تھیں' ایک تو انہیں میرے رونے سے سخت چڑ تھی' میری نمازیں انہیں شدید الجھن میں مبتلا کر دیتی تھیں صرف انیسہ تھی جس کی وجہ سے انہوں نے مجھے منع نہیں کیا تھا۔ انیسہ نے ان سے سفارش کی تھی۔

''کرنے دیں میڈم ہمارا کیا لے رہی ہے۔ نماز اور خدا اس کے جذباتی سہارے ہیں' جب نئے ماحول کو دلی طور پر تسلیم کرے گی تو خود ہی یہ سب چھوڑ دے گی' زبردستی کرنے سے منفی اثر بھی پڑ سکتا ہے۔ کم از کم یہ بات تو اس کی سمجھ میں آ ہی چکی ہے کہ یہاں رہنا ہی اس کے مفاد میں ہے' باقی باتیں بھی جلد ہی سمجھ لے گی۔''

انیسہ کی بات پر میں کچھ بحث کرنا چاہتی تھی' بس یہ سوچ کر کچھ نہیں بولی کہ اس طرح غصے میں مجھ سے یہ رعایت واپس نہ لے لی جائے۔

بڑی اماں کی وجہ سے میں شروع سے مذہبی ذہن رکھتی تھی' مگر کبھی ان کی نظر بچا کر نماز میں کوتاہی بھی کر دیا کرتی تھی۔ کبھی زیادہ نیند آ جاتی تو عشاء یا فجر کی نماز گول کر دیتی۔ اسکول سے آ کر تھکاوٹ ہوتی اور نیند لینے کو دل چاہتا تو عصر کی نماز رہ جاتی۔ کبھی بازار یا کسی تقریب میں جانا ہوتا تو مغرب کی نماز چھوڑ دیتی۔ ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا تھا' بس کبھی کبھی بعض اوقات قضا پڑھ لیتی تھی۔ اور کبھی سوچتی کہ آج تو بہت کام ہے پھر کسی دن قضا پڑھ لوں گی' یوں ہوتے ہوئے کئی دفعہ نماز بالکل ہی چھوٹ جاتی۔

لیکن جس روز طیبہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے میری دعا سنی تھی' اس روز سے میں نے تہیہ کیا تھا کہ اب کبھی نماز نہیں چھوڑوں گی' میری آزمائشوں کا دور جاری تھا پر میری بیٹی تو محفوظ ہو گئی تھی۔ کیا ہوا جو میرے قریب نہیں تھی' میں اسے چھو نہیں سکتی تھی' پیار نہیں کر سکتی تھی' یہی میرے لیے بہت تھا کہ اس کے بک جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ اس کی بولی نہیں لگ سکتی تھی' وہ کسی عزت دار گھر میں بیٹی بن کر گئی تھی۔ ادھر دعا میرے ہونٹوں سے نکلی تھی' اُدھر قبول ہو گئی تھی۔ اب کیا اس کے باوجود بھی میں اپنے خالق و مالک کے اس احسان کا شکر ادا نہ کرتی؟

میڈم مجھے بڑے گھرانوں کے طور طریقے سکھا رہی تھیں' انداز نشست و برخاست پر

توجہ دے رہی تھیں' انگریزی سکھا رہی تھیں' بننا سنورنا' انداز میں جدت پیدا کرنا' مختلف مزاج کے افراد کے ساتھ خود کو بدلنا' اسٹائل سے رہنا' مردوں سے نمٹنے کے طریقے اور نہ جانے کیا کیا۔

رات ہوتے ہی گھر میں لمبی گاڑیوں کی قطاریں لگ جاتی تھیں' اونچے عہدیدار' بزنس مین' زمیندار سیاستدان' رئیسوں کے جوان بیٹے اور اس قماش کے لوگ ڈیرہ جما لیتے تھے کچھ لڑکیاں بھی آ جاتی تھیں۔ ہلا گلا اور ہنگامہ ہوتا تھا' پھر آہستہ آہستہ خاموشی چھانے لگتی تھی۔ صبح تک سب کچھ ختم ہو جاتا تھا۔

میں ایسے میں اپنے بیڈروم کو اندر سے بند کر لیتی تھی' میڈم یا انیسہ نے اس بارے میں مجھ سے کبھی استفسار نہیں کیا تھا' نہ ہی ڈور لاک میں سے چابی نکالنے کی کوشش کی تھی۔ میڈم یوں بھی تیزی سے دوڑنے اور گر جانے کی قائل نہیں تھیں' وہ آرام اور احتیاط سے قدم آگے بڑھاتی تھیں' انہیں اس بات کی کوئی جلدی نہیں تھی' کہ مجھے بزنس میں لے آئیں۔ وہ مجھے پہلے اچھی طرح سے تربیت دینا چاہتی تھیں۔

رات کو جب مجھے احساس ہوتا کہ اس وقت اس مکان کی ایک ایک اینٹ گناہ سے آلودہ ہو رہی ہو گی تو میں جاء نماز بچھا لیتی۔ اللہ تعالیٰ کے حضور رو کر گڑگڑا کر اپنے ماضی کی غلطی کی معافی مانگتی تھی اور اس سے دعا مانگتی تھی کہ وہ میری آزمائشیں ختم کرے' وہ جو غفور و رحیم ہے مجھ پر رحم کرے۔

صائمہ' فرزانہ اور نازیہ نے کبھی میرے مذہبی رجحان پر طنز نہیں کیا تھا نہ ہی کبھی مجھ سے میرے ماضی کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی۔ ہم چاروں کچھ نہ کچھ وقت ساتھ ضرور گزارتے تھے اور ایسے میں بے ضرر چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہتے تھے۔

صرف ایک مرتبہ یہ موضوع زیر بحث آیا تھا۔ وہ بھی انتہائی مختصراً۔ نازیہ کافی اہتمام سے تیار ہو کر نکلی۔

''کہیں جا رہی ہو؟''

''ہاں یار بلکہ دیر ہو رہی ہے' اب تک ڈرائیور کو آ جانا چاہیے تھا۔'' اس نے کلائی پر بندھی نازک سی گھڑی دیکھی۔

''کہاں جانا ہے' اپنی کار لے جاؤ۔ تھوڑی دیر پہلے تک تو باہر ہی کھڑی تھی۔''

''نہیں' اپنی کار پر نہیں جانا۔'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''شاپنگ کرنے جا رہی ہو؟''

''نہیں' کسی نے بلایا ہے۔''

میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ کتنی اچھی لڑکی تھی پھر یہ سب کیوں کر رہی تھی' وہاں اردگرد کوئی نہیں تھا' میں نے پوچھ ہی لیا۔

''نازیہ کیوں کرتی ہو یہ سب؟ تم تو آزاد ہو' بغیر پہرے کے اِدھر اُدھر آ جا سکتی ہو' چھوڑ کیوں نہیں دیتیں یہ سب؟''

وہ مسکرا دی۔ ''اس لیے کہ میں یہ سب چھوڑنا نہیں چاہتی' مجھ پر کوئی زبردستی نہیں ہے۔ میرے گھر والے پاکستان میں نہیں ہیں۔ میں ہی چھٹیوں میں ان کے پاس جاتی ہوں' جس بات کو تم نے جان کا روگ بنایا ہوا ہے' میرے نزدیک یہی زندگی ہے اور یہ یقیناً اتنی لمبی نہیں ہے اس لیے اسے انجوائے کرنا چاہیے' میں اسی میں خوش ہوں۔ ہاں تمہارا مسئلہ اور ہے' تم پر پہرے ہوں یا نہیں' دیکھنا تم بھی یہ سب چھوڑ نہیں سکو گی' تمہارے لیے باہر کی دنیا میں کچھ نہیں رکھا۔''

میری آنکھیں بھر آئیں۔ ''تب ہی تو میں اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر رہی ہوں۔ اگر اس مکان کے باہر میرا کوئی ہوتا تو میں ضرور فائٹ کرتی۔ کبھی ہتھیار نہ ڈالتی' مگر اب تو......'' میں نے آہ بھر کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''آسیہ! مجھے تمہیں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے' تم اپنی سوچ اور اپنے حالات کے بیچ میں کچلی جاؤ گی' کوشش کرو کہ اپنے حالات کو قبول کر لو' یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔'' اس کے انداز میں ہمدردی تھی۔

''میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے' میں نہیں جانتی کہ میرا انجام کیا ہو گا لیکن میرے ذہن میری سوچ اور میرے دل کو یہاں کوئی اپنا تابع نہیں بنا سکے گا۔ میں اور کچھ نہ کر سکی تو بھی اس فعل سے اور اس زندگی سے ہمیشہ نفرت کرتی رہوں گی۔''

نازیہ مسکرا دی۔ ''آل دا بیسٹ' میری خواہش ہے کہ یہ مچھلی اپنے ہی دریا میں واپس چلی جائے' یہاں رہی تو تڑپ تڑپ کر جان دے دے گی۔''

اسی وقت کار کا ہارن سنائی دیا اور نازیہ مجھے ''بائے'' کہہ کر چلی گئی۔

جو کچھ میڈم سکھا رہی تھیں' میں سیکھتی جا رہی تھی۔ پھر ایک دن صبح ناشتے کے وقت انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔

''بہت دنوں سے تم جو سیکھ رہی تھیں اب اس کا امتحان ہے۔''

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا' جس لمحے کو میں سمجھتی تھی کہ وہ بہت دور تھا۔ وہ اچانک سر پر آن پہنچا تھا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یو کین ڈو اٹ۔ (تم یہ کر سکتی ہو)''

میرے پیلے پڑتے چہرے کو دیکھ کر میڈم نے حوصلہ افزا انداز میں کہا پھر بولیں۔

''بہت سیدھا سادا سا بندہ ہے۔ پچھلا ریکارڈ بے داغ ہے اس کا' میں ان تینوں میں سے کسی کو بھی بھیج سکتی ہوں' لیکن تمہارے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ تم اس کے معیارِ حسن کے زیادہ قریب ہو۔ جہاں وہ رہتا ہے وہاں کی لڑکیاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں' تمہاری طرح سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی۔''

''تمہیں ذرا جلدی جانا ہوگا۔ اس لیے پلیز اپنی نمازیں یہیں چھوڑ جانا میرے خیال سے اسلام میں یہ آپشن...... تو ہے ہی کہ نماز چھوٹ جائے تو بعد میں پڑھ لی جائے۔'' انیسہ نے کہا۔

میری زبان کو جیسے تالے لگ گئے تھے۔ دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔

''آج یہ کھیل مکمل طور پر ختم ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ۔'' میں نے دل میں کہا۔

''کام مشکل نہیں ہے اور پھر تم بالکل اناڑی بھی نہیں ہو' تجربہ تمہارے پاس ہے ہی' میں تمہیں کچھ کاغذات دوں گی' تمہیں ان پر بھی اس شخص سے دستخط کروانے ہوں گے۔'' ان کی بات مجھے جھنجھوڑ دینے کے لیے کافی تھی۔ میڈم اکثر کسی نہ کسی ذریعے سے یہ بات جتاتی رہتی تھیں اور میں زمین میں گڑ جاتی تھی۔

شام کو میڈم مجھے پارلر لے گئیں' وہاں سے تیار کروا کر مال روڈ کے ایک بڑے ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ آئیں۔

''کوئی گڑبڑ مت کرنا' میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔'' جاتے جاتے میرے کان میں یہ بھی پھونک گئیں۔

وہ پورا سویٹ تھا اور بے حد شاندار' میں اندر تو داخل ہو گئی تھی' لیکن اب وہاں سے کہیں

دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو مایوسی کی لہر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

''کہاں جاؤں گی' کون ہے میرا؟ تنہا کس کس کا مقابلہ کروں گی؟ بالآخر کوئی نہ کوئی شکار کر ہی لے گا اور پھر ذلت انتہائی ذلت بس بہت ہو گئی' اس سے زیادہ نہیں۔ یہ یقیناً وہ مقام ہے' جہاں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔''

میں خواب گاہ میں چلی آئی۔ اندر سناٹا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں وہاں تنہا تھی۔ بستر کی چادر گھسیٹ کر میں نے اس کی چند تہیں بنائیں اور بغیر سمت جانے' ایک رخ پر وہ چادر بچھا دی۔ حالات کا سامنا کرنے کے لیے اپنے ساتھ میں جو بلیڈ چھپا کر لائی تھی اسے چادر کی تہہ میں رکھ کر دو رکعت نفل کی نیت سے کھڑی ہو گئی۔ شاید یہ میری زندگی کی واحد نماز تھی۔ جس میں میں نے خود کو اپنے اللہ سے اتنا قریب محسوس کیا تھا۔ یوں جیسے وہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا جیسے میں اسے سب کچھ کہہ سکتی تھی۔ جیسے وہ میری خطائیں معاف کر رہا تھا جیسے اس کی رحمت کے دروازے کھل رہے تھے' میں پہلے بھی بہت گڑگڑاتی تھی' روتی تھی' لیکن اس سے پہلے نہ میں نے ایسی عبادت کی تھی اور نہ ایسی قربت محسوس کی تھی۔

نوافل پڑھ کر میں نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے بلند کیے۔

''یا اللہ' مجھے معاف فرما دے' میں بہت گنہگار ہوں' لیکن تیرے نبی ﷺ کی اُمت میں سے ہوں وہ نبی ﷺ جن کے لیے تو نے دنیا بنائی تھی' یا اللہ اپنے حبیب پاک ﷺ کے صدقے میرے گناہ معاف فرما دے۔

یا اللہ اب جبکہ یہاں میں تنہا ہوں اور تو سننے والا ہے پاک پروردگار میرے اس آخری فعلِ حرام کو بھی معاف فرما دے کہ اس ایک عمل کے بعد میں ان سب برائیوں سے بچ جاؤں گی جن سے بچنے کا میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

یا اللہ! میری طیبہ کو اپنی امان میں رکھنا۔ اس کی عزت پر کبھی کوئی حرف نہ آنے دینا اسے محفوظ رکھنا۔''

میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی' نہ جانے کتنی دیر پھر آنکھیں صاف کر کے چادر کی تہہ سے بلیڈ نکالا اور کلمہ پڑھ کر اپنی کلائی کی رگوں پر پھیرنے لگی۔

اسی وقت ایک مضبوط ہاتھ نے میری کلائی تھام لی' بلیڈ میرے ہاتھ سے گر گیا اور

میرے منہ سے چیخ نکل گئی' میرے قریب ایک خوش شکل خوش لباس نوجوان تھا۔

''کک' کون ہو تم؟ چھوڑو مجھے۔'' میں نے ساتھ ہی بلیڈ اُٹھانے کی بھی کوشش کی۔

اس نے مجھ سے پہلے ہی بلیڈ اٹھا کر دور پھینک دیا لیکن میری کلائی اب بھی اس کی گرفت میں تھی۔

''یہ سوال تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے۔ یہ کمرا میرا ہے' آپ اس میں کیا کر رہی ہیں اور خودکشی کرنے کے لیے آپ کو کوئی بہتر جگہ نہیں ملی تھی۔''

اس کا کہنا تھا کہ یہ کمرا اس کا تھا' میرا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کب آیا تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ میں سویٹ میں تنہا تھی تو میں نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا تھا۔ گویا وہ یہیں کہیں تھا۔ شاید باتھ روم میں یا پھر دوسری چابی سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔

خیر وہ جیسے بھی اندر داخل ہوا' میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں جس سے بچنا چاہتی تھی وہی میرے سر پر تھا۔ اور بھاگنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

مگر اس کا سوال بھی انوکھا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ میں وہاں کیا کر رہی تھی؟

''تمہیں نہیں معلوم کہ میں یہاں کیا کر رہی تھی؟ جب تک تم جیسے بھیڑیے اور درندے موجود رہیں گے' میرے جیسی لڑکیاں کیا کرتی رہیں گی؟ اس سوال کا جواب کچھ مشکل تو نہیں ہے۔ میں نہیں جانتی کہ میں کہاں تک اور کب تک ہارتی رہوں گی لیکن بالآخر میں فتح ضرور حاصل کر لوں گی' میں نفرت کرتی رہوں گی' تم جیسے لوگوں سے ہمیشہ۔'' میرے لہجے میں نفرت کا زہر تھا۔

وہ تھوڑی دیر آنکھیں قدرے بھینچ کر میری طرف دیکھتا رہا پھر میری کلائی آزاد کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں..... عزت دار شخص ہوں اور خواتین کی عزت کرتا ہوں۔ آپ اپنے دل سے یہ خدشہ نکال دیں کہ آپ کو مجھ سے کوئی نقصان پہنچے گا۔''

میں نے..... بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ سچ کہہ رہے ہیں ناں؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

میں چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رو دی۔ وہ میرے لیے ایک گلاس میں پانی لے

آیا۔ کانپتے ہاتھوں سے گلاس تھام کر میں نے چند گھونٹ پیئے۔

''اب آرام سے بیٹھ کر خود کو پُرسکون کر کے اگر کچھ بتانا چاہیں تو بتا دیں' مجھے امید ہے کہ میں آپ کی مدد کر سکوں گا۔''

''میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ اس احسان کا بدلہ اللہ تعالیٰ آپ کو ضرور دے گا۔''

''آپ کو شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ احسان بھی نہیں ہے۔ آپ جب نماز پڑھ رہی تھیں اس وقت میں باتھ روم میں تھا' باہر نکلا تو حیرت ہوئی' میں یہاں تنہا ہوں اور میرے ساتھ کوئی خاتون بھی نہیں ہیں کہ آپ کو ان کی واقف کار سمجھتا۔ سو آپ کے نماز ختم کرنے کا انتظار کرتا رہا۔ آپ کی گریہ وزاری نے مجھے بہت متاثر کیا۔ بہرحال میں نے دخل اندازی مناسب نہیں سمجھی۔ دراصل میرا اپنا تعلق بہت معزز اور مذہبی گھرانے سے ہے۔ ہمارے ہاں خواتین کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ پھر میں نے آپ کی دعا سنی۔ اندازہ ہوا کہ آپ کو میری موجودگی کا علم ہی نہیں تھا۔ بہرحال اب آپ پریشان مت ہوں۔ میں اتنا اچھا انسان تو نہیں ہوں لیکن اس قدر گھٹیا بھی نہیں ہوں' جتنا آپ نے سمجھ لیا تھا۔''

''میں اس کے علاوہ کیا سمجھ سکتی تھی۔ مجھے میڈم نے یہاں چھوڑا تھا اور۔ اور۔'' میں پھر رو پڑی۔

تھوڑی دیر تک اس نے مجھے رونے دیا پھر بولا۔

''آپ سکون سے مجھے سب کچھ بتائیں تب ہی میں آپ کی مدد کر سکوں گا۔ اور یقین کریں میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے تشکر آمیز انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر الف سے لے کر یے تک سب کچھ بتا دیا۔ کہیں روتے ہوئے کہیں بے ربط' بہرحال وہ سب سمجھ گیا۔ میں نے بات ختم کی تو تھوڑی دیر ہمارے بیچ بالکل خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔

''وہ کاغذات کہاں ہیں جن پر میرے دستخط لینے کو کہا گیا ہے؟''

میں نے کاغذات اس کے حوالے کر دیئے۔ اس نے سرسری سا جائزہ لیا پھر بولا۔

''ہوں' کچھ لوگ مجھ سے اپنا کام نکلوانا چاہتے ہیں۔ مجھے کچھ تحائف کی بھی پیشکش کی تھی' انہوں نے اور میرے سختی سے انکار کے باوجود بھی غالباً وہ باز نہیں آئے' خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ مجھے آپ کی کہانی سن کر بہت افسوس ہوا۔ اب آپ چاہیں تو ہم پولیس میں

رپورٹ کر سکتے ہیں۔''

''کیا فائدہ ہوگا؟ بڑے بڑے افسر خود وہاں آتے ہیں۔ ہم کتنا چاہیں یہ میڈم کا کاروبار بند نہیں ہو سکتا۔ جنہیں کارروائی کرنی ہے' وہ خود انہی کاموں میں ملوث ہیں۔ اور پھر میں زندہ ہوں تو مجھے سر چھپانے کا ٹھکانا چاہیے' میرے لیے میڈم اور ان کے کاروبار سے زیادہ اہم یہ بات ہے۔ میں اسی لیے مرجانا چاہتی ہوں کہ میرا اس بھری دنیا میں کوئی نہیں ہے جو میری عزت کی حفاظت کر سکے۔ میں زندہ رہی تو کسی نہ کسی میڈم کے ہتھے چڑھتی رہوں گی یا پھر کوئی نہ کوئی خیراں میری قیمت وصول کرتی رہے گی' مجھے انہی خاردار تاروں کے حصار میں زندگی بسر کرتے رہنا ہوگی' پولیس یا کوئی اور میری مدد نہیں کر سکتا۔ بس میں زندہ رہنا ہی نہیں چاہتی۔'' میں پھر رو پڑی۔

''کہتے ہیں جس کا کوئی نہیں ہوتا۔ اس کا خدا ہوتا ہے۔ آپ کا تو اللہ تعالیٰ پر بہت بھروسا ہے پھر ایسی مایوسی کیوں؟''

''کوئی راہ تو ہو جس پر عزت کے ساتھ چل سکوں۔ ہر راستہ بند ہو جائے تو عزت سے مرنا ہی بہتر ہے۔''

''ایک راستہ ہے' اگر آپ اس پر چلنے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ بولا۔

''کون سا راستہ؟''

''اگر آپ چاہیں تو میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

میرا منہ کھل گیا۔ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر سر جھٹک دیا۔ ''میں بہت بیوقوف لڑکی ہوں' زمین پر بچھے دام نہیں دیکھ سکتی۔ ہر مرتبہ نئی امید لے کر قدم اُٹھاتی ہوں اور جال میں پھنس جاتی ہوں۔ اب مجھ میں اور حوصلہ نہیں ہے۔''

''میں سمجھ سکتا ہوں کہ اب اعتبار کرنا مشکل ہے مگر میرا رویہ آپ کو خود میرے بارے میں بتا دے گا۔'' میں خاموش رہی۔

''آپ ایسا کریں کہ منہ ہاتھ دھولیں اور پھر آرام سے آکر بیٹھ جائیں۔''

باتھ روم کا دروازہ بند کر کے میں اس مہربان اجنبی کے رویے کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس نے اب تک مجھے تم کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ جذباتی سہارا دینے کی غرض سے بھی مجھے چھونے کی کوشش نہیں کی تھی' مجھے خودکشی سے روکنے کے لیے میری کلائی ضرور پکڑی تھی

لیکن اس میں کسی غلط نیت کا دخل نہیں تھا۔ یوں بھی وہاں کون تھا جو اسے روکتا۔ وہ میرے ساتھ کچھ بھی سلوک کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ مجھ سے دور بیٹھا ہوا تھا تو یہ اس کی شرافت تھی۔

''تو کیا سچ مچ اللہ تعالیٰ نے مجھے معاف کر دیا ہے؟ جو کچھ میں نے نوافل پڑھتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ قربت کا وہ احساس جو اپنے اللہ کے لیے میرے دل میں جاگا تھا۔ کیا وہ حقیقت تھی؟ میرے معبود نے مجھے معاف فرما دیا تھا؟ مجھے عزت کی زندگی کی طرف لوٹ آنے کا ایک اور موقع دیا تھا؟''

میں رو پڑی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس رحیم و کریم نے میری گریہ وزاری سنی تھی اور میرے لیے باعزت زندگی کا راستہ کھول دیا تھا۔ اس سے پہلے میرے اللہ نے میری بچی طیبہ کے لیے بھی میری دعا قبول کی تھی' میں کیسے اس معبود کا شکر ادا کرتی۔

کتنی دیر میں دروازے سے لگی روتی رہی۔ پھر منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ڈال کر باہر نکل آئی' میرے دل کو جیسے قرار سا آ گیا تھا۔

باہر وہ مہربان اجنبی میرا منتظر تھا۔ صوفے کے سامنے ہی ٹرالی پر کھانا سجا ہوا تھا۔

''مجھے بہت بھوک محسوس ہو رہی تھی' میرا خیال ہے کہ آپ نے بھی رات کا کھانا نہیں کھایا' اس لیے پہلے کھانا کھا لیا جائے۔''

''مجھے بھوک نہیں۔'' میں نے بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''حیرت ہے۔ میں ویسے خاصا خوش خوراک ہوں۔ چلیں اگر بھوک نہیں ہے تب بھی کمپنی دینے کے لیے کچھ تھوڑا سا کھا لیں۔''

میں نے ایک کباب اور کچھ سلاد پلیٹ میں نکال لیا اور آہستہ آہستہ کھانے لگی۔ وہ واقعی بہت خوش خوراک تھا اس کا اندازہ اسے کھاتے دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''شکر ہے ابر آلود موسم میں سورج کی کرن چمکی۔'' اس نے میری مسکراہٹ دیکھ کر کہا۔

''دراصل میں اتنے عرصے برطانیہ میں رہ کر آیا ہوں کہ یہاں کے لوگوں کے برعکس مجھے سورج کی کرنیں ہی پسند ہیں۔''

میں نے نظریں پلیٹ پر گاڑ دیں۔

وہ کھانا کھا کر فارغ ہوا تو میری طرف متوجہ ہوا۔

''اب میں اپنے بارے میں بھی آپ کو مختصراً بتا دوں' میرا نام انور عزیز بٹ ہے اور تعلق خوبصورت وادی کشمیر سے ہے۔ پیشہ وکالت اور شوق سیاست ہے' کچھ تعلیم یہاں سے حاصل کی ہے کچھ باہر سے لیکن چونکہ ہمارا گھرانہ روایتی اور مذہبی ہے اس لیے جہاں بھی گیا' چاہے تنہا ہی رہا سدھر رہا۔ ابھی چند دنوں کے لیے کام سے لاہور آیا ہوا تھا۔ کل واپسی کا ارادہ تھا۔ اب اندازہ ہے کہ واپسی دیر سے ہی ہوگی۔''

میں منتظر رہی کہ وہ اپنے گھر والوں کے متعلق کچھ بتائے گا۔ جب اس نے کچھ نہ کہا تو میں نے خود ہی ہمت کر کے پوچھ لیا۔

''اور آپ کے گھر والے؟''

وہ مسکرا دیا۔ ''ماشاء اللہ کافی بڑا گھرانہ ہے ہمارا۔ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں جن میں میرا نمبر ساتواں ہے' میرے علاوہ سبھی بہن بھائی شادی شدہ ہیں اور خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کو تہہ و بالا کرنے میں مصروف ہیں۔ میری بہنیں' بھابیاں سب گھریلو خواتین ہیں' والد اور بھائی لکڑی کے کاروبار میں مصروف ہیں' اور میں اپنی کتابیں چاٹتا رہتا ہوں۔ مقامی سطح پر والد صاحب سیاست میں تھوڑی بہت دلچسپی لیتے ہیں لیکن عملی سیاست میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ کیڑا صرف میرے دماغ میں گھسا ہوا ہے۔

پھر والد اور والدہ کے بھی بے شمار بہن بھائی ہیں' ایک ایک گھر میں دو دو تین تین قسم کے رشتے جڑے ہوئے ہیں۔ یوں ماشاء اللہ خاصا بھرا پُرا خاندان ہے۔ دادا جان بھی حیات ہیں گو کہ بہت ضعیف ہیں' خاندان کے مختلف گھروں میں قیام کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہے میرے گھر والوں کا مختصر سا تعارف۔''

تھوڑی دیر میں سر جھکائے بیٹھی رہی پھر بہت ہمت کر کے کہا۔

''آپ کے گھر والوں کو اس شادی پر اعتراض نہیں ہوگا؟''

وہ ہنس پڑا۔ ''یعنی آپ اس بارے میں سوچنے لگی ہیں۔ بہرحال بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں اکثر شادیاں خاندان میں ہی ہوتی ہیں لیکن میں شروع سے اپنے خاندان میں باغی مشہور ہوں' اسی لیے بتیس سال کی عمر ہو جانے کے باوجود بھی ابھی تک شادی کے بندھن سے آزاد ہوں ورنہ ہمارے ہاں بہت جلدی شادیاں کر دینے کا رواج ہے' اب بھی والدین

اس لیے اس معاملے میں زیادہ پریشان نہیں کرتے کہ اپنے سات بچوں پر وہ ارمان پورے کر ہی چکے ہیں' بہنوں اور بھابیوں کو شوق ہے لیکن ساتھ ہی یہ یقین بھی ہے کہ میں اس معاملے میں اپنی ہی چلاؤں گا۔

ان تمام باتوں کے باوجود خاندان میں ہماری شادی کو کھلے دل سے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ہم دونوں کو بہت محنت کرنی پڑے گی کہ اس رشتے کو ان سے منوائیں۔ ایک بات البتہ طے ہے کہ میرے گھر والے کسی ایسی اخلاقی پستی کا شکار نہیں ہیں کہ آپ کو کوئی اور پریشانی لاحق ہو۔''

میں مایوس ہوگئی' بات پھر وہیں پہنچی تھی...... نخلستان کی تلاش میں سراب تو بہت ملے تھے' اور اب میں تھکتی جا رہی تھی۔ وہ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ میری مایوسی کی کیفیت بھی اس سے چھپی نہیں رہ سکی۔

''میں آپ کے لیے اسٹینڈ...... لے سکتا ہوں۔ میں کوئی ایسی بات نہیں کہتا یا کرتا جسے پورا نہ کر سکوں۔''

اس کے لہجے نے مجھے ایک مرتبہ پھر اعتبار کرنے پر مجبور کر دیا' یا شاید میرے پاس اعتبار کرنے کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔

ایک پریشانی بہرحال اپنی جگہ تھی۔ میڈم نے مجھے خریدا ہوا تھا اور مجھ پر کافی کچھ خرچ بھی کر چکی تھیں۔ وہ مجھے اتنی آسانی سے جانے نہیں دے سکتی تھیں۔ جاتے جاتے یوں بھی انہوں نے جتا دیا تھا کہ ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں جانتا ہوں کہ کس قسم کے لوگوں سے کس انداز میں نمٹا جاتا ہے۔ کل صبح میں آپ کو اپنے ایک دوست کے گھر چھوڑ دوں گا اور اس سلسلے میں کچھ انتظامات کروں گا۔''

''مگر میں کسی کے گھر نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں آپ کو کسی ایسی جگہ تو نہیں چھوڑوں گا جہاں آپ کو کوئی خطرہ ہو' دوست میرے ساتھ ہوگا اور آپ گھر میں اس کی والدہ بہن اور بیوی کے ساتھ ہوں گی' یہاں کسی ہوٹل میں' میں آپ کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔ ہوٹلوں میں کون آیا' کون گیا' ہر بات کی ان لوگوں کو خبر ہوتی ہے' پھر یہاں آپ کو تنہا رہنا ہوگا' یہ بھی میں نہیں چاہتا۔''

سو ایسا ہی ہوا' مجھے اپنے دوست کے گھر ماڈل ٹاؤن چھوڑ کر انور اسی دوست کے ساتھ باہر چلے گئے' میرا چار روز تک وہاں قیام رہا۔ گھر کے سبھی افراد نے میرے ساتھ بہت محبت بھرا سلوک کیا لیکن یہ چار دن میں نے جیسے سُولی پر لٹک کر گزارے۔ میری ذہنی ایک کیفیت تھی۔ رہ رہ کر میرے دل میں خیال آتا تھا کہ کہیں انور اپنا ارادہ نہ بدل دیں۔ آخر میرے لیے وہ کیوں اتنی بھاگ دوڑ کریں گے' میں جو گناہوں کی دنیا کی پیداوار ہوں' کسی روز شاید وہ تنگ آ جائیں' تھک جائیں' ممکن ہے اپنے وعدے کو جذباتی حماقت سمجھیں۔ ہر روز جب وہ گھر آتے تھے' میں امید سے ان کے چہرے کی طرف دیکھتی تھی۔ وہ مسکرا کر مجھے تسلی دے دیتے تھے۔ پھر میرے دل میں وسوسے جنم لینے لگتے تھے۔ میں ان کے چہرے پر پچھتاوے کی لکیریں ڈھونڈنے کی کوشش کرتی تھی لیکن وہاں اطمینان ہوتا تھا۔ وقتی طور پر میری تسلی ہو جاتی تھی اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد خوف دوبارہ مجھے اپنے شکنجے میں کس لیتا تھا۔

پانچویں روز وہ معمول سے پہلے آ گئے' ہاتھ میں ایک پیکٹ سا تھا۔

''فٹافٹ تیار ہو جائیں۔'' انہوں نے پیکٹ میری طرف بڑھایا۔

میرا دل دھڑک اُٹھا۔ ''کہاں کے لیے؟''

''شادی کے لیے۔'' انہوں نے مطمئن انداز میں کہا۔

''شادی؟'' مجھے امید نہیں تھی کہ یہ سب اتنا اچانک ہو جائے گا۔ میرا تو خیال تھا کہ ہماری شادی کشمیر میں ان کے گھر میں ہی ہوگی۔

''نہیں کرنی کیا؟'' انہیں مجھ سے ایسے سوال کی امید نہیں تھی۔

''کرنی تو ہے۔'' میں بوکھلا گئی۔

وہ ہنس پڑے۔ ''تو پھر اتنی پریشانی کس بات کی ہے؟''

''میرا خیال تھا کہ شادی آپ کے گھر والوں کے درمیان ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''وہاں صرف جھگڑا ہوگا' شادی اگر ممکن ہے تو یہیں پر' وہاں بغیر شادی کے پہنچ گئے تو پھر یہ شادی ہوگی ہی نہیں۔ کوئی نہیں مانے گا۔ ہاں ہم نکاح کر کے جائیں گے تو منوانا آسان ہوگا۔''

میرے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ ابھی سختیاں ختم نہیں ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کے گھر والے اس خوشی میں شریک ہوں؟ یوں تو بہت بری بات ہوگی۔'' میرے لہجے میں بیچارگی تھی۔

''ایسا ممکن ہوتا تو میں ایسا ہی کرتا۔ کل صبح ہم واپسی کے لیے نکل جائیں گے اور ایک روز اسلام آباد میں رہ کر پھر مظفر آباد چلے جائیں گے' وہاں جھگڑوں سے نمٹیں گے اور پھر نئی زندگی شروع کریں گے۔'' وہ مسکرا دیئے۔ ''اب آپ تیار ہو جائیں' ہمیں وقت پر کچہری پہنچنا ہے۔''

چند لمحے میں وہیں تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی۔ میرے ذہن میں یہی سوچ تھی۔

''کیا یہ جو کچھ میں کرنے جا رہی ہوں' ٹھیک ہے؟ کہیں میں انور کو اس جنت سے محروم تو نہیں کرنے لگی جو ان کی ماں کے قدموں تلے ہے؟ کہیں ایک میری وجہ سے ان کے تمام تر رشتے چھوٹ تو نہیں جائیں گے؟''

میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی' میرا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ اور شاید اسی لیے میں سب کو محبت کے ساتھ اپنانا چاہتی تھی تاکہ سب میرے ہو جائیں۔ میں کہیں ویسے رہوں جیسے کبھی میرا اپنا گھر ہوتا' رشتے ہوتے تو میں رہا کرتی۔

مگر یہ موقع' گنوا دیتی تو میں کہاں جاتی؟ پھر ذلت کی پستیوں میں جا گرتی۔ نہیں اب یہ میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ زندگی میں یہ واحد فیصلہ تھا جو میں نے اپنی غرض کے حوالے سے کیا تھا۔ یہ تہیہ کر کے کہ انور کے گھر والوں نے میرے ساتھ جیسا بھی سلوک کیا' میں اس ایک خودغرضی کی قیمت پر اس سلوک کو برداشت کروں گی' محبت اور خدمت کے ذریعہ ان کا دل جیتنے کی کوشش کروں گی' سفر طویل ہوگا اور تکلیف دہ بھی لیکن ایسا اذیت ناک نہیں ہوگا جیسا ابھی ہے۔

میں لباس تبدیل کرنے چلی گئی' پیکٹ میں دو بنے بنائے ملبوسات تھے' ایک خوبصورت ریشمی جس پر نفاست سے ہلکا ہلکا کام کیا ہوا تھا' دوسرا سوتی لیکن جدید تراش کے مطابق ساتھ ایک چادر بھی تھی۔ میں نے سوتی لباس زیب تن کیا' بال برش کیے اور چادر لے کر باہر نکل آئی۔

انور مجھے دیکھ کر مسکرا دیئے' کچھ کہنا چاہتے تھے مگر پھر ارادہ بدل دیا اور بولے تو اتنا۔

''آئیں چلیں!''

گھر کی خواتین نے مجھے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ کچہری میں بہت ہجوم تھا۔ مجھے کار میں بیٹھا چھوڑ کر انور اترے اور تھوڑی دیر بعد کچھ کاغذات لے آئے۔ ان پر دستخط کروائے‘ کچھ اور لوگ تھے ان سے بھی دستخط کروائے‘ کچھ اور ایسے ہی کام نمٹائے پھر ہم گھر چلے آئے‘ گھر پر شام کے وقت انور کے دوست نے ہمارے نکاح کا انتظام کیا ہوا تھا۔ ایک ایک لمحہ مجھے ایک ایک صدی کے برابر لگ رہا تھا۔ ہر دم یہی دھڑکا تھا کہ ابھی کوئی ناگہانی ہوگی اور میں پھر بے ٹھکانا بے یار و مددگار‘ نیلے آسمان تلے تنہا رہ جاؤں گی۔

خدا خدا کر کے شام ہوئی‘ انور کے دوست کی بہن نے تیار ہونے میں مجھے مدد دی‘ میں بہت زیادہ کنفیوز ہو رہی تھی۔ میک اپ کے نام پر ہلکی سی لپ اسٹک اور کاجل لگایا...... بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنا لیا اور دُلہن تیار ہو گئی..... چند مہمان آ چکے تھے‘ جنہیں بلایا گیا تھا۔ نکاح کی تقریب شروع ہوئی‘ میرا تب تک برا حال رہا جب تک کانپتے ہاتھوں کے ساتھ میں نے نکاح نامے پر دستخط نہیں کر دیئے۔ اب میں ایک عزت دار شخص کی عزت‘ اس کی بیوی تھی‘ کتنا طویل اذیت ناک سفر کیا تھا میں نے اس عزت کو حاصل کرنے کے لیے۔ میں پھر بری طرح سے رو دی۔ یاد کے پردوں پر کتنی پرچھائیاں اُبھر آئی تھیں۔ میری ماں جو پریوں کی کہانیوں کی جل پری تھی اور جسے میں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ بڑی اماں جنہوں نے مجھے ماں کی محبت دی تھی۔

”دیکھنا بہو“ انہوں نے چھوٹی امی سے کہا تھا۔ ”یہ میری امانت ہے تمہارے پاس اسے دکھ نہ دینا۔ یہ غیر سہی لیکن کیا ایک انسان کو ہم اتنی محبت بھی نہیں دے سکتے؟ اپنا سمجھنے لگو تو سبھی اپنے لگتے ہیں۔“

کتنی محبت دی تھی انہوں نے مجھے اور میں اس محبت کے باوجود کس راہ پر نکل آئی تھی۔ کیا کیا ٹھوکریں نہیں کھائی تھیں میں نے۔

انور کا انتظار کرتے ہوئے میں نے کتنا کچھ سوچ ڈالا تھا۔ آنے والے لمحوں کا خوف بھی تھا۔ میرے متعلق وہ ہر بات سے باخبر تھے میں نے کچھ نہیں چھپایا تھا ان سے اور انہوں نے مجھے میری خامیوں اور حماقتوں سمیت قبول کیا تھا۔ پھر بھی ایک خوف تھا۔ کبھی کہیں وہ کوئی ایسی بات کہہ دیں جو تیر بن کر میرے دل میں ہمیشہ کے لیے پیوست ہو جائے۔

وہ آئے تو پہلے دن کی طرح مہربان تھے لیکن اور سب کچھ بدل گیا تھا۔ ان کی رفاقت

مجھے ایک حسین خواب لگ رہی تھی۔

”کاش انور مجھے پہلے مل گئے ہوتے میں نے اتنے دُکھ نہ اُٹھائے ہوتے‘ میری زندگی میں یہ انتہائی کربناک وقت نہ آیا ہوتا۔ اتنی محبتوں کے باوجود بھی وہ لمحے جو بیت چکے میں انہیں اپنی زندگی سے الگ نہیں کر سکتی۔ افسوس وہ ہمیشہ اس کا حصہ رہیں گے۔“ میں نے سوچا۔

ان کی کار میں راولپنڈی جاتے ہوئے مجھے یہ اطمینان تھا کہ وہ ہر جگہ میرا ساتھ ضرور دیں گے۔

جہلم سے کچھ دور ہم وہیں کے پہاڑی علاقے میں تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرے‘ چائے پیتے ہوئے وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”یہ کتنی خوبصورت جگہ ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا خوشی جیسے میرے اندر سے پھوٹ رہی تھی۔ ”میں پہلے بھی یہاں دو تین مرتبہ آئی ہوں لیکن یہ مقام اتنا اچھا کبھی نہ لگا تھا‘ آج شاید اس لیے اتنا اچھا لگ رہا ہے کیونکہ آپ ساتھ ہیں۔“

”آؤ‘ وہاں بیٹھتے ہیں۔“ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

زمین کے ایک خوبصورت قطعے پر بیٹھ کر ہم نیچے سڑک پر رواں دواں ٹریفک کو دیکھنے لگے۔

”مجھے اب بھی خواب سا لگ رہا ہے‘ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ابھی آنکھ کھل جائے گی‘ اور پھر وہی اذیت ناکی ہر طرف سے مجھے گھیر لے گی۔“

”بھول جاؤ وہ منظر ان شاء اللہ پھر کبھی بھی تمہاری زندگی میں نہیں آئیں گے۔“

”مجھے ڈر لگتا ہے میڈم کوئی معمولی عورت نہیں ہے‘ اس کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔“ میں نے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا۔

”تمہیں مجھ پر بھروسا کیوں نہیں ہے؟ اب تم میری بیوی اور میری عزت ہو‘ میں پورا انتظام کر چکا ہوں کہ اب تمہارا ماضی تمہاری راہ میں پھر کبھی حائل نہ ہو۔ اور تم بھی خیال رکھنا کہ اپنے ماضی کے بارے میں بھول کر بھی نہ سوچنا۔ یہ باتیں بہت ضروری تھیں اور میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ شاید کل ہی کہہ دیتا لیکن پھر یہ مجھے مناسب نہیں معلوم ہوا۔ میں نہیں چاہتا

تھا کہ اس وقت تمہارے ذہن پر کوئی بوجھ ہو۔ بہرحال مظفرآباد پہنچنے سے پہلے میں تم سے یہ سب کہہ دینا چاہتا ہوں۔''

میں ہمہ تن گوش تھی' دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اب مجھ سے تھوڑی سی بھی غیر معمولی بات برداشت نہیں ہوتی تھی۔

''تمہارا نام آسیہ ہی ہے' لیکن جس لمحے ہمارا نکاح ہوا تھا۔ اسی لمحے ماضی سے تمہارا تعلق ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ میں تمہارے لیے سب سے لڑ سکتا ہوں اور ضرورت پڑی تو لڑوں گا لیکن ہمارے خاندان میں بہت قریبی رشتے ہیں۔ اگر میرے رشتہ داروں کو تمہارے ماضی کے متعلق بھنک بھی مل گئی تو شاید ہم تم تو محفوظ ہی رہیں لیکن میرے بہن بھائیوں کی فیملی لائف اس سے بہت زیادہ متاثر ہوگی' بہت سے رشتہ دار ہم سب سے منسلک رشتے توڑنے کی کوشش کریں گے' میری بہنیں خاص طور پر بے قصور سزا پائیں گی اور میں ایسا کبھی نہیں چاہوں گا۔

پھر ہم دونوں ہیں۔ سب مجھ پر... حتی الامکان دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گے' میں نے تمہیں چھوڑ دینے کے لیے تم سے شادی نہیں کی۔ تم ہمیشہ میری بیوی رہوگی' لیکن یہ عین ممکن ہے کہ ذہنی پریشانی میں ہمارے آپس کے تعلقات کشیدہ ہونے لگیں۔

لیکن ان سب سے بڑھ کر تمہاری عزت اہم ہے۔ ایک سے دوسرے کان میں بات پہنچتے کیا دیر لگتی ہے۔ لوگوں کی زبانیں بہت سفاک ہوتی ہیں۔ میں کسی صورت تمہاری بدنامی گوارا نہیں کر سکتا' جو ہو گیا سو ہو گیا۔ ہمارے اختیار میں اسے پلٹ دینا نہیں ہے لیکن مستقبل ہمارے اختیار میں ہے۔

یہ باتیں تو نجی سطح کی تھیں میری پروفیشنل لائف بھی ہے۔ ہمارے علاقے میں لوگ بہت مذہبی ہیں اور ان کی سوچ کا اپنا ایک انداز ہے۔ وہ بہت سی باتیں معاف کر دیتے ہیں لیکن کوئی ایسی بات معاف نہیں کرتے جس میں کسی عورت کے ساتھ غلط قسم کے تعلقات کا ذکر آئے۔ ہم لمبی چوڑی وضاحتیں نہیں دے سکیں گے اور اگر دینے لگیں تو بات زیادہ بگڑے گی' حقیقت گم ہونے لگے گی افسانے نکلنے لگیں گے۔ بدنامی زیادہ ہوگی' تمہارے کردار پر بھی دھبہ آئے گا اور مجھ... پر بھی یہی نہیں میرا کیریر بھی بالکل تباہ ہو جائے گا۔ نہ وکالت رہے گی اور نہ سیاست۔''

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے میں انور کے لیے خوشی کے بجائے تردد کا باعث بن رہی تھی۔ اور پھر میں نے یہ بھی تو سوچا تھا کہ اپنی محبت اور خدمت کا ان سے صرف ایک صلہ مانگوں گی۔ کسی صورت میری بیٹی میری طیبہ مجھے واپس مل جائے۔ اب جب میں اسے ایک اچھے اور بہتر ماحول میں رکھ سکتی تھی تو اس کے اپنے سے دور ہونے کا احساس لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اسے جی بھر کے دیکھوں پیار کروں اسے اپنے سینے سے اس طرح بھینچ لوں کہ پھر وہ کہیں نہ جائے' ہمیشہ کے لیے میرے پاس رہ جائے۔

انور کو میری سوچوں کی خبر نہیں تھی لیکن وہ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''رونا نہیں۔ پتا ہے آسیہ سب لوگ میری طرح نہیں سوچتے اور پھر حقیقت جان لینے میں بھی تمہاری رسوائی کا پہلو نکلتا ہے میں تمہارے دامن پر کوئی داغ نہیں دیکھ سکتا۔ تم میرے لیے بہت اہم ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جہاں جاؤ لوگ تمہاری عزت کریں' تمہاری مثالیں دیں تمہیں دیکھ کر احترام سے کھڑے ہو جائیں' جسے سب کچھ معلوم ہونا چاہیے اسے ہر بات کا علم ہے ہر ایک کو یہ سب بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔''

''میں طیبہ کا سوچ رہی تھی۔'' میرا ضبط جواب دے گیا۔

''بھول جاؤ اسے میری بات تمہیں ظالمانہ تو لگے گی' مگر یہ حقیقت تم جتنی جلدی قبول کر لو اتنا ہی اچھا ہے۔ تم نے بتایا ہے کہ وہ اچھے گھر میں گئی ہے' اور تم نے بھی وعدہ کیا ہے کہ تم اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھوگی۔ یہ تم دونوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔ وہ تمہارے پاس آئی یا تم اس کے پاس گئیں تو تم دونوں کو بہت سی وضاحتیں دینی پڑیں گی اور تم دونوں کے دامن داغدار ہوں گے۔ اب زندگی نے تم دونوں کے لیے جو راستے متعین کر دیئے ہیں انہی پر چلتے رہنے میں دونوں کا بھلا ہے۔ بھول جاؤ کہ تمہاری کوئی بیٹی بھی ہے۔''

میں بری طرح سے رو پڑی کچھ دیر انہوں نے مجھے روتے رہنے دیا پھر بولے۔

''کبھی کسی مرض سے شفایاب ہونے کے لیے کڑوی دوا پینی ہی پڑتی ہے۔ چلو اٹھو۔''

میں بہت مشکل سے خود کو نارمل کر پائی تھی کہ سرائے عالمگیر آ گیا۔ یہاں اور اس سے آگے میری کتنی یادیں قدم قدم پر بکھری ہوئی تھیں۔ نہر عبور کرتے ہی بائیں ہاتھ پر ملٹری کالج جہلم کی عمارت تھی۔ بڑی اماں کی بیٹی جنہیں میں پھوپھو کہتی تھی' ان کے دو بیٹے یہاں زیر تعلیم

ہوا کرتے تھے اور باقی گھر والوں کے ساتھ میں بھی اکثر یہاں آیا کرتی تھی۔ میں بے اختیار انور کو متوجہ کرنے لگی لیکن پھر رک گئی۔

''جس لمحے ہمارا نکاح ہوا تھا اس لمحے ماضی سے تمہارا تعلق ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔'' انہوں نے کہا تھا۔

ملٹری کالج اور اس کی روشوں کو چھوڑ کر ہم سڑک پر آگے بڑھ گئے تھے' کچھ ہی دیر میں ہم نئے پُل پر تھے۔ نیچے دریا کے ساتھ پتھروں کا وہ چھوٹا سا بند جہاں تک ہم سیر کرنے آیا کرتے تھے۔ اور ذرا آگے بائیں ہاتھ پر گالف روڈ اور دائیں ہاتھ پر چرچ اور اس کے قریب اسکول۔

سب کچھ بھول کر میں نے انور کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''انور!''

''انہوں نے میری طرف دیکھا۔

''ہوں۔''

''کچھ نہیں۔'' میں اتنا ہی کہہ سکی۔ میرے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا پھنسا ہوا تھا۔

دور سے اسکول میں لڑکے لڑکیاں دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے کتنے میرے کلاس فیلو ہوں گے۔ میری سہیلیاں' میرے دوست ہوں گے اور اب نہ جانے میں ان کے درمیان کس انداز میں گفتگو کا موضوع بنتی ہوں۔

چند لمحوں میں ہی ہم آگے نکل آئے اور میں ایک مرتبہ پھر بری طرح سے رونے لگی۔ ضبط کی بہت کوشش کے باوجود بھی میں خود پر قابو نہیں پا سکی تھی بڑی اماں شدت سے یاد آنے لگی تھیں۔ ریت میں سوئے ہوئے دریا کو دیکھ کر وہ سب لمحے یاد آ گئے تھے جب میں اپنے دکھ درد ان لہروں سے کہہ دیتی تھی۔

انور خاموشی سے کار ڈرائیو کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ ... میں نے خود پر قابو پا لیا۔

اسلام آباد میں ہوٹل میں ہمارے لیے پہلے ہی کمرا بک تھا۔ راستے بھر میرے ذہن میں کچھ سوال چبھتے رہے تھے۔ سفر میں' میں نے جان بوجھ کر اس موضوع سے اجتناب کیا تھا۔ اب سفر کی تھکن اتار کر جب ہم مل بیٹھے تو میں نے انہیں زبان دے دی۔

''آپ اپنے گھر والوں سے میرا تعارف کس انداز میں کروائیں گے؟''

''کیسے کروانا ہے؟ ظاہر ہے تم میری بیوی ہو تو اسی انداز میں تعارف بھی کرواؤں گا۔'' انہوں نے اطمینان سے کہا۔

''نہیں میرا مطلب ہے کیا کہیں گے جو حقیقت ہے' وہ تو آپ نہیں بتانا چاہتے میں اس لیے پوچھ رہی ہوں تاکہ کوئی اس بارے میں مجھ سے کچھ پوچھے تو مجھے بھی علم ہو۔'' میں نے وضاحت کی۔

''میں یہ بتاؤں گا کہ تمہارا تعلق مقبوضہ کشمیر سے ہے۔ تم کچھ عرصے کے لیے برطانیہ گئی تھیں وہاں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ اب جب وہاں حالات خراب ہونے لگے ہیں تو اسی میں تمہارے والدین کا بھی انتقال ہو گیا ہے' تمہارے قریبی عزیز برسوں پہلے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے تھے' صرف تمہارے والدین وہاں تھے۔ اب اس جگہ تمہارا کوئی نہیں' یہاں بھی تمہاری واقفیت کسی کے ساتھ نہیں رشتے داروں کا علم نہیں پھر بھی محض ایک امید کے سہارے یہاں چلی آئیں کہ اور کچھ نہیں تب بھی یہ مسلمانوں کا وطن تو ہے' تم نے مجھے خط لکھا اور لاہور آ گئیں' وہیں ہماری ملاقات ہوئی اور میں نے تمہیں پرپوز کیا۔ تمہارے پاس ایک یہی راستہ تھا' سو تم نے یہ پرپوزل قبول کر لیا۔''

میں کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ''اس کہانی میں بہت جھول نہیں ہیں؟''

''تمہارا پاسپورٹ کوئی نہیں چیک کرے گا۔ بہت ضرورت پڑے تو اپنے کچھ رشتہ دار ایجاد کر لینا۔ انگریزی بھی تمہاری گزارے لائق ہے' کچھ نہ کچھ کام چل جائے گا۔ کہیں کسی کے سوال جواب سے زیادہ دقت پیش آ جائے تو رونے سے کام نکال لینا۔ زیادہ الزام میں اپنے سر ہی لے لوں گا۔ مل ملا کر کچھ نہ کچھ کام چلا ہی لیں گے۔ اب میں عام سا بندہ کہاں سے ایک ڈراما بنا لوں۔ یوں بھی اپنے جیسوں کو ہی اُلو بنانا ہے وہ ہنسی خوشی اُلو بننے پر راضی ہو جائیں گے۔''

جبکہ میرا خیال اس کے برعکس تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کہانی پر کوئی یقین نہیں کرے گا اور انور کے رشتہ دار خاصی کرید کریں گے' جب میں نے زیادہ بحث کی تو انور تنگ آ گئے۔

''ارے بابا تم چپ کر جانا۔ میں خود سب سنبھال لوں گا۔ آخر اتنی باریکیوں میں اترنے کی کیا ضرورت ہے۔''

مظفر آباد میں جیسے جیسے ہم گھر کے قریب پہنچ رہے تھے' میرا حال برا ہو رہا تھا۔

”مجھے لگ رہا ہے جیسے تمہارا ہارٹ فیل ہونے والا ہے۔“ انہوں نے میری طرف دیکھا۔

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے‘ انور پلیز مجھے چھوڑنا نہیں‘ میرا آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔“ میں نے بمشکل آنسو ضبط کیے ہوئے تھے۔

”پاگل ہوئی ہو؟ اپنی زندگی چھوڑ دوں گا کیا۔ میں نہ تمہیں چھوڑ سکتا ہوں اور نہ گھر والوں کو اس لیے کچھ میں ان کی سنوں گا کچھ انہیں اپنی سناؤں گا۔ چند دن ناراض رہیں گے پھر خود راضی بھی ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر کہ یہ بھی شکر ہوا میں نے شادی کر لی۔“

شہر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے میرا دھیان بٹانے کے لیے مجھے شہر کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

”یہ دومیل کا علاقہ کہلاتا ہے۔ اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ یہاں دو دریا یعنی نیلم اور جہلم ملتے ہیں‘ کبھی تمہیں یہاں لاؤں گا۔ یہ نظارہ بہت خوبصورت ہے۔ ایک طرف نیلم کا صاف اور بے حد شفاف پانی ہے‘ اور دوسری طرف جہلم کا گدلا پانی‘ جب دونوں ملتے ہیں تو بیچ میں ایک واضح لکیر دکھائی دیتی ہے‘ جو دونوں پانیوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔“

میری ذہنی حالت کب ایسی تھی کہ دومیل کی خوبصورتی پر توجہ دیتی۔

”یہ چیف جسٹس کا مکان ہے‘ یہ مکان فلاں وزیر کا ہے۔“ وہ بتاتے جا رہے تھے۔

”پہلے ہم ایر پلیٹ کے علاقے میں رہتے تھے۔ اب بمشکل مہینہ بھر پہلے جلال آباد گارڈن شفٹ ہوئے ہیں۔“

”انور مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ میں نے ان کی بات کاٹی۔

”اب تمہارے ڈر کا کیا علاج کروں۔ ہم آنکھیں بند نہیں کر سکتے‘ جو کچھ بھی گھر والوں کا ردِعمل ہوگا ہمیں اس کا سامنا کرنا ہوگا۔ بلکہ یہ بھی میں اکیلا ہی فیس کر لوں گا۔ مجھے لگتا ہے کہ تم تو گھر میں داخل ہوتے ہی بے ہوش ہو جاؤ گی۔ اور بیوی میں ڈرائیونگ کر کے اتنا تھک گیا ہوں کہ اب ہسپتال کی دوڑ بھاگ نہیں کر سکتا۔“

کار گھر کے گیٹ میں داخل ہوئی تو لان اور چار دیواری پر چڑھے چار پانچ بچے بھاگ کر ہماری طرف آ گئے۔ کوئی ”چاچو“ کہہ کر انور سے لپٹ گیا اور کوئی ”ماموں آ گئے“

چلانے لگا۔ انور نے باری باری سب کو پیار کیا۔

”چاچو! یہ کون ہیں؟“ ایک بچے نے میری جانب اشارہ کر کے رازداری سے پوچھا۔

”ارے بھئی تمہاری چاچی ہیں اور تمہارے چاچو کے ساتھ کون بیٹھ سکتا ہے۔“ انہوں نے خوش دلی سے کہا اور میرا دل جیسے ڈوبنے لگا۔

بچوں نے حیرت اور بے یقینی سے میری جانب دیکھا۔

”چاچی ہیں؟“ ایک نے میرا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”تمہاری مامی ہیں۔“ انور نے اس بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ایک لمحے میں بچے ”چاچی آ گئیں‘ مامی آ گئیں۔“ چلاتے ہوئے گھر کے اندر دوڑ گئے۔

میں نے انور کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ رنگت زرد ہو رہی تھی۔

”ریلیکس آؤ۔ اندر چلو‘ گھبرانا مت‘ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ انہوں نے مجھے تسلی دی۔

بچوں نے اس قدر شور مچایا تھا کہ گھر کی آدھی خواتین ہمیں دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ہی مل گئیں۔ انور سے ملتے ہی سبھی میرے بارے میں متجسس تھیں۔

”ہمیں اندر تو آنے دیں۔“ بالآخر انور نے کہا۔ اندر داخل ہو کر تھوڑی ہی دور دائیں ہاتھ پر انور کا کمرا تھا۔

”آسیہ! تم اندر جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

میں نظریں جھکائے جلدی سے اندر گھس گئی۔ انور نے دروازہ بھیڑ دیا۔

وہ خاصا کشادہ اور آرام دہ کمرا تھا۔ آرائش بہت زیادہ جدید اور شاندار تو نہیں تھی لیکن اچھی تھی۔ گلدان میں پھول تھے۔ ایئر فریشنر بھی چھڑکا ہوا تھا۔ بستر پر صاف ستھری بے شکن چادر تھی۔ خوبصورت قالین تھا۔ لکھنے پڑھنے کے لیے میز اور کرسی تھی۔ پردے تنے ہوئے تھے جس کی وجہ سے کمرا نہ بہت روشن تھا اور نہ بہت تاریک۔ باتھ روم کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا‘ جس کی صاف ستھری ٹائلز چمک رہی تھیں۔

میں بستر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی اور کان دروازے کے باہر کی آوازوں پر لگا دیئے جو زیادہ واضح نہیں تھیں۔ گو کہ الفاظ میری سمجھ سے باہر تھے‘ لیکن ملی جلی آوازوں کے زیروبم سے تھوڑی ہی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ باہر جھگڑے کی صورت پیدا ہو گئی ہے میرا دل بیٹھنے

لگا۔ جیسے جیسے جھگڑا بڑھتا جا رہا تھا میری حالت بری ہو رہی تھی۔ پھر اچانک ہی میں رونے لگی۔ کافی دیر بعد دروازہ کھلا۔ میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ آنے والے انور تھے۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے آرام سے بیٹھو۔'' وہ بھی صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگے پھر بولے ''غلطی ہوئی چائے باہر سے پی آنی چاہیے تھی' یہاں گھر میں تو فی الحال ایک کپ ملنے کا بھی امکان نہیں ہے۔'' میں بستر پر بیٹھ گئی۔

''تمہیں بھوک تو نہیں لگ رہی؟'' انہیں اچانک خیال آیا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''پتا نہیں تمہیں بھوک کیوں نہیں لگتی۔ خبر نہیں آج کھانا بھی ملے گا یا نہیں۔ چلو نہ ملا تو باہر کھا آئیں گے۔'' میں ان کے اطمینان پر حیران تھی۔

''گھر والوں سے کیا بات ہوئی؟'' میں پوچھا۔

''کچھ رونا دھونا ہوا' کچھ ڈانٹ ڈپٹ ہوئی۔ میں نے سب سن لیا کہ یوں بھی اب کیا ہو سکتا ہے' شادی تو ہو گئی۔ اللہ کے فضل سے ہمارے خاندان میں بیوی چھوڑنے کی کوئی روایت نہیں ہے۔ چاہے مر کر' چاہے جی کر' یہ رشتہ بہر حال نبھایا جاتا ہے۔ سو اب گھر والے سوائے رونے یا ڈانٹنے کے یا کھانا بند کر دینے کے اور کیا کر سکتے ہیں۔'' وہ بستر پر دراز ہو گئے۔

''گویا مان گئے؟''

''نہ ماننے کا کیا سوال؟ لیکن فی الحال ناراض ہیں سب۔ ڈانٹ ڈپٹ کا دوسرا دور امید ہے کہ رات کے کھانے کے بعد ہو گا' تب تک گھر والوں کی کانفرنس میں بھی کچھ نہ کچھ طے ہو گیا ہو گا۔''

''کیا طے ہو گیا ہو گا؟'' میرے جسم سے جیسے جان ہی نکل گئی۔

''یہ کہ ڈانٹنے کی مزید کتنی ڈوز دینی ہے اور کتنے دن تک ناراض رہنا ہے۔''

چائے تو نہیں آئی' البتہ رات کا کھانا کمرے میں ہی پہنچ گیا۔ کھانے کے بعد حسب توقع انور کی پیشی ہوئی۔

''تم آرام سے سو جاؤ' مجھے شاید تھوڑی دیر ہو جائے۔''

یعنی ان کا خیال تھا کہ ان حالات میں' میں آرام سے سو سکتی تھی۔ یہاں نیند آنکھوں

سے کوسوں دور تھی۔ کتنی دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد بالآخر میں بستر پر لیٹ گئی۔ اس وقت شاید رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ جب وہ کمرے میں آئے۔

''کیا ہوا؟''

''تم سوئیں نہیں؟ مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے۔ تھکاوٹ بھی بہت ہے' صبح بات کریں گے؟''

تھکاوٹ مجھے بھی بہت تھی لیکن ذہنی انتشار کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پر کہاں تک سوچتے سوچتے میں بھی نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

صبح نماز پڑھ کر فارغ ہوئی۔ پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو لان بالکل خالی تھا۔ انور ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔ میں آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ گھر کے اندر بھی خاموشی تھی۔ بیرونی دروازہ کھول کر برآمدے سے ہوتی ہوئی میں لان میں نکل آئی اور ننگے پاؤں گھاس پر چہل قدمی کرنے لگی سورج ابھی دور ایک گولہ سا بنا ہوا تھا۔

چہل قدمی کرتے ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ انور کے امی ابو برآمدے میں نکل آئے۔ مجھے دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکے اور پھر برآمدے میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دونوں کے ہاتھ میں سپارے تھے۔ ان کے پیچھے ایک ملازمہ چائے کی ٹرے اٹھائے لے آئی اور وہیں میز پر رکھ کر مجھے دیکھتے ہوئے اندر چلی گئی۔

میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ انہیں نظر انداز کر دیتی۔ ان کے چہروں پر ناراضگی چھائی ہوئی تھی۔ سر پر رکھی ململ کی چادر ٹھیک کر کے اور جوتے پہن کر میں ان کے قریب چلی آئی۔

''السلام علیکم۔'' میں نے کہا۔

لیکن انہوں نے نظر انداز کر دیا۔

''آسیہ؟'' میں نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔ ''آج انہیں اپنا بنا لیا تو ٹھیک ورنہ پھر شاید کبھی یہ اپنے نہ بن پائیں۔''

''چائے بنا دوں؟'' میں نے ہولے سے پوچھا۔ انہوں نے پھر مجھے نظر انداز کر دیا اور سپارے کھول لیے۔ ایک لمحے میں مایوسی نے مجھے آن گھیرا میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''پلیز ایسا مت کریں۔ میں بری لڑکی نہیں ہوں۔ میں تو اس امید پر یہاں آئی تھی کہ جن رشتوں کے لیے میں ہمیشہ تڑپتی رہی ہوں' وہ مجھے یہاں پر مل جائیں گے۔'' میرے حلق

میں آنسوؤں کا گولا پھنس رہا تھا۔ ''میرا اس دنیا میں انور کے سوا کوئی نہیں ہے پلیز انہیں مجھ سے مت چھینیں۔ یہ جو قرآن پاک آپ کے ہاتھ میں ہے' میرا بھی اس پر ایمان ہے' میں اس کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں حالات کی ستائی ہوئی ایسی لڑکی ہوں' جس سے یہ رشتہ چھن گیا تو اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہے گا۔ نہ محبت نہ سائبان' نہ عزت۔'' میں بری طرح سے رو پڑی۔

چند لمحے وہ میری طرف دیکھتے رہے۔ سچائی کھوجنے کی کوشش کرتے کرتے رہے پھر ان کا دل پسیج گیا۔ انور کی امی میرے قریب بیٹھ گئیں اور میرے آنسو صاف کرنے لگیں۔

''تم نے ہمیں ہماری زندگی کی بہت بڑی خوشی سے محروم کر دیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ فرض ہم اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے۔ انور کہتا ہے کہ آپ نے چھ بچوں پر اپنے ارمان پورے کر لیے ہیں۔ ابھی اس کی اپنی اولاد نہیں ہے ناں ورنہ جانتا کہ ہر بچہ اپنی جگہ اہم ہوتا ہے' ماں باپ کو بہت پیارا ہوتا ہے۔ والدین کے ارمان سب بچوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

اور چلو ہمیں تو چھوڑو ہم اس کی خوشی میں خوش ہو جائیں گے۔ مگر اس شہر میں ہماری بہت عزت ہے۔ جگہ بھی چھوٹی سی ہے' نمایاں لوگوں کو سبھی جانتے ہیں۔ اب جو لوگوں کے سوال و جواب ہوں گے اور جو افسانے وہ بنائیں گے' ان سے ہم تم کیسے بچیں گے؟ ہمارے ہاں اب تک خاندانی روایات اور اقدار برقرار ہیں۔ جس حق کا استعمال انور نے کیا ہے' وہ ہمارے ہاں اب تک والدین کے پاس ہے۔ ایسے میں یہ بات اچھی تو نہیں سمجھی جائے گی۔ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں۔ جو اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ کسی شخص کا تعلق کس قسم کے خاندان سے ہے۔ بہرحال اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ لیکن یہ اچھا نہیں ہوا۔''

میں تھوڑی دیر تک سر جھکا کر روتی رہی پھر بولی۔

''میرے بس میں اتنا ہی ہے کہ کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہ دوں۔''

''ہمارے خاندان میں کبھی نہیں ہوا کہ کسی لڑکی نے خود شادی کی ہو یا گھر والوں نے کسی ایسی جگہ شادی طے کر دی ہو' جہاں لڑکے کے گھر والے قاعدے کے مطابق رشتہ نہ لائے ہوں۔'' ان کی امی نے کہا۔

''میرا تو کوئی بھی نہیں ہے نہ ماں باپ نہ بہن بھائی۔'' میرے آنسو بہہ رہے تھے۔

''کوئی بھی نہیں؟ ماں باپ کہاں ہیں؟''

''میری ماں میری پیدائش کے ساتھ ہی فوت ہو گئی تھیں۔'' میری آنکھوں کے سامنے اپنے جہلم والے مکان کے ساتھ بہتا دریا آ گیا' جس میں سے برسوں پہلے ایک جل پری نکلی تھی۔ میں پھر ضبط کھو بیٹھی۔ ''اور جس کی ماں نہ ہو اس کا کوئی نہیں ہوتا۔''

مجھے یوں بری طرح سے روتے دیکھ کر ان کی امی چپ کرانے لگیں۔ کچھ دیر بعد ان کے ابو نے پوچھا۔

''آپ کو نماز آتی ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''قرآن پاک پڑھنا جانتی ہیں۔''

میں نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہ پڑھ کر سنا سکتی ہیں؟'' انہوں نے اپنا سپارہ میرے سامنے کر دیا۔

میں نے انہیں پڑھ کر سنا دیا۔

''جزاک اللہ جیتی رہیں۔'' انہوں نے کہا۔

میرے دل میں خوشی کی لہر اٹھی۔ میں نے تشکر آمیز انداز میں ان کی جانب دیکھا۔

''چائے بنا دیں۔'' پھر ان کے ابو نے کہا۔ اپنی ململ کی چادر سے آنسو پونچھ کر میں نے چائے بنا کر دونوں کو پکڑا دی۔

''آپ کا نام آسیہ ہے؟''

''جی!'' میں نے کہا۔

''تو آسیہ بیٹی اب آپ اس خاندان کی بہو بن گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس رشتے کو قائم رکھے' یوں یہ شادی ہونا غلط تھا لیکن اب اس رشتے کو توڑ دینا اور زیادہ غلط ہوگا لیکن آپ پر بہت ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ہمارا گھرانہ یہاں کا بہت معزز اور شریف گھرانہ ہے۔ ہماری اپنی کچھ روایتیں ہیں۔ آپ کو ان سب کا پاس کرنا ہوگا۔ کیا ہم آپ سے اس بات کی توقع رکھیں؟'' ان کے ابو نے کہا۔

''آپ کو مجھ سے کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' میں نے بھرپور یقین کے ساتھ کہا۔

ابھی میری بات بمشکل ختم ہوئی تھی کہ گھر کے اندر سے برآمدے میں کھلنے والا دروازہ

زوردار آواز میں کھول کر انور باہر آئے۔ پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی انہوں نے سکون کا سانس لیا۔

''تھینک گاڈ۔ تم نے مجھے پریشان ہی کر دیا تھا۔ میں نے کہا کہ میری بیوی نہ جانے کہاں چلی گئی۔'' پھر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ ''مجھے نہیں پتا تھا کہ تم نے بہو کے فرائض سنبھال لیے ہیں۔''

ان کی باتوں سے مجھے بے چینی ہونے لگی۔ ان کی امی بہت باریک بینی سے ان کا اور ان کے لہجے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''چند دن میں ہی بھول گئے ہو کہ بزرگوں کو سلام بھی کیا جاتا ہے۔'' ان کا لہجہ تیکھا ہوگیا۔

نہ جانے کیوں مجھے لگا جیسے اس بارے میں وہ مجھے قصوروار ٹھہرا رہی ہیں' میں خواہ مخواہ چور سی بن گئی۔

''امی! ابھی تو آنکھیں بھی پوری طرح نہیں کھلیں۔ صبح صبح مجھے یہ سبق یاد نہیں رہتے۔'' میں نے کن انکھیوں سے ان کی امی کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر بدمزگی کے تاثرات تھے' پھر میں نے انور کی طرف دیکھا وہ ہمیشہ کی طرح مطمئن تھے۔ جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو' ان کی آنکھوں میں ابھی بھی نیند کا خمار تھا۔ کپڑوں پر سلوٹیں تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے۔

ان کے والدین نے چند دن بعد ولیمے کا انتظام کیا۔ رشتہ داروں اور دوست احباب کے سامنے یوں ظاہر کیا جیسے ان کی مرضی سے انور نے یہ قدم اُٹھایا ہو۔ زبردستی مسکراتے بھی رہے اور میری تھوڑی بہت تعریف بھی کی۔ مرد تو یوں بھی زیادہ وقت باہر گزارتے تھے' اس لیے ان کی طرف سے گھریلو سطح پر مجھے کچھ خاص پریشانی نہیں ہوئی البتہ عورتوں نے مجھے برسوں تک اپنے خاندان میں قبول نہیں کیا اور اس کا برملا اظہار کرتی رہیں۔

بہنوں' بھابیوں' نے انور کے لیے اپنی طرف سے کافی رشتے ڈھونڈ رکھے تھے' خاندان کے بہت سے گھروں نے بھی اس بارے میں امید لگا رکھی تھی یہ تو مجھے ان کے خاندان میں آنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اپنی پسند سے شادی کر لینا' وہ بھی ایسی لڑکی سے جس کا کوئی خاندان ہی نہ ہو' یہاں کوئی عام اور چھوٹی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ میری ساس نہ بہت اچھی

تھیں نہ بہت بری۔ یہ خلش ان کے دل میں بہرحال موجود تھی ہی کہ انور کی دُلہن وہ اپنی پسند سے نہیں لا سکیں۔ عام گھرانوں کی طرح کبھی وہ مجھ سے ناراض ہو جاتیں' کبھی راضی۔

کبھی کبھار میں پریشان ہو جاتی تھی ان رویوں سے' اپنی طرف سے میری پوری کوشش ہوتی تھی کہ کسی کو میری ذات سے شکایت نہ ہو' تکلیف نہ پہنچے۔ حتی الامکان میں سب کے کام آنے کی کوشش کرتی تھی۔ کام کاج' سلائی' کڑھائی' سب میں ماہر تھی۔ اس لیے جلد ہی گھر کا انتظام میرے سپرد ہوگیا۔ بڑی بڑی دعوتوں اور تقریبات کا اہتمام میں تنہا ہی کر لیا کرتی تھی۔ خاندان کی جس لڑکی کو فوری طور پر نئے کپڑے سلوانا ہوتے تھے وہ میرے پاس ہی آتی تھی۔ سردیوں میں باقی کام کے ساتھ سب کو سوئیٹر بُن بُن کر دینا بھی روزمرہ کے کاموں کا حصہ تھا۔ صبح سے شام تک ہلکان ہونے کے باوجود میرا کہیں نام نہیں تھا۔

پھر بھی میں مطمئن تھی۔ کم از کم یہاں میں باہر کی دنیا کے بھیڑیوں سے تو محفوظ تھی۔ کہیں میری خرید و فروخت تو نہیں ہو رہی تھی۔ اور پھر انور تھے' بہت محبت کرنے والے شوہر انہوں نے کبھی بھولے سے بھی کہیں میرے ماضی کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ کبھی کوئی طعنہ نہیں دیا تھا۔ شادی کے دو سال بعد میری گود میں ننھا منا سا چاند اُتر آیا تھا۔ انور کے ابو نے اس کا نام کامران رکھا۔ اس کے بعد کافی وقفے سے آمنہ بہار بن کر ہماری زندگی میں آ گئی اور یوں ہمارا گھر مکمل ہوگیا۔ انہیں پیار کرتے ہوئے ان کے ناز اٹھاتے ہوئے' فرمائشیں پوری کرتے' میرے ذہن میں بار بار طیبہ کا خیال آتا تھا۔ وہ بھی میری بیٹی تھی' کوئی چاہے کچھ کہتا لیکن وہ بھی میرے جسم کا حصہ تھی۔ اور میں سمجھتی تھی کہ اس کا بھی مجھ پر ایسا ہی حق تھا۔ تنہائی میں بہت شدت سے مجھے اس کی یاد آتی تھی۔

''اب وہ کتنی بڑی ہوگئی ہوگی' پڑھتی ہوگی' کھیلتی ہوگی' اپنی ہنسی سے ان اجنبیوں کا آنگن مہکاتی ہوگی جو اس کے کچھ نہیں پھر بھی سبھی کچھ ہیں۔ پتا نہیں وہ آمنہ اور کامران کی طرح شرارتیں کرتی ہوگی یا نہیں؟ کیا خبر اسے اتنی محبت ملے گی یا نہیں' جتنی میں آمنہ اور کامران کو دیتی ہوں' جتنی محبت انور بچوں سے کرتے ہیں۔ کیا وہ کسی سے اپنے دل کا حال کہہ سکتی ہوگی یا نہیں؟ اس کی شکل و صورت کیسی ہوگی؟''

کبھی بازار میں کتابیں اور کپڑے دیکھ کر اچانک مجھے خیال آتا تھا۔

''ہاں' اب تو طیبہ اس کلاس میں ہوگی ایسی ہی اس کی کتابیں ہوں گی' اور اتنی ہی بڑی

ہوگی کہ یہ کپڑے اسے پورے آ جائیں۔"

کیا کوئی ایک لمحہ بھی ہوگا جب میں نے اسے نہ یاد کیا ہو۔ اپنی ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ میں نے اس کے لیے دعا کی تھی۔

گھر کے باہر انور کے حوالے سے ہر جگہ میں معتبر تھی۔ انور کا سیاسی کیریر شادی کے بعد ایک دم جست لگا کر آگے بڑھا تھا۔ میرے بس میں اس قدر تھا کہ گھر کو پُرسکون رکھوں تا کہ اس طرف سے مطمئن رہتے ہوئے وہ اپنی سیاسی اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں پر زیادہ توجہ دے سکیں۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے گھر کے ساتھ ساتھ باہر کی بھی بہت سی ذمہ داریاں میں نے اپنے سر لے لی تھیں' بچوں کا اسکول ہو یا خاندان کی کوئی تقریب ہر ذمہ داری میں بخوبی نبھا رہی تھی۔ چھوٹے موٹے مسائل خود ہی حل کر لیتی تھی' گھریلو جھگڑوں سے بھی انہیں بالکل الگ کر رکھا تھا۔

انور چاہتے تھے کہ میں سماجی سرگرمیوں میں حصہ لوں۔ میں نے اس سے انکار نہیں کیا تھا لیکن انہیں محدود کر رکھا تھا تا کہ گھر اور بچے متاثر نہ ہوں۔ میرا سب سے زیادہ شوق تھا کہ میرے بچے مہذب اور صاف ستھرے نظر آئیں اور میرا گھر ہر وقت سجا بنا رہے' میرے شوق کی تکمیل کی خاطر انور جب بھی بیرونِ ملک جاتے تھے' گھر اور بچوں کے لیے بہت کچھ لاتے تھے' ہر جگہ میرے گھر کی خوبصورتی اور صفائی ستھرائی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ بس میرے قریبی سسرالی عزیز ہی اس بارے میں خاموش رہتے تھے۔

پچھلے انتخابات میں انور نے بھی حصہ لیا تھا اور حسب توقع وہ انتخاب جیت بھی گئے تھے' پھر کچھ دنوں بعد انہیں وزارت کے لیے نامزد کر دیا گیا۔

"آسیہ! یہ سب تمہاری وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ اگر تم نہ ہوتیں تو میں کبھی اتنی جلدی اتنی آگے نہیں پہنچ سکتا۔" انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔

یہ بات کتنی خوشگوار تھی کہ اور کوئی نہ بھی سہی' انور میری قربانیوں کو جانتے اور مانتے تھے۔

"یہ صرف آپ کی محنت اور خلوص کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔" میں نے ان سے کہا۔ "اگر میرا گھر اتنا پُرسکون نہ ہوتا تو یہ محنت بھی میرے لیے ممکن نہیں ہوتی۔"

نندیں تو پہلے ہی اپنے اپنے گھروں میں رہتی تھیں جیٹھوں کی فیملی میں جیسے جیسے اضافہ

ہوا وہ بھی الگ ہونے لگے۔ اور اب ہمیں بھی حکومت کی طرف سے چھتر میں مکان مل رہا تھا۔ سو میں بھی سسرال سے الگ ہو گئی۔ جلال آباد گارڈن سے چھتر جانے یا نہ جانے کا فیصلہ میں نے انور پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ ان کی آنکھیں بھی بند نہیں تھیں۔ انہیں بھی علم تھا کہ اتنے لوگوں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے میرا کیا حال ہوتا تھا۔ اس لیے اس موقع کو مناسب خیال کرتے ہوئے انہوں نے سرکاری مکان میں چلے جانے کو ترجیح دی۔

چھوٹا سا شہر تھا۔ میں اپنے سسرال کے مختلف گھروں میں چکر لگاتی ہی رہتی تھی۔ وہ مجھے اپناتے یا نہ اپناتے' مجھے انہیں اپنانا ہی تھا۔ میرا اپنا کون سا خاندان تھا۔ یہی لوگ میرے اپنے تھے کم از کم میرے بچوں سے تو بہت محبت کرتے تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے بچوں سے ان کے رشتے چھٹ جائیں۔ پھر میری بیٹی آمنہ تھی' مجھے اس کا خیال تھا۔ اسی لیے میں سبھی کے ساتھ محبت سے پیش آتی تھی۔ خود کسی روز نہ جا پاتی تو بچوں کو دادا' دادی سے ملوانے بھجوا دیتی۔

اب جب مجھے الگ مکان ملا تھا تو میں نے اسے بھرپور انداز میں سجایا تھا۔ مجھے خوشی ہوتی تھی' جب کوئی کہتا تھا کہ۔

"مسز بٹ! مجھے یقین ہے کہ پورے شہر میں اتنا منفرد اور خوبصورت سجاوٹ سے مزین اور کوئی گھر نہیں ہوگا۔"

اور جب کوئی میرے بچوں کی تعریف کرتا تھا تو میرا سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔

اپنے گھر پر کوئی نہ کوئی مذہبی محفل منعقد کرواتی رہتی تھی' جس میں شہر بھر کے نمایاں خاندانوں کی خواتین شرکت کیا کرتی تھیں' کبھی کسی ادبی محفل کا رنگ جمتا' کبھی خواتین اکٹھی ہو کر گھر سے متعلق ہنر سیکھتی' سکھاتیں' کبھی مقبوضہ کشمیر کے مظلوم مہاجروں کی مدد کے لیے کوئی پروگرام ترتیب دیا جاتا۔ کبھی عورتیں اپنے اور اپنے گھروں کے مسائل لے کر میرے پاس آتیں کہ میں انور سے کہہ کر انہیں حل کروا دوں۔

ایسے ہی مصروف دنوں میں' ایک روز میرے ساس سسر آئے' وہ آتے ہی رہتے تھے' یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی لیکن مجھے ان کے چہروں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اس وقت ان کا آنا معمول سے ہٹ کر تھا۔ انور کے ابو کی طبیعت بھی ان دنوں کچھ ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ بڑھاپے کے ساتھ کئی بیماریاں حملہ آور ہو جاتی ہیں۔

ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ رہنے کے لیے آئے تھے۔ میں نے فوراً اس سلسلے میں انتظام کیا۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ البتہ شام کو میرے دو جیٹھ آ گئے۔ اس وقت میں ساس سسر کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ آئے تو انہوں نے منہ پھیر لیا۔ پھر میری موجودگی کا خیال کرتے ہوئے انہوں نے اشاروں میں باتیں کیں۔ خاندان کے اکثر معاملات سب کے علم میں ہوتے تھے' لیکن مجھ سے چھپا لیے جاتے تھے۔ میں بھی زیادہ کرید میں نہیں پڑتی تھی۔ اب بھی جونہی مجھے احساس ہوا کہ ان کا آپس میں کوئی جھگڑا تھا میں معذرت کر کے وہاں سے اُٹھ آئی۔

چائے کے لوازمات ٹرالی میں سجا کر جب میں کمرے کے دروازے تک پہنچی تو انور کی امی کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔

''میں کہتی ہوں' میری تو خیر ہے لیکن تمہارا باپ بوڑھا بندہ ہے۔ بیمار ہے' اس کا تو خیال کرو۔ نہ وقت پر کھانا ملتا ہے نہ دوا۔ کسی کو اتنی توفیق نہیں کہ ڈاکٹر نے پرہیزی کھانا بتایا ہے وہی پکا کر کھلا دیں' دوائیاں کیا خاک اثر کریں گی۔''

میں باہر ہی رک گئی۔

''امی! وہ بیچاریاں بھی نکمی تو نہیں بیٹھتیں سو جنجال ہیں' بچوں کی دیکھ بھال الگ ہے۔'' ایک جیٹھ بولے۔

''بچوں کی دیکھ بھال کیا آسیہ نہیں کرتی؟'' امی نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''اس کے ہوتے کبھی ایسا ہوا تھا؟ گھر بھی دیکھتی تھی' میاں اور بچے بھی سنبھالتی تھی' باہر بھی نکلتی تھی۔ یہ سب نیت کی بات ہوتی ہے۔ اور اس سب کے باوجود گھر بھی اسی کا بہترین ہے اور بچے بھی اسی کے سب سے اچھے ہیں۔ تم لوگوں کی بیویاں بولتی زیادہ ہیں' کام کم کرتی ہیں۔ جب تک آسیہ وہاں تھی' کبھی اس نے شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔''

''جانے دیں امی! آپ کو بھی سب کی طرح آسیہ بھابی سے سو طرح کی شکایتیں تھیں۔''

''وہ میری تنگ نظری تھی ورنہ اس نے کیا نہیں کیا؟ میں سوچتی رہی کہ خاندان کی کوئی لڑکی آتی تو زیادہ خیال رکھتی۔ انور نے خود شادی کر لی تھی تو میرے دل میں کانٹا چبھ گیا۔ اس بیچاری نے جان ماردی پھر بھی کسی نے تسلیم نہیں کیا۔ آج جب وہ اس گھر میں نہیں ہے تو اس

کی قدر آتی ہے۔ گھر ویسے چلتا ہے جیسے وہ چلاتی تھی' اس طرح نہیں چلتا جیسے تم لوگوں کی بیویاں چلا رہی ہیں۔ کھانے کے وقت بھی پوچھتی ہیں کہ امی کھانا کھانا ہے؟ یہ نہیں کہ سامنے لا کر رکھ دیں۔ انسان ہیں۔ زندہ رہنا ہے تو کیا کھانے کے بغیر زندہ رہیں گے؟ اب بھی ہم آسیہ کی طرف آئیں تو وہ یہ نہیں پوچھتی کہ آپ کھانا کھا آئے ہیں یا یہاں کھائیں گے' ٹرالی میں نکال کر سامنے لا رکھتی ہے' پل کے پل میں تمہارے ابو کے لیے پرہیزی کھانا تیار کر دیتی ہے۔''

میری آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے' میرے اللہ نے میری قربانیاں رائیگاں نہیں جانے دی تھیں' خود پر قابو پا کر اور اپنی آنکھیں صاف کر کے میں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے اُٹھتی آوازیں تھم گئیں۔

چائے پینے کے دوران دونوں جیٹھ والدین سے اپنے ساتھ چلنے کے لیے اصرار کرتے رہے۔

''نہیں فی الحال ہم یہیں ٹھیک ہیں۔'' امی نے رکھائی سے کہا۔

''بھابی کو دقت ہوگی۔''

''آج تک یہی تمہاری بھابی کرتی آئی ہے' اب تک دقت نہیں ہوئی تو آئندہ بھی اسے دقت نہیں ہوگی۔''

یہ میری خدمتوں کا پہلا انعام تھا جو میری ساس نے میرے سامنے اعتراف کی صورت میں مجھے دیا تھا۔

میرے لیے جس حد تک ممکن تھا میں نے ان کی خدمت کی' ان کے رویے میں بھی میرے ساتھ واضح تبدیلی تھی۔ پھر ایک روز انہوں نے مجھے اور انور کو اپنے پاس بلایا۔

''جی ابو۔''

انہوں نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا اور انور سے مخاطب ہوئے۔

''مجھے نہیں معلوم کہ اس بیٹی کا خاندان کون سا ہے۔ اور کیسا ہے' میرے دل میں یہ خلش بھی ہمیشہ قائم رہی کہ ہماری یہ بہو خدانخواستہ ہمارے خاندان کے قابل نہیں ہے' کیونکہ جس طرح تم لوگوں کی شادی ہوئی یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ کسی اچھے خاندان کی لڑکی اس قسم کا کام کر سکتی ہے۔ یا اچھے کردار کی مالک لڑکی یوں شادی پر راضی ہو

سکتی ہے۔

پھر ہم پر بہو کا کردار واضح ہوا' گھر کے لیے اس بیٹی نے جو کچھ کیا' وہ بھی ہم سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اسے نماز روزہ کرتے بھی دیکھا' یہ ہمارے دکھ سکھ میں بھی ہمارا حصہ بن کر شریک ہوئی' اس کے باوجود ہم نے چشم پوشی کی' کبھی اس کی تعریف میں دو الفاظ بھی نہیں کہے' کبھی نہیں سراہا ہمیشہ اسے غیر ہی سمجھا۔ یہ خود شریک ہوتی تھی لیکن ہمیں اسے اپنے ساتھ شریک کرنا گوارا نہیں تھا۔

مگر اب ہمیں احساس ہوا ہے کہ یہ ہمارا ظلم تھا۔ میرے پاس زندگی کے زیادہ دن نہیں رہے میں نے اللہ کو جواب دینا ہے۔ سوچتا ہوں کہ جب وہ اس ظلم کی بابت پرسش کرے گا تو ندامت سے سر جھکانے کے علاوہ میرے پاس کیا جواب ہوگا؟''

''نہیں ابو جی! ایسا مت کہیں۔ میں نے ہمیشہ آپ دونوں کو اپنا والدین سمجھا ہے' اور جو کچھ آج تک میں نے کیا وہ میرا فرض تھا۔''

''اپنا فرض بھی تو بیٹی کوئی کوئی نبھاتا ہے۔'' انہوں نے آہ بھری۔

''میں بھی سب کچھ دیکھ رہا تھا اور چپ تھا تو صرف اس لیے کہ آپ لوگوں کا احساس کب جاگتا ہے' یہ دیکھ سکوں' مجھے فخر ہے آسیہ پر' میرا انتخاب غلط نہیں تھا۔'' انور نے محبت سے میری جانب دیکھا۔

مجھے لگا جیسے برسوں کی تھکن اتر گئی ہو' صرف چند الفاظ ہی تو ہوتے ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم کسی کو محبت سے سراہ دیں۔ اس سے کوئی چھوٹا نہیں پڑتا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں ہم تب تک بخل سے کام لیتے رہتے ہیں۔ جب تک کہہ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔

اس دن میں بہت خوش تھی۔ رات کو بچوں کو سلا کر خواب گاہ میں آئی تو انور حسب معمول فائلوں میں سر دیئے بیٹھے تھے۔

''بہت اہم کام کر رہے ہیں؟'' میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''سبھی کام اہم ہیں۔'' انہوں نے عینک کے پیچھے سے میری طرف دیکھا۔

''بیوی کو تھوڑا سا وقت دینا بھی اہم ہے ناں؟'' میں مسکرائی۔

''بیوی صابر شاکر قسم کی ہو تو اتنا اہم نہیں رہتا۔''

میں ہنس پڑی اور ان کے سامنے کھلی فائل بند کر دی۔ ''یہ راز شادی کے اتنے برسوں

بعد کھلا ہے ورنہ یوں صبر شکر کرنے کی حماقت نہ کرتی۔ اب آپ نے وقت نہ دیا تو باقاعدہ اعلانِ جنگ بھی ہو سکتا ہے۔ بیوی کے صابر شاکر ہونے کا اس قدر ناجائز فائدہ بھی مت اٹھائیں۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ ہم باتیں کریں۔ بہت ساری کتنے دن سے ہم نے روٹین سے ہٹ کر کوئی بات ہی نہیں کی۔''

انہوں نے عینک اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

''کرو باتیں۔''

''واہ کیا انداز ہے' جیسے یہ بھی کوئی دفتری ضروری کام ہو جسے فٹافٹ سر سے ٹال کر دوسرا کام شروع کیا جا سکے۔''

''سیاست بھی نشے کی طرح ہے' انتہائی تکلیف دہ اور پریشان کن' لیکن سیاستدان کے لیے اسی طرح ضروری ہے جیسے زندہ رہنے کے لیے سانس۔''

''بس سیاست کی باتیں چھوڑیں' آج میں بہت خوش ہوں' آج اپنی باتیں کریں گے' اتنا اچھا لگا مجھے جب امی ابو نے اعتراف کیا' مجھے سراہا' یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے برسوں کی ریاضت کا صلہ مل گیا ہو۔''

''کوئی اور مانے نہ مانے' ارے جناب ہم تو شروع سے مانتے آ رہے ہیں۔''

میں ہنس پڑی۔ ''ہاں اور آج میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ مجھے آپ کی رفاقت ملی' اب بھی میں یہ سوچ کر کانپ جاتی ہوں کہ اگر آپ میری زندگی میں نہ آئے ہوتے تو میں کہاں ہوتی۔ نہ یہ گھر ہوتا اور نہ ہی میری زندگی میں کامران اور آمنہ کی وجہ سے یوں بہار آتی۔''

''بھول جاؤ پچھلی باتوں کو' میں نہیں چاہتا کہ تمہاری زبان پر اس گزری زندگی کا ایک حرف بھی آئے۔ یوں سمجھو کہ نکاح کے وقت ہی تم نے جنم لیا تھا۔ اس سے پہلے کچھ نہیں تھا۔ تمہاری کوئی زندگی نہیں تھی۔'' ان کے انداز میں محبت تو تھی لیکن تنبیہ بھی تھی۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔

''تم ہی دیکھ لو کس کا فون ہے' اور کہہ دو کہ میں آرام کر رہا ہوں۔ اس وقت کسی سے بھی بات کرنے کا موڈ نہیں ہے۔'' انہوں نے کہا۔

میں نے فون اٹھا لیا۔

''ہیلو!''

دوسری طرف سے کسی نوعمر لڑکی کی آواز آئی۔ ''میں آسیہ سے بات کر سکتی ہوں؟''

میں کچھ حیران رہ گئی۔ خاندان میں سب مجھے رشتے کے حوالے سے بلاتے تھے' اور باہر مجھے مسز بٹ کہا جاتا تھا۔ آسیہ تو بہت کم لوگ کہتے تھے' وہ سب بھی عمر میں مجھ سے بڑے اور خاندان کے افراد تھے۔ ساس' سسر تھے تو وہ میرے قریب ہی تھے۔ انور یوں پکارتے تھے' یا پھر میری دونوں نندیں۔

''آپ کون بول رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بات کو رہنے دیں کہ میں کون ہوں۔'' لڑکی کے انداز میں تلخی اترنے لگی۔ ''اگر ممکن ہو سکے تو میری آسیہ سے بات کروا دیں میری معلومات کے مطابق وہ یہیں رہتی ہے اور اس نمبر پر اس سے بات ہو سکتی ہے۔''

میری حیرت میں اضافہ ہو گیا' وہ کون تھی جو میری عمر تک کا لحاظ کیے بغیر بول رہی تھی' بہرحال میں بولی۔

''جی میں بات کر رہی ہوں۔''

''اچھا تو تم آسیہ ہو' بہت خوب۔'' لہجے میں تلخی کے ساتھ طنز بھی گھل گیا۔ ''زندہ ہو اور مسز انور عزیز بٹ کہلاتی ہو' منسٹر کی بیوی۔ بچے وغیرہ بھی ہوں گے تمہارے' انہیں بہت ناز اور پیار سے پال بھی رہی ہو گی۔ ہے ناں؟''

مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ الجھن بھی ہونے لگی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ آپ بہت چھوٹی ہیں پہلے گفتگو کرنے کا طریقہ سیکھ لیں پھر فون کریں۔''

میرا ارادہ تھا کہ ساتھ ہی ریسیور رکھ دوں گی لیکن اس نے مجھے چونکا دیا۔

''تم اس قابل ہو کہ کسی کو تہذیب سکھا سکو' تم تو تیسرے درجے کی وہ گھٹیا اور نیچ عورت ہو جس نے اپنی بے گناہ اور بے قصور بیٹی کے ماتھے پر سیاہی لگا دی۔ تمہارے لیے تو وہ بیٹی مر گئی ہو گی لیکن وہ زندہ ہے اور تم سے اپنا حساب لینے ضرور آئے گی۔''

دوسری طرف فون بند ہو گیا اور میرے جسم سے جیسے کسی نے جان کھینچ لی۔ اتنے برس بعد اچانک یہ کیسی فون کال تھی' کس نے کی تھی' اور کہاں سے کی تھی' کیا دوسری طرف میری طیبہ تھی؟ میری بیٹی طیبہ۔

میں ریسیور رکھ کر پلٹی تو انور پھر فائلوں پر جھکے ہوئے تھے۔

''کس کا فون تھا؟'' انہوں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''پتا نہیں شاید رانگ نمبر تھا'' میں بمشکل کہہ سکی اور کمرے سے باہر جانے لگی۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

''آپ کام کریں' میں آتی ہوں۔'' کہہ کر ان کی جانب دیکھے بغیر میں خواب گاہ سے باہر نکل آئی۔

میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے' ذہن بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ اندر ایک دم گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں باہر لان میں نکل آئی' اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اوہ خدا' یہ کیا تھا؟ کیا یہ فون طیبہ نے کیا تھا۔ کیسا زہر بھرا لہجہ تھا۔ کتنی نفرت تھی' کیا میرے ماضی کی سیاہی نے میری بیٹی کا دامن داغدار کر دیا تھا؟ یا پھر کوئی مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔ انور کی سیاسی پوزیشن سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔

لیکن اس آواز میں جذبات کی حدت تھی۔ کوئی ایسا شخص جو اس بات سے لاتعلق ہو' جو اس کا حصہ نہ ہو۔ اس کے لہجے میں یہ طوفان نہیں ہو سکتے یا شاید یہ بھی کسی بلیک میلر کی اسکیم کا کوئی حصہ ہو۔ اس نے جان بوجھ کر کسی نوعمر لڑکی سے فون کروایا ہو' اسے ریہرسل کروائی ہو' تا کہ میں یا انور ہم میں سے جو بھی بات کرے وہ اس کے اندازوں کا رخ بدل سکے۔

میرے ذہن میں تھوڑی دیر پہلے انور کے ادا کیے ہوئے الفاظ اب بھی تازہ تھے۔

''بھول جاؤ پچھلی باتوں کو میں نہیں چاہتا کہ تمہاری زبان پر اس گزری زندگی کا ایک حرف بھی آئے سمجھو کہ نکاح کے وقت ہی تم نے جنم لیا تھا۔ اس سے پہلے کچھ نہیں تھا' تمہاری کوئی زندگی نہیں تھی۔''

اور اس لمحے میں نے سوچا تھا کہ کاش یہی حقیقت ہوتی لیکن افسوس کہ حقیقتیں خواہشوں کے تابع نہیں ہوتیں' اس سے قبل بھی میری ایک زندگی تھی' جسے میں خود سے کبھی جدا نہیں کر سکتی تھی اور میری اس زندگی کی ایک نشانی طیبہ کی صورت میں میری گود میں آئی تھی' وہ طیبہ نہ جانے کہاں تھی لیکن کہیں تھی ضرور۔

اسی پل فون کی گھنٹی بج گئی تھی۔

''تم تو تیسرے درجے کی وہ گھٹیا اور نیچ عورت ہو جس نے اپنی بے گناہ اور بے قصور

بیٹی کے ماتھے پر سیاہی لگا دی' تمہارے لیے تو وہ بیٹی مرگئی ہوگی لیکن وہ زندہ ہے اور تم سے اپنا حساب لینے ضرور آئے گی۔'' اس آواز نے کہا تھا۔

میرا ذہن شل تھا' میں کچھ سمجھنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

وہ ساری رات یونہی گزر گئی۔ میرے اندر جھکڑ چل رہے تھے لیکن اوپر سے میں خود کو نارمل ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

اس روز کے بعد پورے سترہ دنوں تک اس قسم کے فون آتے رہے ہر گھنٹی پر میں پاگلوں کی طرح فون پر جھپٹتی تھی' کسی کے اُٹھانے سے قبل لپک کر ریسیور اُٹھا لیتی تھی' میری ذہنی حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی۔

میرے ''ہیلو'' کے جواب میں وہ صرف ایک فقرہ کہہ کر ریسیور رکھ دیتی تھی۔

''تمہاری بیٹی تم سے اپنا حساب لینے ضرور آئے گی۔'' مجھ میں مزید کچھ سننے کی تاب نہیں تھی۔ بالآخر سترہویں دن میں نے اپنے ٹیلی فون سیٹ کا تار نکال کر اسے ناکارہ کر دیا۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب وہ اپنا حساب لینے آ گئی۔ بغیر کسی اطلاع کے۔

اس کے ایک روز قبل ہی میرے ساس سسر جیٹھ کی طرف گئے تھے' آج کسی وقت انہیں آ جانا تھا بچوں کے کچھ کزنز آئے ہوئے تھے اور وہ ان کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھے' میں لان میں ہی بیٹھی انہیں کھیلتے ہوئے دیکھ رہی تھی لیکن میرا تمام تر دھیان ان فون کالز کی طرف تھا۔

میں سوچ ہی رہی تھی کہ اسی وقت چمکتی ہوئی ایک نسان پٹرول گھر کے گیٹ پر رکی' سیکورٹی گارڈ ایک کارڈ لے کر میرے پاس آیا۔

''یہ صاحب اپنی فیملی کے ساتھ آپ سے ملنے آئے ہیں؟''

میں نے کارڈ پر نگاہ ڈالی' اس پر ملاقاتی کا نام کرنل اقبال احسن درج تھا۔ گزری یادوں کی ایک کرن سی چمکی اور بجھ گئی۔

''نہ جانے کون کرنل اقبال احسن ہیں۔'' میں نے سوچا پھر گارڈ سے مخاطب ہوئی۔

''بھیج دو۔''

نسان پٹرول گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ میں گھر کے اندر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ تھوڑی دیر بعد ملاقاتی بھی اندر آ گئے میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو پلکیں جھپکنا بھول گئی'

میرے سامنے اپیا تھیں' ان کی عمر بڑھ گئی تھی لیکن میری آنکھیں انہیں پہچاننے میں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں' ان کے چہرے پر اضطراب تھا۔ اور ان کے پہلو میں' میں ہی تھی' وہی آسیہ جو چودہ پندرہ برس کی تھی' فرق تھا تو صرف اتنا کہ وہ آج کل کی نسل کی نمائندہ تھی۔ سادہ لیکن خوبصورت جدید لباس میں ملبوس اپنے بھورے سنہری بالوں کو دو چوٹیوں میں گوندھے۔

اس کی آنکھوں میں نفرت تھی' دکھ تھا' بے بسی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر لاوا سا پک رہا ہو۔ اور اس نے بہت مشکل سے..... خود پر قابو پا رکھا ہو۔ اپیا نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔

وہ بھی میری ہی طرح مجھے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔

''تو تم ہو آسیہ!'' کچھ دیر بعد اس نے سرگوشی میں کہا یوں جیسے سانپ پھنکارا ہو۔

یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی' پچھلے سترہ دنوں سے یہی آواز میں فون پر سنتی آ رہی تھی۔

''مہر نگار تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔'' اپیا نے انگریزی' میں طیبہ کو مخاطب کیا' لہجے میں اضطراب بھی تھا اور سرزنش بھی پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئیں۔ ''بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گی آسیہ؟''

میں صرف سر سے اشارہ ہی کر سکی۔ اپیا نے اپنے ساتھ طیبہ کو بھی زبردستی بٹھا لیا۔

''بس دم نکل گیا مجھے زندہ دیکھ کر۔'' اس نے زہر بھرے لہجے میں کہا۔

اپیا نے اس کے بازو پر گرفت اور مضبوط کر دی۔ ''مہر نگار میں تمہیں واپس لے جاؤں گی۔'' پھر مجھ سے کہنے لگیں۔ ''آنے سے پہلے میں تمہیں اطلاع کرنا چاہتی تھی' کافی کوشش بھی کی لیکن نمبر نہیں ملا۔ مہر نگار کی وجہ سے میں اس قدر مجبور ہوئی کہ بغیر اطلاع دیئے ہی آنا پڑا' مجھے اندازہ ہے کہ یہ بہت نامناسب بات تھی لیکن مہر نگار کے آنسو میری برداشت سے باہر ہوتے ہیں' میرے لیے اس کی بات رد کرنا ممکن نہیں رہتا۔''

مہر نگار کتنی خوبصورت تھی میری بیٹی' کیسی روشن پیشانی تھی اس کی' کتنی معصومیت تھی اس کے چہرے پر۔

میں بے اختیار آگے بڑھی' اسے گلے لگانے کے لیے' پیار کرنے' خود سے بھینچ لینے کے لیے' کتنی پیاس تھی میرے اندر' کتنا ارمان تھا کہ صرف ایک مرتبہ ہی سہی' اسے دیکھ سکوں' اتنا

پیار کرسکوں کہ برسوں کی تشنگی مٹ جائے' اور آج اس لمحے وہ میرے سامنے تھی۔

میرے چھوتے ہی اس نے مجھے زوردار دھکا دیا اور کھڑی ہوگئی' میں بمشکل تمام گرنے سے بچی' اپیا نے اُٹھ کر اسے پکڑ لیا۔

''چھوڑیں مجھے۔'' لاوا ایک دم بہہ نکلا۔ ''کیوں چھوا اس عورت نے مجھے' کیا حق ہے اس کے پاس کہ مجھے ہاتھ لگائے۔''

''مہر نگار'' اپیا نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

لیکن اس وقت اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

''جانتی ہو میں کون ہوں؟ پہچان سکتی ہو مجھے؟ میں ایک بد چلن ماں کی آوارہ بیٹی ہوں۔ یہی کہتے ہیں مجھے' لوگ کہتے ہیں ناجائز اولاد تھی ناجائز ہی رہی۔ کیوں یہ داغ میری پیشانی پر لگایا تم نے۔ کتیا اولاد پیدا کرتی ہے تو وہ بھی اسے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھاتی ہے۔ ایک تم تھی' جس نے پیدا ہوتے ہی مجھے پھینک دیا۔''

''طیبہ! میری بات سنو بیٹا!'' میں نے کہنے کی کوشش کی۔

''کچھ نہیں سننا مجھے۔ کیا ہے تمہارے پاس کہنے کے لیے؟ میری زندگی تباہ کردی تم نے' مجھے پیدا ہی کرنا تھا تو اپنی منحوس صورت کیوں دی مجھے۔ کم از کم کوئی یہ تو نہ جان پاتا کہ میں انسانیت کی سطح سے گرے ہوئے رذیل مرد اور عورت کی وقتی خوشی کے چند لمحات کا گناہ ہوں۔

تم نے تو کچھ بھی نہ رہنے دیا میرے پاس۔ میرا مان' میری ذات کا غرور' میرا اعتماد' کچھ بھی تو نہیں' مجھے گندگی کے ڈھیر میں دھنسا دیا۔ مجھے تنہا کردیا۔ کیا تم اس دکھ کا حساب دے سکتی ہو جس سے میں گزر رہی ہوں؟ میرے ماتھے کی سیاہی مٹا سکتی ہو؟ مجھے میرا اعتماد میرا مان میری ذات کا غرور لوٹا سکتی ہو؟ بتاؤ کیا میں کبھی بھی کسی کے سامنے سر اُٹھا کر چل سکوں گی۔ کسی پر اعتبار کرسکوں گی؟ پہلے کی طرح اپنی زندگی گزار سکوں گی؟''

''طیبہ بیٹا! میں اتنی بری نہیں جتنا تم نے سمجھا ہے۔'' میرے دل میں ٹیسیں سی اُٹھ رہی تھیں۔

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''اب بھی تمہارے پاس صفائی میں کچھ کہنے کو باقی ہے؟ تم نے تو سب کچھ پا لیا۔ گھر بھی اور رشتے بھی' مگر میرا کون ہے؟ میں کہاں کس کے پاس جاؤں؟ کس رشتے کو اپنا کہوں؟ کسے ماں کہوں' کسے باپ کہہ کر پکاروں؟ بولو جواب دو ناں'

مگر تمہارے پاس جواب کہاں۔'' اس کی آواز میں شکستگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے شام ڈھلے کسی دریا کے ساحل پر تنہا بیٹھی وہ لہروں پر دور ہوتی کشتی کی طرف حسرت سے دیکھ رہی ہو جو اسے وہیں چھوڑ گئی ہو۔

''طیبہ!'' میں نے بازو وا کرکے اسے اپنی آغوش میں بھرنا چاہا۔

''نہیں۔ دور رہو مجھ سے۔'' وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔'' یہ اختیار میں تمہیں اس وقت دوں گی جب تم سب کے سامنے مجھے اپناؤ گی' کہو گی کہ یہ میری بیٹی ہے۔'' اچانک اس کی آنکھوں میں بھڑکتے شعلے بجھ گئے بہت حسرت سے اس نے میری طرف دیکھا۔ ''کہو گی ناں؟''

میرا پورا وجود زلزلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس کا ''کہو گی ناں؟'' مجھ پر چھا گیا۔ اس کی حسرت بھری نگاہوں نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔

میں چیخ کر کہنا چاہتی تھی۔ ''ہاں کہوں گی' سب کے سامنے کہوں گی' با آواز بلند کہوں گی کہ یہ میری بیٹی' میری طیبہ ہے یہ بے قصور' بے خطا ہے' خدا کے لیے اسے پتھر مت مارو' اپنی زبانوں سے اس کا معصوم دل چھلنی مت کرو' دیکھو یہ کتنی پیاری' سادہ اور معصوم ہے۔''

لیکن اسی وقت اپیا نے طیبہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ''نہیں مہر! اسے اتنی بڑی آزمائش میں مبتلا مت کرو' اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا' تم دونوں کی زندگی تباہ ہوجائے گی' ایسا مت کرو۔''

اور میں ہوش میں آ گئی۔ آہ ہم انسانوں کی مصلحتیں' میرے سامنے کامران اور آمنہ آ کھڑے ہوئے' انور کی عزت نے میرا راستہ روک لیا۔ وہ گھر جو میں نے بہت مشکلوں سے بہت ریاضتوں سے بنایا تھا' اس کے بکھرنے کے خوف نے خاموش کردیا۔

''اب زندگی نے تم دونوں کے لیے جو راستے متعین کردیئے ہیں' انہی پر چلتے رہنے میں دونوں کا بھلا ہے بھول جاؤ کہ تمہاری کوئی بیٹی بھی ہے۔''

انور کی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی' طیبہ میری طرف دیکھے جا رہی تھی' کتنی حسرت تھی اس کی نیلی آنکھوں میں۔

''میرا باپ کون ہے؟'' بالآخر اس نے پوچھا۔ وہ بمشکل اپنی آواز کی لرزش پر قابو پا

رہی تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ یہ وہ راز تھا جو میں نے صرف ایک فرد کے سامنے کھولا تھا۔ اور وہ شخص میرا شریک حیات تھا۔

''میں پوچھ رہی ہوں' میرا باپ کون تھا؟'' وہ چلائی۔

تب یہ بات راز میں رکھنے کی جو وجوہات تھیں' آج ان میں سے کوئی بھی اہم نہیں تھی۔

میں اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھی وہ بھی میرے پیچھے لپکی' اپیا نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس نے خود کو چھڑا لیا۔ مجبوراً انہیں بھی ساتھ آنا پڑا۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ماضی سے میرا رشتہ ٹوٹ جاتا یہ میری کتاب کے وہ ورق تھے جنہیں کوئی بھی پھاڑ کر جدا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بڑی اماں کو اپنی' انور اور کامران کی تصویریں بھی بھجوائی تھیں اور اپنے جیب خرچ سے پروین کی مدد بھی کرتی رہتی تھی' انور کے علم میں لائے بغیر۔ میں نے گلے کی وہ زنجیر نکال لی جو برسوں سے میرے پاس پڑی ہوئی تھی لیکن جسے میں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ سو روپے کا وہ نوٹ نکالا جو اسی رات میں نے پرزہ پرزہ کر دیا تھا اور بعد میں ٹیپ سے جوڑا تھا۔ مجھے نفرت تھی ان لمحوں سے میرے بس میں ہوتا تو میں انہیں اپنی زندگی سے مٹا دیتی۔

وہ زنجیر اور نوٹ میں نے طیبہ کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ تمہارے باپ نے مجھے دیئے تھے۔''

اس نے ہاتھ بڑھا کر تھام لیا اور ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں میں حسرت کے سائے اتر آئے۔

''اس کا نام سہیل ہے۔'' میں نے بمشکل کہا۔

اپیا جو مضطرب تھیں۔ ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''سہیل؟ راشد انکل کا بیٹا سہیل؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

یوں لگا جیسے طیبہ نے زیر لب اپنے باپ کا نام دہرایا ہو۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

''تمہارے باقی بچوں کی طرح میں بھی تو تمہاری بیٹی ہوں۔ تم انہیں بھی تو پیار کرتی ہو گی' سب کے سامنے انہیں اپنا کہتی ہو گی' تم نے مجھے آج تک کچھ نہیں دیا۔ کیا میرے مانگنے پر بھی مجھے یہ خوشی نہیں دو گی؟ مجھے سب کے سامنے اپنی بیٹی نہیں کہو گی؟ چاہے صرف ایک

بار۔''

میں کیسی بدنصیب تھی کہ اس کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا لہجہ کتنا ٹوٹا ہوا تھا' کتنی تڑپ تھی اس میں۔

''آؤ مہرنگار۔'' اپیا نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔

میں تیزی سے آگے بڑھی۔ زندگی میں صرف ایک بار اسے پیار کرنے' اسے خود سے بھینچ لینے کے لیے۔

''طیبہ' بیٹا!'' میں کچھ اور نہ کہہ سکی اور اسے خود سے لپٹانے کی کوشش کی۔

اس نے مجھ پر تھوک دیا۔

''تم اسی قابل ہو کہ تمہارے ساتھ ایسا سلوک ہو' بلکہ تم اس سے بھی بدتر سلوک کی مستحق ہو۔'' وہ بری طرح سے رونے لگی۔ ''تم انتہائی قابل نفرت' گھٹیا اور ذلیل مخلوق ہو۔ اپنی زندگی میں تم نے جو کچھ کیا۔ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں' میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے میرے ماتھے پر سیاہی کیوں لگائی؟ مجھے شرم آتی ہے یہ سوچ کر بھی کہ میں نے تمہارے گندگی بھرے وجود سے جنم لیا اور تمہارے وجود کی غلاظت میرے جسم سے بھی چپک گئی۔''

''مہر بس کرو۔'' اپیا نے اسے اپنے ساتھ کھینچا۔ ''چلو میرے ساتھ۔''

وہ ان سے لپٹی...... روتی ہوئی باہر چلی گئی' اور میں وہیں کھڑی رہ گئی۔ میرا سارا وجود کانپ رہا تھا۔ دل میں ٹیسیں سی اُٹھ رہی تھیں۔ سر چکرا رہا تھا۔ خود کو گھسیٹ کر میں کھڑکی تک پہنچی۔ باہر لان میں اپیا کے شوہر موجود تھے۔ طیبہ کو انہوں نے تھام لیا اور جیپ کی طرف بڑھ گئے۔

وہ چمکتی ہوئی نسان پٹرول گھر کے گیٹ سے نکلنے کے لیے ریورس ہو رہی تھی' میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے چیخ کر پکاروں۔

''طیبہ' رک جاؤ۔''

لیکن چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

☆======☆======☆

آج کتنے برسوں بعد بالکل اچانک آسیہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ ماضی کے دُھندلے دُھندلے عکس واضح ہو گئے تھے' وہ بیتی رات اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ذہن کے کینوس پر روشن ہو گئی تھی اور وہ رات بھی جب برستی بارش میں ایک سایہ سا میری کار کے تعاقب میں آیا تھا سناٹے میں آواز گونجی تھی۔

''سہیل! سہیل! رک جاؤ۔''

لیکن میں وقت کے پہیے کو پیچھے نہیں چلانا چاہتا تھا۔ میرے سامنے بہت سی مصلحتیں تھیں' خواہشیں تھیں خواب تھے۔ خوبصورتی کی دنیا میں کمی نہیں وہ کہیں بھی اور کبھی بھی مل سکتی تھی۔ وہی جذبات جو چند دن پہلے محبت لگتے تھے حماقت لگنے لگے تھے۔ مانا لڑکیاں جذباتی ہوتی ہیں لیکن ہر کوئی سنبھل جاتا ہے اور پھر آسیہ کی اس کے شوہر کے ساتھ تصویر دیکھ کر جو ننھا سا کانٹا رہ گیا تھا وہ بھی نکل گیا۔ ساتھ میں وہ ننھا منا گورا سا بچہ اس کا بیٹا۔

مگر آج اچانک آسیہ کو سامنے دیکھ کر سب دُھندلے عکس واضح ہو گئے۔ وہ ذرہ برابر بھی تبدیل نہیں ہوئی تھی سوائے اس کے کہ اس کی عمر شاید وہیں ٹھہر گئی تھی اور وہ جدید رنگ میں نکھر گئی تھی۔ کہاں وہ اُڑی اُڑی رنگت والے کپڑے اور کہاں یہ آسیہ جو نیلی جینز اور سفید کھلے سویٹر میں ملبوس تھی۔ لمبے سنہری بال دو ڈھیلی ڈھالی چوٹیوں میں قید' نیلی آنکھوں میں کھو جانے اور وار کرنے کے تاثرات' ناک میں ہیرے کی لونگ' ایک کلائی میں بے حد قیمتی گھڑی اور دوسری میں ہیروں سے مزین بریسلٹ ان چیزوں سے قطع نظر وہ پرانی آسیہ ہی تھی۔

میں ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا اور وہ بھی اپنی نیلی آنکھیں مجھ پہ جمائے ہوئے تھی۔

آج البتہ وہ برسوں پہلے والے جذبات نہیں تھے۔ ایک عجیب سا احساس تھا جو عمومی کشش سے ہٹ کر اس سے بالکل جدا تھا مگر میں اسے کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔

اپیا کا فون میرے لیے حیران کن تھا۔ کتنے سالوں بعد ہماری آپس میں گفتگو ہوئی تھی۔ بڑی اماں کی وفات کے بعد جو نام کے رشتے رہ گئے تھے' وہ بھی ختم ہو گئے تھے۔ آخری مرتبہ جہلم والے گھر میں غالباً بارہ یا تیرہ برس قبل گیا تھا۔ اس روز وہاں ابا جی اور امی کا آخری دن تھا۔ انہوں نے گل افشاں کالونی میں ایک نسبتاً جدید اور اس گھر سے چھوٹا گھر خرید لیا تھا اور اگلی صبح انہیں وہاں شفٹ ہو جانا تھا۔ میں خالی کمروں اور صحن میں پھرتا رہا' امی اور ابا جی سے باتیں کیں اور اسی شام اسلام آباد لوٹ گیا۔ وہ ان کے گھرانے کے کسی بھی فرد سے میری آخری ملاقات تھی۔

ایسے میں اپیا کا فون آنا یقیناً حیران کن تھا۔

''بس لاہور میں میری بیٹی بور ہو گئی ہے چاہتی ہے سنو فال دیکھے مجھے علم ہوا کہ تم ایبٹ آباد میں ہو تو سوچا کہ تم سے بھی مل لیا جائے۔''

''پہلے تو اپیا بہت مبارک ہو بیٹی کی۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ آپ کی بیٹی بھی ہے۔''

''بہت برس ہو گئے ناں ملے ہوئے۔''

''ہاں بہت زیادہ۔''

''چند دنوں میں اس کے اسکول کھل جائیں گے اس لیے ہم باہر نہیں جا رہے۔ بس اتفاق سے معلوم ہوا کہ تم آج کل ایبٹ آباد میں ہو تو خیال آیا کہ وہیں جانا چاہیے' سنو فال بھی دیکھ لیں گے اور تم سے اور تمہارے بیوی بچوں سے بھی مل لیں گے۔''

''یہ تو بہت ہی اچھا پروگرام ہے۔ ہم میاں بیوی بھی یہاں بور ہو رہے ہیں۔ ویک اینڈز پر اسلام آباد چلے جاتے ہیں۔ بس یہی تفریح ہے۔ بیگم کو یہ جگہ زیادہ پسند نہیں ہے۔ وہ ذرا سوشل قسم کی ہیں۔ یہاں بھی سوشل گیدرنگز تو ہوتی ہیں لیکن ان کے مزاج کے مطابق نہیں اس لیے میں اسلام آباد پوسٹنگ کی کوشش کر رہا ہوں امید ہے کہ ہو بھی جائے گی۔ آپ لوگ اس سے قبل آ جائیں۔''

''ارے بھئی' ہم اسلام آباد میں بیٹھے ہیں۔ کہو تو چند گھنٹوں میں تم تک پہنچ جائیں۔''

اپیا شگفتگی سے بولیں۔

"آپ چند لمحوں میں پہنچ جائیں بیٹی کو اگر سنو فال کا مزا لینا ہے تو میں ٹھنڈیانی میں ہٹ کا انتظام کر دیتا ہوں۔"

"اتنے تردد کی ضرورت نہیں ہم ہوٹل میں رہ لیں گے بس تھوڑی دیر تم سے مل لیں تو احساس ہو جائے کہ تم اور ہم بہن بھائی ہیں۔"

"اپیا! یہ بالکل نہیں چلے گا۔ آپ یہاں آئیں گی اور ہمارے ساتھ رہیں گی' بلکہ آپ کے آنے کی وجہ سے ہم بھی فریش ہو جائیں گے۔"

اور پھر میرے اصرار پر اپیا نے مان لیا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گی۔

لیکن نہ جانے یہ حقیقت تھی یا وہم میں ان کے لہجے میں اضطراب محسوس کر رہا تھا وہ بظاہر خوشی اور شگفتگی سے گفتگو کر رہی تھیں مگر ان کے لہجے میں کچھ اور بھی تھا۔

ابھی شام ہی تھی لیکن سردیوں کی وجہ سے تاریکی پھیل چکی تھی۔ گیٹ پر ہارن ہوا' میں خود انہیں لینے باہر نکلا۔ اپیا سے ملا' ان کی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرنے کی کوشش کی لیکن شاید اس کے کپڑوں پر کوئی روشنی کا کیڑا آ گرا تھا۔ جسے جھٹکتے ہوئے وہ پرے ہو گئی تھی۔

تب تک میں نے اسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ گارڈن لائٹس کی روشنی میں اس کے نقوش اتنے واضح نہیں ہوئے تھے۔ جب ہم ڈرائنگ روم میں پہنچے تو اس کی صورت دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔

"یہ میری بیٹی ہے مہر نگار اور مہر یہ ہیں......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں پھر قدرے توقف سے بولیں۔ "میرا چھوٹا بھائی ہے۔ سہیل۔"

اس کی نگاہیں بھی میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں میں مان ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ آسیہ کے علاوہ کوئی اور بھی ہو سکتی تھی۔

"تمہاری بیگم نظر نہیں آ رہی ہیں۔"

اپیا کی آواز نے مجھے چونکا دیا وہ واضح طور پر پریشان اور مضطرب تھیں۔ اسی لیے مجھے احساس ہوا کہ میں نے اب تک انہیں بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔

"راحت تیار ہو رہی ہے آپ پلیز بیٹھیں۔"

وہ دونوں بیٹھ گئیں۔ میں اپیا کے ساتھ باتیں کرنے لگا لیکن میرا ذہن آسیہ میں اٹکا ہوا

تھا۔

"یہ مہر نگار ہی ہے یہ آسیہ کیسے ہو سکتی ہے پندرہ سال طویل عرصہ ہوتا ہے۔ آخر انسان میں کچھ تو تبدیلی آتی ہے وقت کوئی نشان تو چھوڑتا ہے لیکن یہ مہر نگار بھی کیسے ہو سکتی ہے یہ تو ہو بہو آسیہ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ ویسے ہی نقوش' وہی بال' وہی آنکھیں وہی قد کاٹھ چہرے پر پھیلی ویسی ہی معصومیت مگر ان آنکھوں میں وہ تاثرات نہیں ہیں جو آسیہ کی آنکھوں میں ہوا کرتے تھے۔ یہ آنکھیں زبردستی اجنبیت کی دیوار کھڑی کر رہی ہیں' کھوج رہی ہیں لگتا ہے اندر کچھ گھٹ رہا ہے کوئی زخم چھپا کر خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اور وار کرنا چاہتی ہیں۔

آسیہ کی آنکھوں میں یہ رنگ نہیں تھے ان میں سادگی تھی' دنیا سے بے خبری تھی' خوف تھا' محبت تھی وہ وار کرنے کی نہیں وار سہنے کی عادی تھی اور شاید یہی مہر نگار اور آسیہ کا فرق ہے۔ اگر تناسخ حقیقت ہوتی تو میں مہر نگار کو آسیہ کا دوسرا جنم سمجھتا۔

لیکن مہر نگار کا آسیہ سے کیا تعلق ہے؟ اس کا تو بیٹا تھا کامران میں نے خود اس کی تصویر دیکھی تھی آسیہ کی گود میں اور آسیہ کے چہرے پر ممتا کے کتنے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ کیسی محبت سے وہ اپنے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یوں جیسے اس کی گود میں دنیا کا سب سے بڑا خزانہ ہو۔ کامران مہر نگار میں کیسے بدل سکتا تھا اور اگر بدل بھی جاتا تو بھی عمروں کا فرق یا پھر شاید اس نے پرانی تصویر بھجوائی تھی۔

مگر مہر نگار تو اپیا کی بیٹی تھی۔ انہوں نے یہی بتایا تھا۔

"کہیں کچھ ہے جو میری سمجھ سے باہر ہے۔ خیر ابھی تو اپیا کو چند دن رہنا ہے' خود ہی سب بھید کھل جائیں گے۔"

وہ میری سوچوں سے بے خبر اپنے بریسلٹ کو کلائی میں گھمانے میں مصروف تھی کبھی کبھار جب میں کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا اور وہ بھی اچانک میری جانب دیکھتی اور ہماری نگاہیں ملتیں تو ان آنکھوں میں اجنبیت گہری ہونے لگتی۔

ہاں یہ ٹھیک ہے میں اس کے لیے اجنبی تھا میں آسیہ سے ملا تھا لیکن مہر نگار سے یہ میری پہلی ملاقات تھی' وہ کم گو معلوم ہوتی تھی مگر الجھن کی بات یہ تھی کہ اس کی اجنبیت میں مجھے شعوری کوشش محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور اس کی عمر کی لڑکی ہوتی تو اس بات کو

اہمیت دینا تو دور میں شاید اسے محسوس بھی نہ کرتا۔

اسی دوران راحت آ گئی۔ راحت میری دوسری بیوی جو کم عمر بھی تھی اور دولت مند بھی‘ اس کی یہ دونوں صفات لوگوں کے لیے ہی نہیں خود اس کے لیے بھی خاصی کشش رکھتی تھیں۔ اور اسے ان کا بھرپور احساس تھا۔ عمر کے فرق کے باوجود بھی ہم دونوں میں شدید محبت تھی۔ اس سے قبل میری پہلی بیوی سارہ میری ہی ہم عمر تھی۔ راحت ابھی بمشکل اکیس برس کی تھی۔

راحت کی عادت تھی کہ وہ بہت کم ملنے والوں کے ساتھ گرمجوشی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اپنے سے کم دولت مند لوگوں کے ساتھ ربط بڑھانا تو خیر بالکل ہی ممکن نہیں تھا اور اپنے جیسے یا اپنے سے بڑھ کر دولت مند لوگوں کے ساتھ مسابقت کی وجہ سے وہ حد درجہ تکلف اور نزاکت سے کام لینے کی عادی تھی۔ ایسی پارٹیز جن میں وہ کپڑوں اور زیوروں کی نمائش کر سکتی یا پھر اپنے فارن ٹورز کی شاپنگ کی تفصیلات بتا سکتی۔ اس کی پسندیدہ تھیں یہی وجہ تھی کہ ایبٹ آباد میں وہ خود کو گھٹن میں مبتلا محسوس کر رہی تھی اور اس کا ذہن اسلام آباد کراچی اور لاہور کی پارٹیز میں ہی اٹکا رہتا تھا۔ صرف میری وجہ سے وہ یہاں بندھی بیٹھی تھی۔

اب بھی اس نے پہلے ایپا اور مہر نگار کا جائزہ لیا تاکہ ان سے میل ملاپ کی حدود کا تعین کر سکے۔ میں نے محسوس کیا کہ مہر نگار بغور اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہی تھی تھوڑی ہی دیر میں راحت اس سے الجھن محسوس کرنے لگی۔

میں چونکہ اپنی بیوی کی عادت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ ایپا کا زیور اور مہر نگار کی خوبصورتی اور اسٹائل راحت کو پوزیشن سنبھالنے پر مجبور کر دیں گے اور ممکن ہے ایپا اس کے رویے کی سرد مہری محسوس کر کے برا مان جاتیں اس لیے میں معمول سے زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”بچے کہاں ہیں سہیل؟“ ایپا نے باتوں باتوں میں پوچھا۔

میں نے مہر نگار کی طرف دیکھا ہاتھ میں کافی کی پیالی تھامے وہ ہمہ تن گوش ہو گئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے اس سوال میں اس کی دلچسپی بہت زیادہ ہو۔

”بچے نہیں ہیں۔“ میں نے کہا۔

یہ حقیقت میرے لیے تکلیف دہ تھی پہلے سارہ تھی ہم دونوں نارمل تھے مگر اس

نعمت سے محروم رہے پھر سارہ کینسر سے بہت لڑنے کے باوجود بھی جان ہار بیٹھی۔ ممی تو جیسے پاگل ہو رہی تھیں۔

”میرا اکلوتا بیٹا ہے سہیل اور اب تک اس کا گھر ادھورا ہے۔“ وہ کہتی تھیں۔

تب تک سارہ کینسر میں مبتلا نہیں ہوئی تھی۔ پھر اسے کینسر ہو گیا تو رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔

”سہیل! تمہیں دوسری شادی کرنی ہوگی۔“ وہ بہت زور دیتی تھیں۔

لیکن میں سارہ کو بستر مرگ پر چھوڑ کر اپنے حصے کی خوشیاں ڈھونڈنے نہیں نکل سکتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک اور آواز بھی تمام عمر میرا تعاقب کرتی رہے۔

”سہیل سہیل رک جاؤ“

اس آواز کی بازگشت کبھی اچانک میرے اندر گونجنے لگتی تھی۔ میں سر جھٹک کر خود کو مصروف کر لیتا تھا لیکن یہی الفاظ ایک اور مرتبہ میری زندگی میں شامل ہو جاتے تو میرے لیے عذاب بن جاتے اور یہ عذاب میں برداشت نہ کر پاتا۔

سو وہ وقت بھی آ گیا جب میں سارہ کو خود منوں مٹی تلے چھوڑ آیا۔

کہتے ہیں بیوی کی موت کہنی کی چوٹ کی طرح ہوتی ہے۔ بہت شدید تکلیف دہ مگر لمحاتی۔ ٹھیک کہتے ہیں۔

پھر میری زندگی میں راحت آ گئی۔ ممی خوش ہو گئیں لیکن راحت کا رویہ ان سے سرد مہر ہی رہا۔ وہ اپنی خواہش کا اظہار کرتیں تو راحت سنی ان سنی کر دیتی۔ کبھی سائیڈ ٹیبل پر پڑا کوئی تازہ شمارہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگتی کبھی ٹی وی پر گانوں کا چینل لگا لیتی‘ کبھی نیل پالش اتارنے اور لگانے میں منہمک ہو جاتی اور کبھی نوکروں کو جھاڑنے لگتی۔

”تمہاری بیوی میری عزت نہیں کرتی۔“ ممی شکایت کرتیں۔

”تمہاری ممی کو کسی کی پرائیویسی کا خیال نہیں ہے میں کسی کو اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ ہماری پرسنل لائف میں مداخلت کرے۔“ راحت ان کے بارے میں کہتی۔

میرے لیے ممی اہم تھیں اور راحت ناگزیر۔

کبھی میں بھی کہہ دیتا تھا۔ ”مجھے بچوں کی بہت خواہش ہے۔“

اور وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال دیتی تھی۔ ”بچے آ گئے تو ہمیں ایک دوسرے

کے لیے اتنا وقت کہاں مل سکے گا یوں بھی ابھی سے میں بچے پیدا نہیں کر سکتی یہی تو عمر ہوتی ہے انجوائے کرنے کی' سارا فگر تباہ ہو جائے گا میرا۔ پتا ہے سہیل! مجھے ان عورتوں کو دیکھ کر سخت الجھن ہوتی ہے جو اپنے ساتھ اپنے بچے لٹکائے پھر رہی ہوتی ہیں۔ نفاست' نزاکت ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے بچے نہیں کیڑے مکوڑے سے لٹکے ہوئے ہوں جو جان ہی نہیں چھوڑتے۔''

اتنا طے تھا کہ راحت کو اس بارے میں قائل کرنا یا کسی بھی بارے میں قائل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

تین دن قبل اس بارے میں میں نے اس سے سنجیدگی سے بات کی تھی۔ اب میں ہر حالت میں اولاد چاہتا تھا۔ اس سال میری عمر چالیس سال ہو جانی تھی گو کہ میں خاصا چاق و چوبند تھا باقاعدگی سے ورزش کرتا تھا اور کھیلا کرتا تھا اس لیے صحت مند دکھائی دیتا تھا لیکن چالیس سال تھوڑی عمر نہیں ہوتی۔ اکثر میں حساب لگایا کرتا تھا کہ اگر ابھی ہمارا بچہ پیدا ہو تو میرے ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ صرف بیس برس کا ہوگا جبکہ یہاں پچاس برس سے اوپر چلے جانا بونس پیریڈ ہوا کرتا ہے۔ سو اگر اب بھی اولاد نہ ہوئی تو پھر نہ ہونا ہی اچھا تھا۔

میری اس بارے میں سنجیدگی راحت کو پسند نہ آئی۔

''پلیز سہیل۔ وقت بے وقت یہ ایشو نہ لایا کرو۔''

''اس سال میں چالیس برس کا جاؤں گا اور اس کے بعد اولاد بیکار ہے۔ یہی اصل وقت ہے چاہے صرف ایک لیکن اب میں اولاد چاہتا ہوں کہ اپنی اولاد کی سب خوشیاں دیکھوں۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''تو پھر تیسری شادی کر لو میں چالیس سال کی نہیں صرف اکیس سال کی ہوں اور ابھی بندھنا نہیں چاہتی' میری عمر بچے پیدا کرنے کی نہیں زندگی کی رنگینیوں کو انجوائے کرنے کی ہے میں اسے بچوں کی ریں ریں سن کر ضائع نہیں کرنا چاہتی۔''

''تم فضول بات پر اڑی ہوئی ہو۔'' مجھے غصہ آ گیا۔

اور ہم میں اچھی خاصی جھڑپ ہو گئی۔

اب جب اپیا نے بچوں کے بارے میں استفسار کیا تو راحت کی سرد مہری اور گہری

ہو گئی۔

میرے جواب کے بعد اپیا نے یہ موضوع نہیں چھیڑا۔ نہ جانے یہ میرا وہم تھا یا حقیقت لیکن مہر نگار کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدلے تھے جنہیں چھپانے کے لیے اس نے کافی کی پیالی ہونٹوں سے لگا لی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد میں انہیں ان کے بیڈ روم میں لے آیا۔

''یہ بیڈ روم راحت نے آپ کے اور اقبال بھائی کے لیے سیٹ کروایا تھا اور آ س۔'' میں ایک دم کہتے کہتے رک گیا۔ آسیہ کا نام زبان سے پوری طرح نکلنے سے قبل ہی میں نے خود کو روک لیا اور پھر جلدی سے بولا۔ ''اور مہر نگار کے لیے دوسرا بیڈ روم تھا۔''

''کوئی بات نہیں ہم بیڈ روم شیئر کر لیں گے۔ اقبال بہت مصروف نہ ہوتے تو وہ بھی ضرور آتے۔'' پھر انہوں نے پیار سے مہر نگار کی طرف دیکھا۔ ''یہ میری بیٹی ہے ناں اسے یوں بھی میں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کر سکتی۔''

مہر نگار بستر پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگی میں انہیں شب بخیر کہہ کر چلا آیا۔

میرا ذہن مسلسل مہر نگار میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ بہت ہی کم گو تھی۔ ضرورت کے علاوہ اس نے ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ مجھے اس بات سے بھی الجھن ہو رہی تھی جو شخص خود کو ظاہر کر دے' اس میں بھید نہیں رہتا حیرت نہیں رہتی۔ الجھن نہیں رہتی ہے مہر نگار باتونی قسم کی لڑکی ہوتی اور اپنے متعلق کچھ بتاتی تو میری الجھن کی یہ کیفیت نہ ہوتی۔

راحت بھی مہر نگار کی کھوجتی نظروں سے بیزار ہو گئی تھی۔

''یہ کیا مہمان ہیں تمہارے سہیل۔ وہ تمہاری اپیا تو خیر گزارے لائق ہیں لیکن ان کی بیٹی' خدا کی پناہ جاہل لڑکی ہے۔ کوئی مینرز' کوئی تہذیب نہیں ہے اس میں' مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے نہیں مائیکرو سکوپ کے نیچے کوئی کیڑا مکوڑا دیکھ رہی ہو۔''

''وہم ہے تمہارا۔ اچھی خاصی لڑکی ہے' بس کم گو ہے۔'' میں نے ٹائی ڈھیلی کی اور کف لنکس اتارتے ہوئے بولا۔

''کتنے دن انہیں برداشت کرنا ہوگا؟ میں اسلام آباد والا پروگرام ڈراپ نہیں کر سکتی۔''

''اس سے پہلے چلے جائیں گے۔ اسلام آباد یوں بھی ویک اینڈ پر جانا ہے اور

ویک اینڈ ابھی دور ہے۔''

''اور مجھے حیرت ہوتی ہے۔ دنیا اتنی بڑی ہے اتنے موضوعات ہیں جنہیں ڈسکس کیا جا سکتا ہے مگر ان عورتوں کے پاس سوائے اس کے اور کوئی موضوع نہیں ہے کہ بچے کیوں نہیں ہیں۔'' وہ جلی بھنی بیٹھی تھی۔

''اپیا نے برسبیلِ تذکرہ یہ بات کی تھی اور جواب ملنے کے بعد اس موضوع کو دوبارہ نہیں چھیڑا۔ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ یہ تمہارا ناپسندیدہ موضوع ہے۔ یوں بھی یہ کپڑوں اور زیور سے زیادہ بہتر موضوع ہے۔'' میں تلخ ہو گیا۔

''تم اس وقت لڑائی کے موڈ میں ہو اور کوئی بات نہیں ہے، لیکن پلیز لڑنے کے لیے میرے علاوہ کسی اور کا انتخاب کرلو۔ میں ایک خوبصورت رات تباہ نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ میک اپ اتارتے ہوئے بولی۔

عموماً مجھے ایسی باتوں پر غصہ نہیں آتا میں ٹھنڈے مزاج کا شخص ہوں۔ یوں بھی اس میں غصہ کرنے والی کوئی بات نہیں پھر بھی پتا نہیں کیوں اس کی بات سن کر میں چڑ چڑا ہو گیا۔ جوتے اتار کر دور پھینکے۔

راحت نے حیرت سے میری جانب دیکھا اسے یقیناً مجھ سے اس قدر بدتہذیبی کی توقع نہیں تھی۔

''سہیل! بی ہیو یور سیلف!'' اس نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''شٹ اَپ میری زندگی اجیرن کر دی ہے تم نے۔'' میں دھاڑا۔

حالانکہ اب ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم دونوں کافی ٹھیک ٹھاک زندگی بسر کر رہے تھے وجہ اختلاف صرف ایک ہی تھی بچے۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟'' اس کے لہجے میں تیزی آ گئی پھر سر جھٹک کر آئینے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بولی تو اب اس کے لہجے میں نہ تیزی تھی اور نہ غصہ۔ ''میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ تم بلاوجہ لڑائی چاہتے ہو۔''

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف اور صرف آسیہ تھی بھولی بسری کتنی یادیں تازہ ہو گئی تھیں ایک عجیب سا احساس بیدار ہو رہا تھا۔ جسے برسوں پہلے میں نے تھپکیاں دے کر سلا دیا تھا۔ یہ احساس کہ میں نے وعدہ خلافی کی تھی یہ کہ

اسے امید دلا کر بیچ منجدھار میں چھوڑ گیا تھا۔ ان بیتے دنوں میں اکثر مجھے خیال آتا تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی اور میں۔

''بے وقوف لڑکی۔'' کہہ کر سارہ کے تصور میں گم ہو جاتا تھا۔

ہوتے ہوتے یہ احساس ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ دینے کو میرے پاس بے شمار دلیلیں تھیں۔ اپنی صفائی میں ڈھیروں دلیلیں دے کر خود کو مطمئن کر لیا کرتا تھا۔ پھر زندگی میں بھی اتنی تیزی تھی، اتنے کام تھے کرنے کو کہ کسی ایک لڑکی کو کب تک یاد رکھا جا سکتا تھا۔

مگر آج اچانک احساسِ جرم شدت اختیار کر گیا تھا مجھے غصہ آ رہا تھا خود پر اپنے رویے پر اپنی وعدہ خلافی پر اس جھوٹ پر جو میں نے ایک سادہ دل لڑکی سے بولا تھا۔

راحت سونے کے لیے لیٹی تو میں خواب گاہ سے نکل کر اسٹڈی میں آ گیا۔ باہر ٹھنڈی تاریک رات پھیلی ہوئی تھی اور میں آتشدان کے سامنے بیٹھا کافی کی پیالی سامنے رکھے ان لمحوں میں کھو رہا تھا جو برسوں کی دھند میں لپٹ کر میرے ذہن کے تاریک گوشوں میں بند ہو گئے تھے۔

وہ دن جب ممی اور پاپا مجھے کراچی جانے والے جہاز پر چڑھانے کے لیے ائیر پورٹ چھوڑنے آئے تھے۔

''فون کرتے رہنا۔'' ممی نے ہدایت دی تھی۔

''ممی! میں ن لیے آپ کو کراچی کا ایڈریس بھی نہیں دے رہا کہ آپ ابھی تک مجھے بچہ سمجھتی ہیں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں بچہ نہیں ہوں۔ میرا فون آئے تو ٹھیک نہ آئے تب بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اور ادھر وہ مجھے ائیر پورٹ کے اندر دھکیل کر مڑے اُدھر میں بھی پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ٹیکسی پکڑ کر فلائنگ کوچ کے اڈے پر پہنچ گیا۔

جہلم میرے لیے ایک دلچسپ یاد تھی۔ ہم برسوں پہلے اس گھر کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ چکے تھے میں نہیں جانتا تھا کہ ممی اور دادی اماں کی لڑائی کی وجہ کیا تھی۔ بس اتنا یاد ہے کہ اس روز خوب گھمسان کا رن پڑا تھا۔ ممی نے دھواں دھار روتے ہوئے پاپا کو فون کیا تھا۔

''میں ایک منٹ بھی اس گھر میں نہیں رہ سکتی فوراً آ کر ہمیں لے جائیں۔''

اور پاپا نے انہیں اپنے مسئلے بتائے تھے۔ ''میں یہاں ملتان میں پھنسا ہوا ہوں کیسے ابھی آ کر تمہیں لے جا سکتا ہوں۔ یوں بھی گھروں میں کبھی کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہوا کرتی کہ سب کے ساتھ مل کر رہا نہ جا سکے۔''

''آپ کو ہماری ضرورت ہو تو ہم آپ کو راولپنڈی میں مل جائیں گے' میں امی ابا کے گھر جا رہی ہوں۔'' ممی نے غصے میں ریسیور پٹخ دیا۔

اسی وقت انہوں نے ہمارا سامان پیک کرنا شروع کیا۔ دادی اماں نے یہ دیکھا تو مجھے اور گڑیا کو گلے لگالیا۔

''میں اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کبھی نہیں جانے دوں گی۔''

ممی نے ہمیں کھینچ کر ان سے الگ کیا اور پروین سے تانگہ لانے کو کہا۔ انکل کو خبر ہوئی تو انہوں نے ممی کو سمجھایا۔

''بھابی! آپ جانا چاہتی ہیں تو یہ آپ کی مرضی ہے کسی کو باندھ کر نہیں رکھا جا سکتا۔ البتہ یوں مت جائیے۔ راشد کے آنے کا انتظار کرلیں یا چاہیں تو میں آپ کو چھوڑ آؤں۔ رات ہونے والی ہے بچوں کا ساتھ ہے سامان بھی کافی ہے میں آپ کو کار پر پنڈی چھوڑ آتا ہوں۔''

بڑی مشکل سے ممی راضی ہوئیں۔ گھر سے نکلتے ہوئے کہتی گئیں۔

''اب مجھے بھی قسم ہے کہ میں یا میرے بچے جیتے جی اس گھر کی دہلیز عبور نہیں کریں گے۔ جس کسی کو جگر کے ٹکڑوں سے ملنے کی خواہش ہو' وہ میرے گھر آ کر ان سے مل لے۔''

اور ممی نے اپنی قسم خوب نبھائی تھی۔ پاپا تو دادی اماں کی طرف کبھی کبھار چلے جاتے تھے اور مہینے میں ایک آدھ مرتبہ آفس سے ہی انہیں فون بھی کر لیتے تھے لیکن ممی کا یا ہمارا اس روز کے بعد دادی اماں سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ وہی ہمیں عید پر عیدی بھی دیتی تھیں ہزار روپے میرے لیے مٹھائی کے نام پہ اور ہزار روپے گڑیا کے لیے چوڑیوں کے لیے اسی طرح ہماری سالگراہوں پر بھی چھوٹے موٹے تحفے آ جایا کرتے تھے۔ کبھی ہم شکریہ ادا کرنا چاہتے تو ممی کا مزاج بگڑ جاتا۔ انہوں نے کبھی صاف لفظوں میں تو منع نہیں کیا تھا لیکن جب وہ کہتیں۔

''ماں ساری عمر جان مار مار کر ہلکان ہو گئی اس کے لیے کبھی شکریہ کہنے کی زحمت نہیں کی' دادی اماں سال میں دو مرتبہ یاد کر لیتی ہیں تو ان کی محبت میں میرے بچے کڑھنے لگتے ہیں۔''

بس وہیں ہم اپنا ارادہ ترک کر دیتے۔ رفتہ رفتہ عیدی اور تحائف ایسا معمول بن گئے جن کے لیے ہمیں شکریہ ادا کرنا ایک فضول سی بات لگنے لگی یوں جیسے اسے یوں ہی ہونا ہے اور یہ ایسے ہی ہوتا ہے۔ ہاں کبھی میں اور گڑیا مل کر ان دلچسپ دنوں کو یاد کرتے تھے جو دادی اماں کے گھر بیتے تھے۔

وہ شرارت کر کے دادی اماں کی گود میں جا بیٹھنا اور ان کا یوں ہمیں اپنی چادر میں چھپا لینا جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے چھپاتی ہے۔ پھر ممی کا دانت پیسنا۔

گھر کے باہر سڑک کے کنارے وہ بوڑھا گھنا درخت جس کے تنے پر موٹے موٹے سیاہ مکوڑے رینگتے رہتے تھے اس پر جھولا ڈال کر گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں بھی ہم پینگیں ڈالا کرتے تھے۔ اس وقت آسیہ بہت چھوٹی تھی اور ان مکوڑوں سے سخت ڈرتی تھی۔ مزہ لینے کے لیے میں ہتھیلی پر ایک مکوڑا رکھ کر ہاتھ اس کے منہ کے آگے کر دیا کرتا تھا اور وہ زور زور سے رو پڑتی تھی۔

''نہیں کرو۔'' وہ اپنی توتلی زبان میں کہتی۔

اس کا یہ ''نہیں کرو'' سننے کے لیے میں کتنے ایسے کام کرتا تھا جو اسے ناگوار گزرتے تھے۔ اس کی باتیں بہت خوبصورت اور معصوم ہوتی تھیں۔ ٹی وی پر چلنے والا ایک ایک گانا اسے یاد تھا اور جب وہ خوب ہل ہل کر الٹے سیدھے گانے گاتی تو سب ہنس ہنس کر دوہرے ہو جاتے تھے۔ اس کی دلچسپ معصوم حرکتوں سے سبھی محظوظ ہوتے تھے سوائے ممی کے۔ وہ واضح طور پر کہا کرتی تھیں کہ انہیں اپنے بچوں کے علاوہ کوئی بچہ اچھا نہیں لگتا۔

رات کو پروین اکثر صحن کے چولہے پر روٹیاں پکاتی تھی۔ ان دنوں گھر میں گیس کے چولہے نہیں ہوتے تھے تیل کی بچت کی خاطر لکڑیوں پر روٹیاں پکائی جاتی تھیں۔ ہم بچے مل کر پروین کے پاس پیڑھیوں پر بیٹھ جاتے تھے اور روٹیاں پکتے دیکھا کرتے تھے جب آخری روٹی بھی پک چکتی اور پروین توا اتار کر ایک طرف الٹا کر رکھ دیتی تو اس پر

کتنی ہی سرخ سرخ چنگاریاں جلتی بجھتی دکھائی دیتی تھیں ہم انہیں دو فوجوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

''یہ پاکستان کی فوج اور وہ انڈیا کی فوج۔''

ہماری کوشش ہوتی کہ انڈیا کی فوج کے سپاہی پہلے بجھیں۔ جیسے جیسے انڈیا سے منسوب چنگاریاں بجھتیں ہم تالیاں پیٹنے لگتے۔ بعض اوقات ہم اس کھیل میں بے ایمانی بھی کر لیتے تھے کبھی پاکستانی فوج کی چنگاریاں جلدی بجھنے لگتیں تو ہم اسی لمحے فوجیں تبدیل کر لیتے تھے۔

''ہماری فوج ہار نہیں سکتی۔ دشمن کے جاسوس گھس آئے ہیں۔ فوجیں تبدیل کرو۔''

اور یوں جو فوج تھوڑی دیر پہلے انڈیا کی تھی وہ پاکستان کی بن جاتی تھی اور جو پاکستان کی ہوتی تھی اسے انڈین فوج بنا دیا جاتا تھا۔ گھر میں اے سی لگے ہوئے تھے لیکن دادی اماں کو اے سی والے کمرے میں سونا پسند نہیں تھا۔

''دیکھو اللہ تعالیٰ نے اتنی اچھی ہوا دی ہے پھر ہم اس کا فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔'' وہ کہتیں۔

اور جونہی ان کی چارپائی صحن میں بچھتی ہم بچے اس پر قبضہ کر لیتے۔ پھر دادی اماں ہمیں کہانی سناتیں' ایک ایسے کوے کی کہانی جو اپنی چونچ میں دس من چاول کی بوری دبا کر ایک شہر سے دوسرے شہر جایا کرتا تھا کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ابھی کہانی درمیان میں ہی ہوتی کہ ممی کی غصے بھری آواز آتی۔

''فوراً سے پیشتر اندر آؤ۔ کہانیاں سننے کا وقت ہوتا ہے تم لوگوں کے پاس پڑھنے کا وقت نہیں ہوتا۔ رات کو دیر سے سوتے ہو اسی لیے صبح اٹھا نہیں جاتا۔ چلو اندر کمرے میں۔''

اور ہم بادل ناخواستہ اندر خواب گاہ کا رخ کرتے۔ دل میں آسیہ سے جلن بھی محسوس ہوتی جس پہ ایسی کوئی روک ٹوک نہیں تھی اور وہ کہانی کا بقیہ حصہ سن سکتی تھی۔

اگلے روز ہم دادی اماں سے کہتے۔

''دادی اماں اب جلدی سے وہی رات والی کہانی سنا دیں۔''

''نہیں بیٹا دن میں کہانی سنانے سے اندھا فقیر راستہ بھول جاتا ہے۔'' وہ کہتیں۔

ہماری آتشِ شوق پھر بھی کم نہ ہوتی۔ ''آسیہ نے تو پوری سن لی ہوگی۔''

''ارے کہاں بیٹا وہ تو بہت چھوٹی ہے جلدی سو جاتی ہے۔''

اس بات سے ہمیں قدرے تسلی ہوئی۔

''تو دادی اماں کوئی ایسی کہانی سنا دیں جس سے اندھا فقیر راستہ نہ بھولتا ہو۔'' گڑیا خوش آمدانہ لہجے میں کہتی۔

''چلو ایک ایسی کہانی سنا دیتی ہوں۔'' وہ اپنی تسبیح ایک طرف رکھ دیتیں اور سنانا شروع کرتیں۔ ''ہمارے نبی پاک ﷺ تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے آپ ﷺ ان لوگوں کو معاف کر دیتے تھے جو آپ ﷺ کو تکلیف پہنچایا کرتے تھے۔''

اور ہم کہانی کی طرز پر سنائے گئے یہ واقعات بے حد دلچسپی سے سنا کرتے تھے۔

کبھی ہم پاس بہتے دریا میں ڈور ڈال کر بیٹھ جاتے تھے۔ کتنی کتنی دیر بیٹھے رہتے تھے مگر ایک مرتبہ بھی کوئی مچھلی ہاتھ نہیں آئی تھی۔ جب بسورتے ہوئے دادی اماں کے پاس پہنچتے تو وہ بازار سے مچھلی منگوا دیتی تھیں۔

یوں کتنی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں کتنی دلچسپیاں تھیں۔ دادی اماں کے گھر سے ہم دونوں بہن بھائیوں کو ایک عجیب قسم کا رومان وابستہ نظر آتا تھا۔ ہم بڑے ہو گئے تھے لیکن اس گھر کا ماحول بہت افسانوی سا لگتا تھا۔ دادی اماں کی محبت بھری آغوش یاد آتی تھی کبھی بہت شدت سے دل چاہتا تھا کہ ہم پھر ان سے ملیں' ایک جگہ اکٹھے ہوں ویسی ہی دلچسپیاں لوٹ آئیں۔ جب بھی ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے جہلم کے پُل سے گزرتا۔ دل دادی اماں کے گھر جانے ان سے ملنے کے لیے مچل اٹھتا لیکن ممی کو اس ذکر سے ہی جھرجھری آ جاتی تھی۔

''میرے خدا' کتنے بھیانک دن تھے وہ جو میں نے وہاں گزارے۔ اب تو میں اس شہر کے نام سے ہی چڑ گئی ہوں۔''

یوں یہ خواہش حسرت بن گئی تھی۔

لیکن اب جب میں ایم اے فائنل کے امتحان سے فارغ ہوا تو میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اب کی بار کچھ دن ضرور جہلم رہوں گا۔ ممی سے اجازت ملنے کا تو سوال ہی نہیں تھا اس لیے انہیں کراچی کا بتا کر خود جہلم پہنچ گیا۔

وہی دیکھی بھالی سڑکیں تھیں وہی گلیاں تھیں بس کچھ نئے مکان بن گئے تھے ورنہ شہر کچھ زیادہ نہیں بدلا تھا۔ تانگہ لینے کے بجائے میں پیدل ہی گھر کے لئے چل پڑا تھا۔ گھر کے باہر سڑک کے کنارے وہی بوڑھا گھنا سایہ دار درخت تھا جس کے تنے پر موٹے موٹے سیاہ مکوڑے رینگتے رہتے تھے لیکن اب اس پر جھولا نہیں تھا۔ گھر کا گیٹ بھی ویسا ہی تھا اور چار دیواری سے جھانکتے درخت بھی سب ویسے ہی تھے۔ گھنٹی بجا کر کسی کے آنے کا انتظار کرنے کے بجائے میں سیدھا ہی اندر چلا آیا۔ برآمدے سے ہی گیلری کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا جہاں سنہری مائل بھورے بالوں والی لڑکی دو چوٹیاں کیے فون پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھی۔

''ابا جی اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ میسج دے دیں' میں پہنچا دوں گی۔''

پھر کچھ دیر دوسری طرف بات سننے کے بعد اس نے ریسیور واپس رکھ دیا۔

میں مرکزی دروازے میں کھڑا اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا وہ یقیناً آسیہ تھی۔ ہمارے پورے خاندان میں کسی لڑکی کے ایسے بال اور ایسی آنکھیں نہیں تھیں کتنی بڑی ہوگئی تھی اور کتنی حسین بھی۔ خوبصورت گوری رنگت' گلابی رخسار یاقوتی ہونٹ اسے دیکھنے اور دیکھتے رہنے کو دل چاہتا تھا۔

اسی لمحے اس کی نگاہ مجھ پر پڑی میں اب بھی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر چند قدم آگے بڑھا اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

''بڑی اماں۔'' وہ بمشکل چلائی چہرہ پیلا پڑ گیا۔ قریبی کمرے سے آنٹی گھبرا کر نکل آئیں۔

''کیا ہوا آسیہ۔'' ساتھ ہی ان کی نگاہ مجھ پر پڑی گو کہ انہوں نے مجھے برسوں بعد دیکھا تھا پھر بھی ایک لمحے میں ہی پہچان گئیں۔

''سہیل؟''

''جی آنٹی میں سہیل ہوں۔'' میں آگے آیا۔ گھر میں سب نے بہت گرمجوشی اور خوشی سے میرا استقبال کیا۔ آسیہ کچھ حیران کچھ شرمندہ سی سب کے درمیان تھی۔

پہلی ہی نگاہ میں وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی۔

''دادی اماں۔ میرا استقبال تو آسیہ نے یوں کیا جیسے گھر میں کوئی چور گھس آیا

ہو۔'' میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نظریں جھکا کر وہ دھلے ہوئے کپڑے تہہ کرنے میں مصروف ہوگئی۔

''بچی بیچاری کو کیا خبر کہ کون منہ اٹھائے چلا آرہا ہے' اتنی سی تو تھی جب تمہاری ماں کی ضد نے تمہیں ہم لوگوں سے دور کر دیا تھا۔'' دادی اماں نے اس کی طرف داری کی۔

یہ دادی اماں کی عادت تھی وہ تقریباً ہر معاملے میں آسیہ کا ہی ساتھ دیا کرتی تھیں۔ خود چاہے اسے کچھ کہہ لیتیں لیکن کوئی اور اسے کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو انہیں آگ ہی لگ جاتی۔ اتنا زبردست حمایتی کوئی میرا یا گڑیا کا ہوتا تو ہم اس سے خوب خوب فائدہ اٹھاتے لیکن آسیہ کو میں نے کبھی اس بات کا فائدہ اٹھاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت کم گو تھی۔ صبح سویرے اٹھ کر گھر کے کچھ کام نمٹاتی پھر تیار ہو کر اسکول چلی جاتی۔ واپس آکر کھانا کھاتی اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پڑھنے بیٹھ جاتی۔ شام ہوتی تو ایک بار پھر گھر کے کام شروع ہو جاتے..... گھر کے کام نمٹاتی' ساتھ پڑھنے کی کوشش کرتی پھر رات کو کھانا کھا کر اپنا یونیفارم استری کر کے بستہ تیار کر کے سو جاتی۔

اس کی اس سادہ سی زندگی میں میرے لیے بہت کشش تھی۔ مدت ہوئی ہم ایسی زندگی بھول چکے تھے۔ ہماری مصروفیات بہت جدا تھیں۔ آگے پیچھے نوکر چاکر تھے۔ کالج دوست' کلب' اونچی موسیقی' تیز ڈرائیونگ' کھیل' پڑھائی' مختلف موضوعات پر دھواں دھار بحثیں اور نہ جانے کیا کیا۔ زندگی بہت تیز اور مصروف تھی کتنے کام یونہی پڑے رہ جاتے تھے کہ وقت نہیں ملتا تھا۔ کسی کی عیادت کرنی ہوتی' وقت کی کمی کے باعث نہ کر پاتے کسی کو خط لکھنا ہوتا تو ٹائم نہ ملتا۔ پاپا نے کسی کام کے سلسلے میں تاکید کی ہوتی تو وقت کی کمی آڑے آجاتی۔

لیکن اس چھوٹے سے شہر میں وقت وافر تھا۔ لوگ اپنے کام تسلی اور سکون سے نمٹاتے تھے۔ تانگہ ٹپ ٹپ کر کے ہولے ہولے چلتا رہتا اور کسی کو الجھن بھی نہ ہوتی۔ کسی بھی شہر کی زندگی کا اندازہ اس کی ٹریفک دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں بھی گاڑیاں تھیں کچھ تیز رفتاری سے بھی چلتی تھیں مگر عمومی مزاج دھیما پن لیے ہوئے تھا۔ بڑے شہروں کی طرح لوگ بلاوجہ بے چین پریشان اور اکتائے ہوئے نہیں لگتے تھے۔ ان کے

پاس لوگوں کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کا وقت تھا۔ یہاں کی مٹی میں محبت بھی گندھی ہوئی تھی۔

میں برسوں بعد یہاں آیا تھا اور اس سادگی اور سکون نے مجھے اپنا اسیر بنا لیا تھا۔ یہاں سے واپس جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ لاہور کی ہنگامہ خیز زندگی سے ہٹ کر سکون کے جو چند لمحے میں نے چرائے تھے انہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔

دادی اماں کو تجسس تھا کہ کیا سچ مچ ممی نے اپنی قسم توڑ دی تھی اور کیا اب وہ اور گڑیا بھی یہاں آئیں گی؟

''پتا ہے دادی اماں۔'' میں انہیں بتانے لگا۔ ''ممی کا خیال ہے کہ میں کراچی میں ساحلِ سمندر پر چھٹیاں منا رہا ہوں جبکہ میں یہاں آپ کے پاس جہلم میں ہوں۔ انہوں نے خود مجھے ائیر پورٹ پر چھوڑا تھا اور ڈھیر ساری تاکیدیں کی تھیں۔ اُدھر وہ اور پاپا ائیر پورٹ سے باہر نکلے اِدھر میں ٹیکسی پکڑ کر فلائنگ کوچ کے اڈے پر سیدھا ٹکٹ کٹا کر یہاں جہلم پہنچا ہوں۔''

میرے کہتے ہی آسیہ اپنی کاپی پر خاکی کاغذ چڑھانا بھول کر حیرت سے میری جانب دیکھنے لگی۔ اسے اس قدر حیرت زدہ دیکھ کر مجھے ہنسی آنے لگی۔

''اور اسے دیکھیں دادی اماں!'' میں نے آسیہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیسے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں پھاڑے منہ کھولے میری طرف دیکھ رہی ہے۔''

شرمندگی سے اس نے سر جھکا لیا۔ حالانکہ مجھے توقع تھی کہ کم از کم اس بار اس کی جانب سے کوئی تیکھا جواب ضرور آئے گا لیکن وہ بجائے کچھ کہنے کے قینچی سے خاکی کاغذ کاٹنے لگی۔

''معصوم سی بچی ہے میری' اسے ایسے مت کہا کرو۔ یہ تو حیران ہوگی ہی کہ کیسے دھوکا دے کر تم یہاں چلے آئے۔'' بڑی اماں نے فوراً اس کا دفاع کیا۔

''ہاہاہا۔'' میں نے قہقہہ لگایا صرف اس لیے کہ اب وہ کچھ نہ کچھ ضرور بولے گی۔

''معصوم ہے یا بیوقوف؟ مجھے تو بیوقوف لگ رہی ہے۔ یاد ہے تمہیں آسیہ!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''جب ہم یہاں سے گئے تھے اس وقت تم فراک سے ناک صاف کرتی تھیں۔ آنٹی تو سر پیٹ لیتی تھیں کہ کوئی فراک نہیں چھوڑتی یہ لڑکی۔''

اب یہ آسیہ پر سراسر الزام تھا وہ بہت بچپنے...... سے ہی انتہائی نفیس اور صفائی پسند تھی ہاتھ پر مٹی کا ذرا سا ذرہ لگ جاتا تو اس وقت تک سب کو اپنا ہاتھ دکھا کر روتی رہتی جب تک کوئی اس کا ہاتھ دھلا نہیں دیتا تھا۔ اس الزام پر اسے جواباً کچھ نہ کچھ بولنا ہی چاہیے تھا۔

لیکن اس کا ردِعمل بہت جدا تھا بجائے کچھ کہنے کے اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر سر جھکا لیا۔ چہرہ مارے شرمندگی کے سرخ ہوگیا۔

میں اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ ''دادی اماں دیکھا قندھاری انار۔'' میں نے اس کے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ کاپی پر کور چڑھانا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''میری بچی کچھ بولتی نہیں تو سب اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔'' دادی اماں کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''تو بول لیا کرے کسی نے اس کی زبان پر تالے تو نہیں لگا رکھے۔ میں نے کچھ کہا جواب میں یہ بھی کہہ سکتی تھی۔''

''وہ بیچاری کیا بولے۔ بیٹا جس کے سامنے بار بار اس پر کیے احسان جتائے جائیں وہ بولنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ مل تو اسے اسی گھر سے رہا ہے لیکن کسی کا کیا جاتا ہے اگر باتیں سنائے بغیر اسے دے دے۔ یہ تو اتنی معصوم ہے کہ دل دُکھانے والی باتوں کے باوجود بھی سب سے محبت کرتی ہے' سب کے کام آتی ہے۔''

یہ بات نہ تو میں نے کبھی نوٹ کی تھی اور نہ ہی اس پہلو پر سوچا تھا۔ اس پیاری سی لڑکی کی کشش میرے لیے کچھ اور بڑھ گئی۔

اس شام بھی وہ حسبِ معمول سیڑھی پر بیٹھی کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ مجھے شرارت سوجھی' اس کے بدرنگ کپڑے یوں بھی مجھے الجھن میں مبتلا کر دیتے تھے۔

''دادی اماں' دادی اماں۔'' میں عین اس کے پیچھے کھڑے ہو کر چلایا۔

وہ خاموشی سے کام میں مصروف رہی' میں نے اس کے کان کے اور قریب منہ کر لیا۔

''دادی اماں!'' اس نے اب بھی سر نہ اٹھایا۔

"چھوڑنے والا میں بھی نہیں ہوں کب تک بات نہیں کرو گی۔" میں نے دل میں سوچا۔

اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "کمال ہے دادی اماں میں بلائے جا رہا ہوں اور آپ کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔"

وہ یوں اچھل کر پلٹی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ گود میں رکھی کاپی کتاب اور پین سب نیچے فرش پر گر پڑے۔ کاپی کتاب کی تو خیر بچت ہوگئی لیکن پین کی نب ٹوٹ گئی۔ اس کی رنگت بالکل زرد ہوگئی تھی۔

"ارے یہ تم ہو؟ میں سمجھا دادی اماں ہیں' کچھ ایسے ہی کپڑے ان کے بھی ہیں۔" میں نے اس سے کہا۔

اس کا پیلا چہرہ ایک دم غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس کا بس چلتا تو میرا منہ نوچ ڈالتی۔ پہلے کبھی میں نے اسے اس طرح غصے میں نہیں دیکھا۔

"مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔" اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

میں کِھل اٹھا یہی تو میں چاہتا تھا کہ وہ بات کرے اور اس کے جواب میں' میں کچھ کہوں پھر وہ بولے اور یوں اس کی چپ ٹوٹے میں جواباً بولا۔

"ارے مگر یہ مذاق کب تھا۔ میں حقیقت میں تمہیں دادی اماں سمجھا تھا۔ ایسے رنگوں کے کپڑے میں نے تمہاری عمر کی کسی لڑکی کو پہنتے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ رنگ تو دادی امائیں ہی پہنا کرتی ہیں۔"

وہ غصے سے اُبل رہی تھی پھر بجائے اس کے کہ وہ کچھ کہتی مجھ سے لڑتی' اس نے اپنی کاپیاں کتابیں سمیٹیں اور کوارٹر کی طرف بڑھ گئی۔ میں وہیں کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔

مجھے اُلجھن ہونے لگی تھی۔ اس میں ایک مقناطیسی کشش تھی' میں اس کی جانب بڑھے بغیر رہ نہیں سکتا تھا مگر چاہتا تھا کہ اس میں بھی تھوڑی سی شوخی تھوڑی سی زندہ دلی ضرور پیدا ہو جائے۔ یہاں سے واپس جانے کی مجھے کوئی جلدی نہیں تھی اس لیے اطمینان سے اسے اپنی پسند کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

اسی وقت میں بازار کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ پہلی مرتبہ اسے کچھ دینے کا ارادہ کیا تھا

اس لیے میں محتاط بھی تھا۔ پہلے سیدھا کپڑوں کی دوکان میں پہنچا اور اس کے لیے سرخ پرنٹڈ سوٹ خریدا۔ وہاں سے سیدھا بک شاپ پہنچا اور ایک پین اور اسکربل پیڈ خریدا تینوں چیزوں کو رنگین کاغذ میں ملفوف کیا اور گھر کی راہ لی۔ آخر اس کی ناراضگی بھی تو ختم کرنی تھی۔ پہلے گھر کے کمروں میں جھانکا وہ کہیں نہیں تھی۔ برآمدے اور صحن میں بھی نظر نہیں آئی۔

"گویا ابھی تک کوارٹر میں ہے۔" میں نے سوچا اور وہاں چلا آیا۔

کوارٹر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر داخل ہو کر اِدھر اُدھر جھانکا' ایک کمرا خالی تھا' میں دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جس کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا اندر جھانکا تو وہ بستر پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔

"آسیہ!" میں نے اسے پکارا۔

اس نے ایک دم چونک کر سر اٹھایا۔ اس کی روئی روئی سرخ آنکھیں اور گالوں میں پھیلی آنسوؤں کی لکیر دیکھ کر میرے دل کو دھکا سا لگا۔ اپنے خیال میں میں نے اتنا بڑا اور سنگین مذاق بھی نہیں کیا تھا جسے وہ یوں اپنے دل پر لے گئی۔

میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"آئی ایم سوری آسیہ! میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔" میں نے افسوس سے کہا۔

وہ خاموش نظریں جھکائے رہی۔

"اور اس وقت تمہیں روتے دیکھ کر مجھے بہت ہی افسوس ہوا ہے۔" اسے چپ دیکھ کر میں نے بات آگے بڑھائی۔ "میری وجہ سے تم دکھی ہو' یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔ میرا نہیں خیال تھا کہ یہ ایسا تکلیف دہ مذاق ہوگا جو تمہیں اتنا پریشان کر دے گا۔ دراصل مجھے تمہیں اتنے ڈل رنگ پہنے دیکھ کر الجھن ہوتی ہے تمہیں معلوم ہے تم کس قدر خوبصورت ہو؟" ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کے تاثرات کا جائزہ لینا چاہا لیکن وہاں سوائے آنسوؤں کے نشان کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔ "نہیں تمہیں شاید احساس ہی نہیں ہے میرا دل چاہتا ہے کہ تم کھلتے ہوئے شوخ رنگوں کے کپڑے پہنا کرو' پھر دیکھو تمہارے حسن کو وہ کیا کہتے ہیں۔ ہاں چار چاند لگتے ہیں۔"

مجھے توقع تھی کہ وہ جواباً کچھ کہے گی کوئی میٹھی بات نہ سہی کوئی کڑوی بات ہی سہی چاہے غصہ چاہے تلخی چاہے آنسو کوئی سیڑھی تو ملے گی ہی کہ وہ جو بہت دور کھڑی لگتی تھی بہت بلندی پر اس تک پہنچنے کا راستہ ملے گا۔

لیکن وہ اب بھی چپ رہی۔ میری الجھن میں اضافہ ہو گیا۔

''میں کب تک بکواس کرتا رہوں گا تمہارے منہ میں زبان ہے یا نہیں؟'' لیکن اسی لمحے مجھے افسوس ہوا مجھے اس انداز میں اس سے بات نہیں کرنا چاہیے تھی وہ بیچاری تو پہلے ہی سہمی رہتی تھی اس طرح بات کرنے سے تو وہ مجھ سے بالکل ہی دور ہو جاتی۔ سو اب کے میں نے نرمی سے کہا۔ ''خیر جانے دو' یہ بتاؤ کہ تمہارے لیے کپڑا کون خریدتا ہے؟''

''بڑی اماں۔'' اس نے بہت مدہم آواز میں مختصراً جواب دیا۔ ''جو وہ لاتی ہیں لے لیتی ہوں؟''

''کبھی کیوں نہیں کہا اتنے ڈل رنگ نہیں پہنوں گی؟''

''ضرورت نہیں سمجھتی۔''

اب مجھے غصہ آنے لگا۔ خواہ مخواہ ہی میں اس سے الجھ پڑا۔ ''کیوں خود کو ایک خول میں بند کر رکھا ہے تم نے؟''

''کیونکہ اس گھر سے۔'' اس نے تیز لہجے میں انتہائی تلخی سے کہنا شروع کیا لیکن اسی لمحے زبان دانتوں تلے دے دی۔ پھر ایک پل کو جیسے تھک کر آنکھیں موند لیں اور گہرا سانس لیا اور پھر میری جانب دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ''نہیں کوئی بات نہیں ہے۔ آپ جائیں مجھے پڑھنا ہے۔''

مجھے بہت افسوس ہوا اس نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا تھا لیکن میں بھی ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔

میں نے اس کی جانب شرارت سے دیکھا۔ ''پڑھو گی کیسے؟ تمہارے پین کی نب فرش پر گر کر ٹوٹ گئی تھی اور تمہارے غصے کا آتش فشاں اتنا ابل رہا تھا کہ تمہیں شاید پتا بھی نہیں چلا۔ چاہو تو دیکھ لو۔''

اس کے چہرے پر الجھن پھیل گئی لیکن بولی کچھ نہیں۔ تھوڑی دیر اس کے کچھ بولنے کا انتظار کر کے میں نے ہی بات شروع کی۔

''میں نے سوچا کہ کہیں میرے زبانی کلامی سوری کہنے کو بھی تم مذاق نہ سمجھو اس لیے ثبوت کے طور پر یہ لایا ہوں امید ہے تمہیں اچھا لگے گا۔'' میں نے میز پر پڑا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''تھینک یو مگر میں یہ لے نہیں سکتی۔ آپ نے سوری کہہ دیا میں نے اسے مذاق نہیں سمجھا۔'' اس نے اب بھی ہاتھ بڑھائے بغیر کہا۔

میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ کیا سحر تھا اس لڑکی میں' کیا منتر پڑھا تھا اس نے کہ اس کی طرف سے نگاہیں ہٹانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا اور پھر اس کی روئی روئی سرخ آنکھیں جو مجھے اس احساس جرم میں مبتلا کر رہی تھیں کہ ان خوبصورت آنکھوں میں آنسو لانے کا ذمہ دار میں ہی تھا۔

میں نے پیکٹ میز پر رکھ دیا اور خود اٹھ کھڑا ہوا۔ ''پھر بھی یہ میں تمہارے لیے ہی لایا ہوں۔''

ٹہلتے ٹہلتے گھر پہنچا تو کافی دیر گزر چکی تھی ادھر ادھر جھانکا آسیہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر کوارٹر کی طرف نگاہ دوڑائی جس کی کنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی۔ گویا آسیہ گھر پر ہی تھی اور جب وہ گھر میں کہیں اور نہیں ملتی تھی تب دادی اماں کے کمرے میں مل جاتی تھی میں وہاں چلا آیا۔ ابھی دروازے میں پہنچا ہی تھا کہ آسیہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''بڑی اماں مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا۔''

''ہاں کہو۔'' دادی اماں بولیں جو اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

آسیہ نظریں جھکائے ہوئے بات کر رہی تھی۔ ''میں آج اپنا ہوم ورک کر رہی تھی کہ مجھے سہیل بھائی نے ڈرایا۔ میرا پین گر کر ٹوٹ گیا میں نے ان پر تھوڑا سا غصہ بھی کیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ آئے سوری کیا اور یہ پیکٹ دے گئے۔ میں نے منع کیا لیکن وہ مانے نہیں کہہ رہے تھے پین ہے اس میں۔ مگر اتنے بڑے پیکٹ میں صرف پین تو نہیں ہو سکتا میں اسے رکھنا نہیں چاہتی آپ یہ انہیں واپس کر دیں۔''

وہ لہجے میں شرمساری سموئے بات کر رہی تھی اور میں دبے قدموں سے اندر چلا آیا تھا اس کی بات جاری تھی کہ میں دادی اماں کے ساتھ ان کے گلے میں بازو ڈال کر بیٹھ گیا

وہ چند لمحے اسی طرح بیٹھی رہی پھر ایک دم خوفزدہ ہو کر نگاہیں اٹھائیں۔ مجھے دادی اماں کے ساتھ یوں بیٹھے دیکھ کر اس کی رنگت اور پیلی پڑ گئی۔

اسی وقت دادی اماں نے مجھے گھورا۔ ''تم نے آسیہ کو ڈرایا تھا؟''

میں یوں بولا جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں تھی۔ ''میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ سیڑھیوں پر آپ بیٹھی ہوئی ہیں کپڑے دیکھیے ہیں کیا پہن رکھے ہیں اس نے؟ میں تو توقع نہیں کر سکتا تھا کہ ایسے رنگ دادی اماں کے علاوہ بھی کوئی پہن سکتا ہے وہ بھی ایسی لڑکی جو میٹرک میں پڑھ رہی ہو' بس اس لیے دادی اماں' دادی اماں پکارتا رہا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو آپ سمجھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ تو ڈرنے پر تیار بیٹھی تھی۔ ایسے اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ کتاب کاپی پین سب فرش پر' اب ظاہر ہے قصور میرا نہیں تھا' کس نے کہا تھا کہ دادی اماں لگے۔''

دادی اماں نے میرا کان کھینچا۔ ''اب ستایا تم نے آسیہ کو تو کان جڑ سے نکال دوں گی۔ کچھ رحم کرو تم لوگ اس بن ماں باپ کی بچی پر۔ کیوں دل دکھاتے ہو اس کا وہ کچھ نہیں کہتی تو سب کے حوصلے بڑھتے جاتے ہیں۔''

میں نے اپنا کان چھڑایا۔ ''یہی تو مجھے الجھن ہوتی ہے۔ کیوں نہیں کچھ کہتی آخر؟ اس عمر کی لڑکیوں کے پاس تو باتیں ختم ہی نہیں ہوتیں۔ وہ گڑیا ہے گھر میں ایک منٹ کو اس کی زبان تالو سے نہیں لگتی۔ یہ کیوں چپ رہتی ہے ایسے لگتا ہے اسی سال کی کسی بڑھیا کی روح گھسی ہوئی ہے اس میں۔''

''کس کے آگے بیچاری بولے اور کیسے بولے۔ یہ شکر ہے کسی نے اب تک نکالا نہیں ہے اسے یہاں سے۔ اگر اس گھر میں کھاتی پیتی ہے تو کسی کا احسان نہیں ہے۔ اس پر صبح سے رات تک پھرکی کی طرح کام کرتی رہتی ہے اپنی پڑھائی سو الگ مگر اپنی اپنی سوچ کی بات ہے یہاں سب کو اپنا دیا نظر آتا ہے اس کا کیا کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔''

وہ پرسکون ہو گئی تھی۔ پیکٹ دادی اماں کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''لیں بڑی اماں یہ پیکٹ میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔''

''دیکھا کتنی سیانی ہے میری آسیہ۔'' دادی اماں کا لہجہ فخریہ تھا۔

مجھے غصہ آ گیا تحفہ واپس کر دینے میں بھلا کون سا سیانا پن ہے' میں نے تو لڑکیوں کو

اپنے منہ سے بڑی بڑی فرمائشیں کرتے دیکھا تھا۔ میں نے پیکٹ دادی اماں کے ہاتھ سے لے کر اسے زبردستی تھمانے کی کوشش کی۔

''اگر تم نے یہ نہ لیا تو میں سمجھوں گا کہ تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو اور میں مزید ایک لمحہ بھی اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ میں نے صرف مذاق کیا تھا اور مجھے علم نہیں تھا کہ میرا مذاق اس قدر مہنگا پڑے گا۔''

وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور ملتجی نگاہوں سے دادی اماں کو دیکھنے لگی۔

''چلو لے لو' اس طرح چھپ کر دینا غلط تھا۔ اب میرے سامنے دے رہا ہے تو کوئی حرج نہیں۔'' انہوں نے کہا۔

مجھے تو آگ ہی لگ گئی' چھپ کر دینے کا کیا ذکر؟ اس میں چھپانے کی کیا بات تھی؟

''میں نے ہرگز چھپ کر نہیں دیا تھا' اور مجھے کسی سے کچھ چھپا کر کیا کرنا ہے۔ نہ ہی میں نے کوئی ایسی چیز دی ہے جسے چھپایا جائے۔'' میں نے غصے میں کہتے ہوئے پیکٹ پر چڑھا رنگین کاغذ پھاڑ دیا اور اس میں لپٹی چیزیں دادی اماں کے بستر پر گر پڑیں۔

''دیکھ لیں' کوئی ایسی چیز نہیں جو چھپائی جائے۔'' میں نے سوٹ' اسکریبل پیڈ اور پین تینوں دادی اماں کے آگے پٹخے اور واک آؤٹ کر گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر بھی میں خواہ مخواہ چیزوں کی اٹھا پٹخ کرتا رہا۔

رات تک میرا مزاج قدرے بحال ہو گیا تھا لیکن اس وقت میں خوشی سے اچھل پڑا جب میز پر ایک کتاب کے نیچے سے مجھے آسیہ کا بنایا ہوا شکریہ کا کارڈ ملا' بہت خوبصورت گلابی اور نیلے پھولوں سے سجا ہوا وہ کارڈ میرے لیے بہت خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔ کھول کر دیکھا خوبصورت لکھائی میں فقط اتنی تحریر تھی۔

آپ کے تحفے کا بے حد شکریہ۔

''آسیہ۔''

گویا اس نے بالآخر میرا تحفہ قبول کر لیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صرف اتنی سی بات مجھے یوں خوش کر دے گی' یہ اس کی جانب سے پہلی پہلی پیش قدمی تھی اور مجھے یقین تھا کہ یہ جاری رہے گی' اس کا مطلب تھا کہ اس نے میرے بارے میں سوچا

تھا۔ اس کے دل میں میرے لیے کوئی نرم گوشہ ضرور پیدا ہوا تھا۔

شام کو وہ سیڑھیوں پر بیٹھی ہوم ورک کر رہی تھی۔ لکھتے ہوئے کلائی میں کانچ کی چوڑیاں بج رہی تھیں اور میں اس جلترنگ کی طرف بڑھنے پر مجبور تھا۔

''میں اس شکریے کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔'' اس کے برابر بیٹھ کر میں نے کہا۔

اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور پھر سہم گئی۔ نہ جانے کیوں وہ اتنی اتنی سی باتوں پر خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ میں اسے ڈر کی اس فضا سے نکالنا چاہتا تھا۔

''یہاں فرش پر بیٹھ کر کیوں پڑھتی ہو۔ تمہارے کمرے میں تو رائٹنگ ٹیبل بھی ہے۔''

''وہیں چلی جاتی ہوں۔'' وہ اتنی جلدی جلدی کتابیں سمیٹنے لگی جیسے کب سے وہاں جانے کی منتظر ہو۔

''بیٹھو میں چلا جاتا ہوں۔'' مجھے غصہ بھی آیا لیکن میں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ عجیب دماغ کی لڑکی تھی۔ کچھ سمجھ ہی نہیں رہی تھی۔ ہر وقت مجھ سے دور بھاگنے کی فکر میں رہتی تھی۔

وہ رک گئی لیکن میں بھی اپنی جگہ سے نہیں اُٹھا۔

''کیا پڑھ رہی ہو؟'' میں نے بات بڑھانے کی خاطر کہا۔

''انگلش۔'' ہمیشہ کی طرح مختصر جواب تھا۔

''ادھر دکھاؤ اپنی کتاب۔'' میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

اس نے بغیر کچھ کہے کتاب میرے ہاتھ میں تھما دی۔

''پوئم پڑھی جا رہی ہے۔ پوئٹری کا شوق ہے؟''

''ہوں، ہوم ورک بھی ملا ہوا ہے، سمری لکھ رہی ہوں۔''

اس کے اتنے طویل فقرے سے میرے دل کی کلی کھل اُٹھی، ورنہ وہ تو بات اس قدر مختصر کرتی تھی کہ پورا فقرہ بعض اوقات ایک لفظ میں ختم ہو جاتا تھا۔ تاہم میں نے اس پر اپنی یہ خوشی ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔

''تم لوگ سمری لکھتے ہو؟''

''جی امتحان میں بھی آتی ہے، اس لیے لکھنی تو ہوتی ہے۔''

اس کی اس معصومیت پر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ کوئی شک نہیں کہ وہ لائق اور ذہین تھی مگر اس کا کینوس بہت محدود تھا۔ جہاں میں رہتا تھا، وہاں انگریزی بولنا فخر اور اردو بولنا باعث شرم سمجھا جاتا تھا۔ وہاں کوئی لڑکی ایسی بات کہنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔

''دو میں لکھ دیتا ہوں تمہیں۔'' میں نے کاپی پین لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

وہ ایک دم خوش ہو گئی، نیلی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اسے خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہو گیا۔ اب وہ مجھ سے خوفزدہ نہیں تھی، نہ ہی اسے وہاں سے اُٹھ بھاگنے کی فکر تھی۔ کاپی اور پین مجھے دیتے ہوئے وہ احسان مندی سے بولی۔

''تھینک یو، میں اتنی دیر میں کیمسٹری کا کام کر لوں گی۔''

اس نے بیگ سے دوسری کتاب اور کاپی نکال لی، چھوٹا سا کیلکولیٹر بھی سامنے رکھ لیا۔ میں نظم کی سمری لکھنے لگا۔

''تمہارا آگے فائن آرٹس پڑھنے کا ارادہ ہے؟'' میں نے اس سے مزید دوستی کی غرض سے پوچھا۔

''نہیں، میں ڈاکٹر بنوں گی، بڑی اماں کہتی ہیں کہ مجھے ڈاکٹر بننا چاہیے۔''

اب اس کی تعریف کرنا ضروری تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہل جانے والی لڑکی تھی۔

''میں سمجھا کہ فائن آرٹس پڑھو گی، اتنا خوبصورت کارڈ بنایا تم نے کہ میں حیران رہ گیا۔ واٹر کلرز کو ہینڈل کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔''

اس کے یاقوتی ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ خوبصورت گورا چہرہ جگمگا اُٹھا۔

''تھینک یو۔''

اس لمحے اس کا تمام تر خوف دور ہو چکا تھا۔ وہ پُر سکون تھی اور خوش بھی۔

میں نے بھی مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں معلوم ہے تمہاری مسکراہٹ کس قدر خوبصورت ہے، تم بہت حسین ہو۔''

اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ کتنے عرصے بعد میرا واسطہ کسی ایسی لڑکی سے پڑا تھا جو بغیر بلش آن کے بھی بلش ہو سکتی تھی۔

وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں اپنے کمرے میں جا کر ٹیسٹ یاد کر لوں۔''

میں ہنس پڑا۔ "جاؤ۔"

وہ چلی گئی اور میں اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اس مرتبہ وہ گھبرا کر سہم کر مجھ سے دور نہیں بھاگی تھی۔ اس لیے میں مطمئن تھا۔ پھر وہیں بیٹھ کر میں نے نہ صرف اس نظم بلکہ دو اور نظموں کے بھی خلاصے لکھ لیے اور اس کے کمرے میں جا پہنچا کھلے دروازے میں کھڑے ہو کر میں نے اسے پکارا۔

"آسیہ۔"

وہ جو کتاب پر نظریں جمائے بیٹھی تھی' چونک اُٹھی' چہرہ پھر سرخ ہونے لگا۔

"اندر آ سکتا ہوں؟"

"آیئے پلیز۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

اس کی گھبراہٹ مجھے محظوظ کر رہی تھی۔ "بھئی یہ غلط بات ہے یہ حق صرف صنف نازک کا ہے کہ ان کے آنے پر کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا جائے' عورتیں کب سے یوں کھڑے ہو کر مردوں کا استقبال کرنے لگیں۔" میں اس کی رائٹنگ ٹیبل کے ایک کونے پر ہی ٹک گیا۔

وہ اور گھبرا گئی اور بیٹھتے ہوئے دھیرے سے بولی۔ "سوری؟"

میں نے کاپی اس کے سامنے سرکا دی۔ "یہ رہی تمہاری سمری' تین نظموں کی لکھ دی ہیں عیش کرو اور مجھے دعائیں دو۔"

"تھینک یو۔" ایک اور مختصر جواب۔

لیکن اب میں مطمئن تھا۔ میں اس سے اظہار کر سکتا تھا۔ دھیرے دھیرے ہولے ہولے چلنا مجھے بہت مشکل لگتا تھا۔ بس اتنا کافی تھا کہ وہ مجھ سے خوفزدہ نہیں تھی۔ میری موجودگی میں خوش بھی تھی اور مطمئن بھی۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں جمائی ہوئی تھیں۔ "پتا ہے آسیہ! عجیب سی بات ہوئی ہے جانتی ہو کیا؟"

اس نے بغیر کچھ کہے سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

"یہ بندہ جس کا نام سہیل ہے پھنس گیا۔ ایک ایسے پنجرے میں جس کے گرد سلاخیں بھی نہیں ہیں۔"

اس کے چہرے پر کچھ اور رنگ بکھر گئے۔ مسکرا کر اس نے سر جھکا لیا۔

"پوچھو گی نہیں وہ کون ہے؟"

وہ خاموش رہی سر جھکائے' دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے اس کا گلابی چہرہ روشن ہو گیا تھا' آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے تھے۔

"تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے آسیہ کہ تم میں کتنی دلکشی کتنی کشش ہے۔ تم میں ہر وہ خوبصورتی ہے جو تم سے محبت کرنے اور کرتے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ تمہاری صورت ہی نہیں عادتیں بھی پیاری ہیں۔ آئی لو یو۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں اور یہ احساس بہت خوش کن ہے۔"

وہ اب بھی چپ رہی چہرے کی حدت میں اضافہ ہوتا رہا۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر خود ہی کہنے لگا۔

"تم سن رہی ہو آسیہ؟" وہ پھر بھی کچھ نہ بولی۔

"کچھ نہیں کہو گی تم؟ کوئی ایک لفظ یا صرف ایک مسکراہٹ۔"

اب کے بھی اس نے کچھ نہیں کہا نظر تک اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ میں کچھ دیر بیٹھا رہا' ہمارے درمیان خاموشی تھی۔ صرف باہر سے لہروں کا مدھم شور سنائی دے رہا تھا۔ میں منتظر تھا۔ میرے لیے یہ نئی بات تھی کہ اتنے واضح اظہار کے بعد بھی کوئی لڑکی خاموش رہے یہ ان لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی جن کا میں عادی تھا۔

بالآخر میں اُٹھ کر باہر چلا آیا۔ گھر میں عجیب سی بیزاری محسوس ہو رہی تھی۔ اگر آسیہ نے کچھ کہہ دیا ہوتا یا میری طرف دیکھ کر صرف مسکرا دی ہوتی تب بھی میں اتنی اکتاہٹ نہ محسوس کرتا جیسا کہ اب کر رہا تھا۔

میں عموماً رات کو دیر تک کوئی کتاب پڑھتا رہتا تھا یا ٹی وی پر فلم دیکھ لیا کرتا تھا۔ اس رات نہ کوئی کتاب تھی اور نہ ہی ٹی وی پر کوئی فلم آ رہی تھی بور ہو کر باہر نکل آیا۔

دریا کے کنارے کنارے چلتے ہوئے گھر کے عقبی حصے میں مجھے سایہ سا نظر آیا' نرم نرم ہوا میں ایک آنچل لہرا رہا تھا۔ ذرا اور قریب آیا تو چاندنی میں ڈھلا وہ مجسمہ واضح ہو گیا۔ وہ کوئی اور نہیں آسیہ تھی۔ آستینیں کہنیوں تک چڑھائے ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکائے وہ دریا کی لہریں دیکھ رہی تھی۔

مجھے اسے وہاں بیٹھے دیکھ کر حیرت ہوئی' میرا تو خیال تھا کہ وہ سو چکی ہوگی' اور پھر یہاں وہ بالکل تنہا تھی' کہاں تو وہ بات بات پر خوفزدہ ہو جاتی تھی' اب تاریکی میں دریا کے بالکل پاس خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ گم صم سی۔

اسی لمحے اس نے دوپٹہ ٹھیک کیا' کانچ کی چوڑیاں جلترنگ کی طرح بج اُٹھیں میں اس کی مقناطیسی کشش کا اسیر ہو گیا اور اس کے برابر آ بیٹھا۔

''ارسلان بھائی!'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ میرے اندر جیسے سب کچھ بکھر گیا۔ اگلے ہی پل اس نے میری جانب رخ کیا۔ میں اس کے پاس سے اُٹھ کھڑا ہوا اور گھر کی طرف چل دیا۔

اپنے کمرے میں سگریٹ پھونکتے ہوئے میرا خود پر لعنت بھیجنے کو دل چاہ رہا تھا۔

میں نے ایک کارڈ کے ملنے سے ایک مرتبہ مسکرا کر دیکھ لینے سے کیا کیا امیدیں باندھ لیں' میں تو اتنا بیوقوف نہیں تھا پھر یہ مجھے کیا ہوا؟ وہ ارسلان بھائی کی منتظر تھی اور میں احمقوں کی طرح اس کے پاس جا پہنچا۔

مگر یہ کتنی افسوسناک بات ہے کہ میرا دل دُکھ رہا ہے۔ بھلا کیوں؟ ابھی میں آسیہ کے عشق میں گوڈے گوڈے بھی نہیں دھنسا تھا کہ اس بات کا اتنا اثر لے لوں۔ پھر بھی کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے تہیہ کر لیا کہ صبح ہوتے ہی لاہور واپس چلا جاؤں گا۔

صبح کمرے میں کھٹ پٹ کی آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ مندی مندی آنکھوں سے میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ میز کے قریب آسیہ کھڑی تھی پہلے میں بلا سوچے سمجھے ہی اُٹھ کر بیٹھنے لگا لیکن جب اس نے میرا والٹ اٹھایا تو میں دم سادھے لیٹ گیا۔ مجھے حیرت بھی تھی کہ وہ میرے کمرے میں میرے والٹ کے ساتھ کیا کر رہی تھی۔ پھر چند لمحوں بعد وہ دبے پاؤں خواب گاہ سے نکل گئی۔ میں فوراً اُٹھا اور ایک جست میں میز تک پہنچ گیا' والٹ کھولا اس میں ہر چیز ویسی ہی تھی' صرف کاپی سائز کے ایک کاغذ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

''کوئی لو لیٹر!'' میرے ذہن میں خیال آیا اور میں نے جلدی جلدی کاغذ کی

تہیں کھولیں' مگر میری توقعات کے برعکس وہاں ایک مختصر سی تحریر تھی' وہ بھی کسی محبت بھرے خط سے بالکل جدا۔

''جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں وہ غلط ہے پلیز میری بات کا یقین کریں میرے پاس نہ کوئی ثبوت ہے نہ کوئی دلیل میں صرف اپنی ماں کی قسم کھا سکتی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔''

بس اتنی سی بات اور تحریر ختم۔ مجھے کچھ ہنسی بھی آئی اور کچھ غصہ بھی آیا۔ اس نے کہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اور میں نے یقین کر لیا تھا۔ اس سادہ دل لڑکی کی ہر بات پر یقین کیا جا سکتا تھا جو ریاکاری سے دور تھی۔

پورے دن وہ گھر نہیں آئی۔ ہر کام اس کے بغیر رکا ہوا تھا۔ رفعت بھابی کو تو قسم تھی کہ وہ کام کو ہاتھ نہیں لگائیں گی' اس بات پر آنٹی بھی بھری بیٹھی تھیں۔ دادی اماں الگ نالاں تھیں۔ ارسلان بھائی پورے گھر میں دھاڑتے پھر رہے تھے۔ ابا جی اپنی چیزوں کی تلاش میں گم تھے' نوکروں کی الگ شامت آئی ہوئی تھی۔ سارا گھر اُلٹ پلٹ گیا تھا۔ وجہ؟ یہ کہ آسیہ بیمار تھی۔

میں نے چاہا کہ جا کر اس کا پتا کر آؤں لیکن پہلے ہی غائبانہ طور پر وہ بیچاری عتاب کا شکار ہو رہی تھی۔ میں اس کے پاس جاتا اور وہ صرف اُٹھ کر ہی بیٹھ جاتی تو سب یہی سمجھتے... کہ وہ ڈرامابازی کر رہی تھی۔ اس لفظ اور خیال کا اظہار ارسلان بھائی بار بار کر رہے تھے۔

''مری تو نہیں ہوگی' بلا کر لاؤ اسے۔ اور جلدی بلاؤ ورنہ میں آتا ہوں اس کا دماغ درست کرنے کے لیے' اس گھر میں سب نوکروں کو حرام خوری کا چسکا ہے۔ ہوتا کچھ نہیں ہے' بہانہ بنا کر بستر پکڑ لیتے ہیں۔ سب ڈرامے بازی ہے۔''

ان کی بات سن کر مجھے غصہ آیا لیکن میں پی گیا۔ آسیہ کو نوکروں کی فہرست میں شامل کرنا مجھے گوارا نہیں تھا لیکن پھر یہ میرا گھر بھی تو نہیں تھا۔

میرے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ اسے میرا انتظار ضرور ہوگا۔ ایسا نہ ہوتا اور اسے میری پروا نہ ہوتی تو وہ کیوں اپنی صفائی پیش کرتی' وہ بھی یقیناً منتظر ہوگی کہ میرا ردعمل جان سکے کہ اس کی وضاحت سے میں مطمئن ہوا یا نہیں۔

رات کے تقریباً اسی پہر میں دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ اس کھیل میں مجھے ایک عجیب سا لطف آ رہا تھا۔

آسیہ کے کمرے کی بتی روشن تھی لیکن کھڑکی بند ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ لگتا تھا سارا شہر سو رہا ہے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ اب مجھے الجھن ہونے لگی۔ اپنی حماقت پر ہنسی بھی آ گئی۔ ادھر آ کر میں کیا بیوقوفیاں کر رہا تھا۔ میرے دوستوں کو خبر ہوتی تو وہ بھی خوب محظوظ ہوتے۔

''چاہے وہ اندر آرام سے سو رہی ہو اور میں صبح تک احمقوں کی طرح یہاں بیٹھا رہوں۔'' میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کی کھڑکی کے پاس چلا آیا۔ ہاتھ اُٹھا کر ہلکی سی دستک دی۔

میں لہروں کا کھیل دیکھنے میں مصروف تھا جب وہ میرے برابر آ بیٹھی' میں نے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔ دل کھل اُٹھا۔

''آسیہ!'' میرے پکارنے کی دیر تھی کہ وہ تو جیسے رونے پر تیار بیٹھی ہوئی تھی فوراً سسکیاں لینے لگی۔

مجھے احساس ہوا کہ اپنی بیوقوفیوں سمیت اسے گڈ بائے کہہ دینا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ وہ میرے دل میں بہت اندر اُتر چکی تھی۔ اس کے آنسو میرے لیے بہت تکلیف دہ تھے۔ اس کے اندر نہ جانے کتنا غبار تھا۔

''روؤ مت آسیہ پلیز' مجھے لگتا ہے کہ تم گھٹن کا شکار ہو' بہت کچھ ہے تمہارے اندر کہنے کے لیے اور تم کہہ نہیں پا رہی ہو۔ سب کچھ بتا دو مجھ سے کہہ دو۔''

میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر اعتبار کرے' سب کچھ بتا دے مجھے' مگر وہاں ہمیشہ کی طرح خاموشی کی مہر تھی۔ بس آنسو تھے جو پہلے سے زیادہ تواتر کے ساتھ بہنے لگے تھے۔

''کل رات میں نے فیصلہ کیا تھا کہ صبح لاہور واپس چلا جاؤں گا۔ اپنا بیگ بھی تیار کر لیا تھا۔ چلتے چلتے والٹ کھول کر دیکھا تو اس میں تمہارا لکھا ہوا رقعہ تھا۔ میں ٹھہر گیا تاکہ تم سے بات کر سکوں۔''

میں منتظر رہا کہ اب وہ کچھ کہے گی لیکن وہاں وہی چپ تھی۔

''جانتی ہو کل رات میں نے کیسے گزاری؟ یہ تصور کر کے تم ارسلان بھائی کا انتظار کر

رہی تھیں میرے لیے اتنا تکلیف دہ تھا کہ تم جان نہیں سکتیں۔ اب بھی کچھ نہیں بولو گی تو میں کل صبح واپس چلا جاؤں گا۔''

کچھ کہنے کے بجائے اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ ہچکیوں سے اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔

''نہیں۔ پلیز نہیں۔ جو آپ نے سمجھا۔ وہ ٹھیک نہیں تھا۔'' اس نے بے اختیاری کے عالم میں کہا۔

میں نے شکر کا کلمہ پڑھا' وہ کچھ تو بولی تھی' اگلا مرحلہ یقیناً اتنا مشکل نہیں تھا۔ ایک مرتبہ وہ بول پڑی تھی' اب آہستہ آہستہ سب کچھ بتا ہی دیتی۔

''تو پھر کیا ٹھیک تھا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بے بس ہو گئی۔ بولی تو دکھ سے اس کی آواز چیخ رہی تھی۔ ''میرے پاس الفاظ نہیں ہیں وہ سب کہہ دینے کے لیے' مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔''

میں خاموش رہا۔ اب اسی کو بولنا تھا۔

اس کے لہجے میں بھی آنسوؤں کی نمی گھلی ہوئی تھی۔ ''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے' میرے پاس اس کے علاوہ کوئی جگہ' کوئی ٹھکانہ بھی نہیں ہے اور اب لگتا ہے کہ یہ چھت بھی میرے سر سے چھن جائے گی۔ میں ان حالات میں یہاں رہ بھی نہیں سکتی اور کہیں جا بھی نہیں سکتی کہ میرا کہیں کوئی بھی نہیں ہے' میں بالکل تنہا ہوں۔

اب تک یہ سب برداشت کرنا آسان تھا۔ میں سب گھر والوں کے احسان تلے دبی ہوئی ہوں اور میں ناشکر گزار بھی نہیں ہوں' زندگی کی آخری سانس تک میں یہ سب برداشت کر سکتی ہوں' اگر اس گھر میں' اس چھت تلے میری عزت محفوظ ہو۔

جو کل آپ نے سمجھا وہ حقیقت نہیں تھی۔ کیا آپ کو میری آواز میں خوف اور دہشت کی وہ لہر بھی محسوس نہیں ہوئی' جس نے اس وقت مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور میں نے سوچا تھا کہ ارسلان بھائی کی ہوس کا نشانہ بننے سے پہلے میں خود کو اس دریا کی لہروں میں گم کر دوں گی۔

جس وقت آپ میرے برابر آ کر بیٹھے تھے اس وقت ارسلان بھائی نے مجھے اپنے پاس بلایا ہوا تھا۔ یہ کام میں مر کر بھی نہیں کر سکتی اور ان کے علاوہ کوئی ہے بھی نہیں' جو یوں

اچانک تنہائی اور تاریکی میں میرے قریب آ جائے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس لمحے وہ سیدھی میرے دل میں اُتر گئی وہ معصوم بھولی بھالی لڑکی یہ زخم دل میں چھپائے ہوئے تھی' میں نے اسے خود سے قریب کر لیا۔ بنا کسی مزاحمت کے وہ میرے کندھے سے لگ کر ..... رونے لگی اور پھر یونہی کتنا کچھ سنا دیا اس نے یہ کہ گھر میں اس کی حیثیت کیا تھی۔ کتنے فقرے اس کا دل چیر دیتے تھے' وہ پھر بھی سہہ جاتی تھی وہ کبھی اپنے مقام کا صحیح تعین نہیں کر سکی تھی۔ ہر وقت اسی کشش و پنج میں مبتلا رہتی تھی کہ کون سی بات کہہ دینی چاہیے' اور کون سا فقرہ خود سے بھی چھپا لینا چاہیے۔ یہ سب تو وہ برداشت کر ہی رہی تھی گو کہ تکلیف ہوتی تھی' لیکن اس میں حوصلہ تھا۔ مگر جب اچانک ارسلان بھائی نے اپنا دوسرا روپ دکھایا تو وہ ذہنی طور پر بالکل ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی۔ ڈر اور خوف نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

یہ سب سن کر مجھے بے حد افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔

''تم اس طرح ان حالوں میں رہ رہی ہو۔ اور ارسلان بھائی ایسی گھٹیا حرکت کر رہے ہیں۔ او گاڈ' مگر تم بالکل فکر مت کرو۔ میں اس سلسلے میں ضرور کچھ کروں گا۔ میں تو بالکل غلط سمجھا تھا کل مجھے تو یہ احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ تم کس قدر خوفزدہ تھیں' بس ایک خیال میرے دل میں گھر کر گیا تھا کہ اتنی رات گئے تم انہی کی منتظر تھیں' تب ہی تو میری جانب دیکھے بغیر تم نے ان کا نام پکارا تھا۔''

وہ روتی رہی آنسو بہاتی رہی۔

''اب میں کیا کروں سہیل؟'' اس نے مدھم سی آواز میں پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ بس اپنے ذہن سے پریشانیاں جھٹک دو۔ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ پھر تمہیں فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ذرا دو ایک دن تک ارسلان بھائی پر نظر رکھنا چاہتا ہوں پھر لاہور جا کر فوراً ہی ممی سے بات کروں گا۔ انہوں نے پہلے ہی کہہ رکھا ہے کہ میں اپنی پسند سے شادی کر سکتا ہوں۔ تھوڑا بہت انہوں نے نالنا چاہا تو بھی منوا لوں گا۔ اکلوتا بیٹا ہوں اور آج تک اپنی ہر بات منواتا آیا ہوں۔ یہاں بھی جب دادی اماں کو انکار نہیں ہوگا تو کسی کو انکار نہیں ہوگا۔ اس لیے اس طرف سے بھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

اس کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ یوں جیسے سر پر پڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔

میں نے اپنے گلے میں پڑی سونے کی بھاری چین اُتار کر اس کے گلے میں ڈال دی۔

''یہ میرے وعدے کی نشانی اور میری محبت کی گواہی ہے۔ مجھ پر اعتبار کرنا۔''

جس وقت میں نے یہ الفاظ کہے تھے' اس وقت ان پر مجھے سو فیصد یقین تھا۔ میں یہی سب سوچ رہا تھا اور میں نے اس سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں بھی سو گیا۔ صبح آسیہ کے آنے سے آنکھ کھلی چائے کی پیالی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اس نے پکارا۔

''اُٹھ جائیں' بہت دیر ہو چکی ہے۔''

میں نے آنکھوں میں نیند لیے اس کی جانب دیکھا۔ وہ مسکرا کر جلدی سے باہر نکل گئی اور میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

اس روز چائے بھی ہمیشہ سے زیادہ مزیدار تھی۔ شاید اس لیے کہ اس میں آسیہ کی چوڑیوں کی کھنک بھی شامل ہو گئی تھی۔ میں باہر نکلا تو اس کے ہونٹوں پر پھیلی آسودہ سی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ وہ سارے گھر میں تتلی کی طرح اُڑتی پھر رہی تھی اور میں اس کے قریب ہی تھا۔

لیکن جونہی ارسلان بھائی نے گھر میں قدم رکھا وہ پھر خود سے خوفزدہ ہو گئی۔ میں ان دونوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ارسلان بھائی نے اس پر بھرپور نگاہ ڈالی وہ کنی کترا کر گیلری سے برآمدے میں چلی آئی۔ اس کی رنگت زرد ہونے لگی تھی۔

''ریلیکس آسیہ۔ یہ اُلو کا پٹھا کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر تم خوفزدہ ہونا چھوڑ دو تو'' میں نے اسے پُراعتماد انداز میں تسلی دی۔

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

''اب جاؤ وہیں بیٹھ کر پڑھو' اور گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں نہانے جا رہا ہوں ابھی تھوڑی دیر میں نکلتا ہوں۔''

جب میں برآمدے میں پہنچا تو آسیہ کی کتابیں اور بستہ سیڑھیوں پر پڑا تھا اور وہ خود وہاں نہیں تھی۔ ارسلان بھائی اس کی چیزوں کے قریب سے تیزی کے ساتھ اندر جا

رہے تھے' انہیں نظر انداز کر کے تولیہ صحن میں تار پر ڈال کر میں سیڑھی پر آ بیٹھا۔

''پروین! آسیہ کہاں ہے؟'' میں نے باورچی خانے سے برآمدے میں نکلتی پروین سے پوچھا۔

''چھوٹے صاحب عرفان کی نانی اماں کے گھر جا رہے ہیں' آسیہ عرفان کو تیار کروا رہی ہے۔'' اس نے بتایا۔

اندر کسی کمرے سے ارسلان بھائی کے گرجنے برسنے کی آواز آنے لگی۔

اتنے میں ہی وہ میرے برابر آ بیٹھی۔ اس کے پیچھے پیچھے بڑی اماں بھی باہر برآمدے میں نکل آئیں اور تخت پر بیٹھ گئیں۔

''یہ تم سیڑھی پر بیٹھ کر کیوں پڑھتی ہو آج بتا ہی دو۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا بتاؤں؟ اتنی سی بات ہے کہ یہاں بیٹھ کر پڑھ بھی لیتی ہوں اور کوئی کسی کام کے لیے آواز دیتا ہے تو دقت بھی نہیں ہوتی۔ اپنے کمرے میں مجھے بس صحن کی آواز آتی ہے' اندر کمروں سے کوئی پکارے تو پتا نہیں چلتا بس اس لیے۔''

''دادی اماں! یہ اتنے کام کیوں کرتی ہے' امی کہاں ہوتی ہے؟'' میں نے کہا۔

اندر ارسلان بھائی اپنی گھڑی اور ہزار روپوں کی گم شدگی کا رونا رو رہے تھے۔ آنٹی اور رفعت بھابی نوکروں کے ساتھ مل کر دونوں چیزیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں نے اندر سے آتی آوازوں کو نظر انداز کر دیا اور دادی اماں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''بیٹا! گھر کے کام سب مل جل کر کرتے ہیں اور اچھی بیٹیاں تو گھر کے لیے جان مار دیتی ہیں۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔

''لیکن جان مارنے کے لیے کچھ جان تو ہو' دیکھی ہے آپ نے اس کی حالت' پھونک مارو تو اُڑ جائے۔'' میں ہنسا۔

''اب ایسا بھی نہیں ہے' میں بہت اسمارٹ ہوں' انسان کو موٹا تو بہرحال نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ اِترائی۔

اور اس میں شک بھی نہیں تھا کہ وہ بے حد اسمارٹ تھی۔ ایسا خوبصورت فِگر کم ہی لڑکیوں کا ہوا کرتا ہے۔

قبل اس کے کہ میں کچھ اور کہتا ارسلان بھائی بھی برآمدے میں پہنچ گئے۔

''آسیہ! تم نے دیکھی ہے میری گھڑی' ساتھ میں ہزار روپے بھی رکھے ہوئے تھے؟'' انہوں نے پوچھا۔

میں بغور دونوں کا جائزہ لینے لگا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی گڑبڑ کرنے والے تھے کیا؟ یہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ بس ایک چھٹی حس تھی جو اشارہ سا دے رہی تھی۔

دونوں چیزیں گئیں کہاں۔ ارسلان بھائی واضح طور پر آسیہ پر شک کا اظہار کر رہے تھے اور اس کا عالم یہ تھا کہ ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور وہ بری طرح سے رو رہی تھی۔

اب اس امر میں شک نہیں تھا کہ ارسلان بھائی کا مقصد ہی آسیہ پر چوری کا الزام لگانا تھا۔ بات بڑھ رہی تھی۔ میرے لیے بھی چپ رہنا ممکن نہیں تھا اور میں ہی کیا سبھی کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ بالآخر جب ارسلان بھائی نے آسیہ کے بیگ اور کمرے کی تلاشی کی بات کی تو مجھ سے بالکل ہی نہ رہا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ انہی میں سے کسی جگہ میں انہوں نے خود دونوں چیزیں چھپائی ہوں گی' مقصد صرف آسیہ کو اس رات اپنے پاس نہ آنے کا مزا چکھانا تھا۔ اس کے پاس سے چوری کی چیزیں ملتیں تو گھر والوں کی نگاہ میں بھی وہ اپنا اعتبار کھو دیتی۔ یہ دونوں باتیں ہی مجھے گوارا نہیں تھیں۔

''کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا اس بیگ کو نہ کمرے کی تلاشی لی جائے گی۔ یہ کیا طریقہ ہے؟ سارا گھر آسیہ کے سامنے کھلا ہوتا ہے کیا کبھی پہلے اس نے چاول کا ایک دانہ یا جھاڑو کا ایک تنکا تک بھی اُٹھایا ہے؟ یہ جو آپ کر رہے ہیں' انتہائی غلط بات ہے۔ اور ارسلان بھائی آپ کی گھڑی یہاں سے نہیں ملی تو اور کس کس کی تلاشی لیں گے گھر میں؟ کیا دادی اماں' آنٹی اور انکل کی بھی؟ نہیں' اس لیے کہ وہ آپ کے اپنے ہیں اور آسیہ کی پکڑ اس کے بے داغ کردار کے باوجود بھی اس لیے ہو رہی ہے کیونکہ وہ یہاں کسی کی کچھ نہیں لگتی۔''

''اگر اس نے کچھ نہیں کیا تو ڈر کس بات کا ہے؟ میں کس کی تلاشی لیتا ہوں اور کس کی نہیں یہ میری مرضی ہے۔ ایک ہزار روپے پر میں لعنت بھیجتا ہوں لیکن ڈیڑھ لاکھ کی گھڑی ایسی چیز نہیں ہے' جس پر میں خاموش رہ سکوں۔'' انہیں میرے درمیان میں کودنے پر سخت غصہ تھا۔

"آپ لے لیں تلاشی، مجھے کسی بات کا خوف نہیں ہے، میں آپ کے بیڈروم میں صبح سے نہیں گئی۔" آسیہ نے روتے ہوئے کہا۔

اور میرا اپنا سر پیٹنے کو دل چاہنے لگا۔ وہ حد سے زیادہ بیوقوف تھی جو اب تک یہ بھی سمجھ نہیں پائی تھی کہ ارسلان بھائی کا مقصد کیا تھا۔ جب میں برآمدے میں آیا تھا اس وقت وہ آسیہ کی کتابوں کے قریب ہی کھڑے تھے کمرا بڑا بھی تھا اور دور بھی' مجھے سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ پیسے اور گھڑی انہوں نے اس کے بیگ میں ہی چھپائے تھے وہ اپنی بیوقوفی یا معصومیت میں انہیں تلاشی لینے کی اجازت دے چکی تھی لیکن میں اب بھی انہیں روکنا چاہتا تھا اور کسی صورت میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کا مقصد پورا ہوا۔

"دادی اماں! آپ جانتی ہیں آسیہ کو' کیا یہ ایسی حرکت کر سکتی ہے؟ آپ سب جانتے ہیں اسے آپ لوگوں نے ہی...... اپنے ہاتھوں میں پالا ہے کیا ایسے میں یہ بے اعتباری مناسب ہے؟ عین ممکن ہے کہ کسی نے شرارت میں یا۔" میں نے ارسلان بھائی کی طرف دیکھا۔ "کسی اور گھٹیا مقصد کو پورا کرنے کے لیے خود یہ چیزیں اس کے بیگ میں ڈال دی ہوں یا کمرے میں چھپا دی ہوں۔ بات کو اس حد تک نہ بڑھائیں آپ لوگ!"

میرے کسی گھٹیا مقصد کو پورا کرنے کے لیے کہنے کی دیر تھی کہ ارسلان بھائی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ انہوں نے ایسے میری جانب دیکھا جیسے کچا ہی چبا جائیں گے اور پھر اس سے قبل کہ میں سمجھ سکتا انہوں نے آسیہ کا اسکول بیگ اٹھا کر ایک لمحے میں ہی الٹا دیا۔ کتابیں کاپیاں' کاغذوں کے چند ٹکڑے اور کچھ ہیئر بینڈز تو فرش پر گرے ہی لیکن میرے بدترین خدشات بھی اس وقت درست ثابت ہو گئے' جب ان تمام چیزوں کے درمیان سو روپے کے کچھ نوٹ اور ارسلان بھائی کی گھڑی بھی گر پڑی۔

ایک لمحے کے لیے تو کوئی کچھ بول ہی نہیں سکا۔ غالباً کسی کے بھی وہم و گمان میں نہیں تھا کہ گمشدہ چیزیں آسیہ کے بیگ سے ملیں گی' خود آسیہ بے یقینی کے ساتھ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان چیزوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ارسلان بھائی نے جھک کر اپنی گھڑی اُٹھا لی لیکن سو روپے کے نوٹ وہیں فرش پر بکھرے رہنے دیئے۔

"یہ ہے صلہ اسے پالنے پوسنے کا۔" انہوں نے زہریلے انداز میں کہا پھر رفعت

بھابی سے مخاطب ہوئے۔ "چلو رفعت دیر ہو رہی ہے۔"

"میں تو یوں نہیں چھوڑوں گی یہ معاملہ' لاکھوں کے میرے زیورات پڑے رہتے ہیں گھر میں' میری تو ایک ایک انگوٹھی اس قدر قیمتی ہے۔" وہ بولیں۔

"تو کیا کرو گی' پھانسی پر لٹکاؤ گی معصوم بچی کو؟ میں جانتی ہوں آسیہ ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔" دادی اماں غصے سے بولیں۔

"میرے ابا کی بہت حلال کی کمائی ہے' تب ہی یہ گھڑی مل گئی ورنہ اس نے تو پار کر ہی لی تھی' ماں باپ بھی ایسے ہی چور اچکے ہوں گے۔ اب آپ مانیں یا نہ مانیں چوری کی چیزیں اسی کے بستے سے ملی ہیں۔ مجھے تو اپنے زیور کی فکر ستا رہی ہے۔"

"تم اپنے زیور بینک میں رکھوا دو یا میکے لے جاؤ۔" آنٹی کو غصہ بہت تھا لیکن انہوں نے ضبط کیا ہوا تھا۔

"اب تو یہی کروں گی میں اس گھر میں چوری کروانے کے لیے رکھنے سے تو رہی۔ دیکھ لینا آج چوری کی ہے کل اور کرتوت کھلیں گے' تب پوچھوں گی۔"

انہیں نہ جانے کیوں آسیہ سے اس قدر بیر تھا۔ پچھلے چند دنوں سے یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ آسیہ کا حال برا تھا۔ کنپٹیوں کو انگلیوں سے دبائے ہوئے اس نے ستون کا سہارا لینا چاہا لیکن ڈگمگا گئی۔ لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ میں نہیں تھی' میں نے اسے فوراً تھام نہ لیا ہوتا تو وہ ضرور گر پڑتی دادی اماں تیزی سے آگے بڑھیں۔

"آسیہ آسیہ ہوش کر۔" انہوں نے اسے جھنجھوڑا۔

"بڑی اماں' میں نے کچھ نہیں کیا' کچھ نہیں چرایا۔ مجھے میری ماں کی قسم۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس کے لفظ' اس کا لہجہ کسی سنگدل سے سنگدل شخص کا کلیجہ چیرنے کو بھی کافی تھے' آنٹی اور دادی اماں اسے اندر کمرے میں لے گئیں سب ہی اپنی اپنی جگہ واپس چلے گئے' ارسلان بھائی اور رفعت بھابی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے' میرا دل چاہ رہا تھا کہ پیچھے سے جا کر انہیں پکڑ لوں اور ان کا وہ حشر کروں کہ ہمیشہ یاد رکھیں۔ افسوس کہ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

آسیہ کی محبت لمحہ بہ لمحہ میرے دل میں بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے آنسو جیسے میرے

دل پر گرے تھے۔ میں دادی اماں کے کمرے میں جا کر اسے تسلی دینا چاہتا تھا اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ بے قصور تھی اور اسے کسی نے بھی قصوروار نہیں سمجھا تھا لیکن اس واقعے سے خود میرا دل بہت برا ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا اور اب جب موقع آیا تھا تو میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ ارسلان بھائی پورا نہیں تو اپنا آدھا مقصد ضرور حاصل کر چکے تھے۔

میں اُٹھ کر اندر لاؤنج میں چلا آیا' انکل ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

''انکل! کیا آپ کے خیال میں آسیہ یہ حرکت کر سکتی ہے؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو گی' اس کا بستہ تو ہر روز یونہی کھلا پڑا ہوتا ہے۔ کتنے کام کرنے کے لیے وہ یونہی سب کچھ کھلا چھوڑ کر اٹھ جاتی ہے' کسی نے شرارت کر دی ہو گی اور جب دیکھا کہ بات بگڑ رہی ہے تو گھبرا کر اپنی شرارت کا اعتراف نہیں کیا ہو گا ورنہ آسیہ ایسی بچی نہیں ہے۔ دن میں دس مرتبہ وہ یہ سیف کھولتی ہے' زیوروں والی الماری سے تمہاری آنٹی کو وہی زیور نکال کر دیتی ہے۔ انسان کے کردار کا مثبت یا منفی پہلو اپنے گھر والوں سے اتنے برس چھپا نہیں رہتا۔ اسے کچھ چرانا ہوتا تو وہ پہلے بھی چرا سکتی تھی۔'' وہ بولے۔

''اور پھر گھڑی چرانا اس کے لیے بیکار تھا۔'' میں نے بات آگے بڑھائی۔ ''کہاں لے کر جاتی وہ گھڑی کو؟ جب سیف اس کی دسترس میں ہے' زیور وہی رکھتی نکالتی تھی تو پھر اسے گھڑی چرانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ بھی ایسی جگہ سے جہاں سے چند منٹوں میں اس کی چوری کھل سکتی تھی۔ جو کچھ ارسلان بھائی نے کیا وہ انتہائی غلط تھا۔''

''ارسلان تو غصے میں نہ کچھ دیکھتا ہے اور نہ سوچتا ہے۔'' انکل کے انداز میں بدمزگی تھی۔

''اور آسیہ کا رو رو کر برا حال ہے۔ اسے یہی خیال ہو گا کہ گھڑی اور روپے اس کے بیگ سے ملے ہیں سو بھی اسے چور سمجھیں گے' پلیز انکل آپ چل کر اس سے کہہ دیں کہ آپ کا یہ خیال نہیں ہے۔'' میں نے ان سے کہا۔

اس میں آسیہ کا بھی فائدہ تھا اور میرا بھی' آسیہ کا اعتماد بحال ہو جاتا اور میرا اسے دلاسا دینے کا راستہ بھی کھل جاتا۔

انکل اُٹھ کر وہاں گئے تو میں بھی ان کے ساتھ چلا آیا۔ کتنی تسلی دی اسے لیکن اس کے آنسو ہی نہیں تھمتے تھے۔ بڑی ہی مشکل سے وہ چپ ہوئی۔

رات گہری ہوئی تو میں اس سے ملنے کے لیے دریا کنارے پر پہنچ گیا۔ اس کے کمرے کی بتی روشن تھی لیکن کھڑکی بند تھی۔

''اس کابک نما گھٹن زدہ کمرے کی کھڑکی آخر کیوں بند رکھتی ہے آسیہ۔'' جانتے ہوئے بھی کہ وہ کھڑکی کیوں بند رکھتی تھی مجھے الجھن ہونے لگی۔

تھوڑی دیر میں باہر ہی اس کا انتظار کرتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ باہر ضرور جھانکے گی یہ دیکھنے کے لیے کہ میں وہاں تھا یا نہیں۔ میرے نزدیک یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ میری منتظر نہ ہوتی۔ جب کچھ دیر گزر گئی تو مجھے بے چینی ہونے لگی۔ آگے بڑھ کر کھڑکی پر میں نے ہلکی سی دستک دی۔

اندر سناٹا چھایا رہا۔

کچھ وقفے کے بعد دوسری دستک دی۔ اندر ویسا ہی سناٹا تھا۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی' وہ کیوں نہیں کھڑکی کھول رہی تھی' خیریت تو تھی؟ تیسری دستک قدرے بلند تھی۔ ابھی دستک ختم ہوئی تھی کہ اندر سے اس کے رونے کی آواز آنے لگی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔ آواز بھی بلند تھی۔ اور رات کے سناٹے میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

میرے دل میں کتنے وہم' کتنے اندیشے گھر کرنے لگے۔

''آسیہ میں ہوں سہیل' پلیز کھڑکی کھولو۔'' میں نے کہا۔

چند لمحے انتظار کیا اور ایک مرتبہ پھر پکارا۔ ''آسیہ!''

چوڑیاں کھنکیں اور کھڑکی کے کواڑ کھل گئے۔ باہر سے نرم ہوا کا جھونکا آیا اور اس کے خوبصورت سنہری مائل بھورے لمبے کھلے بال بکھر گئے۔

میں اندر آیا تو وہ مجھ سے لپٹ کر پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ رو دی۔

''سہیل پلیز مجھے بچا لو' پلیز مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے' وہ مجھے تباہ و برباد کر دیں گے' میں تو اتنی بدنصیب ہوں کہ یہاں سے کہیں اور جا بھی نہیں سکتی۔ میرا کوئی نہیں ہے اس دنیا میں۔

تمہیں پتا ہے یہ سب ارسلان بھائی نے کیا تھا کیونکہ میں ان کے کہنے کے باوجود

بھی ان کے پاس نہیں گئی تھی۔ آج انہوں نے مجھے جتلا بھی دیا کہ یہ صرف چھوٹا سا نمونہ تھا۔ میں کب تک بچتی رہوں گی‘ آج نہیں تو کل وہ اپنی خواہش ضرور پوری کریں گے‘ پھر کیا ہوگا؟‘‘ وہ اور زور سے رونے لگی۔

میں اسے بستر تک لے آیا۔ اس کی حالت بہت بری تھی‘ میرے لیے اسے اس حال میں دیکھنا بہت مشکل تھا۔

’’بیٹھ جاؤ‘ رونے سے بھی کبھی کچھ حاصل ہوا ہے۔‘‘ میں نے اس سے کہا۔

مگر آنسو اس کے بس میں نہیں تھے! میں اسے چپ کرانے کی کوشش کرتا رہا۔ تھوڑی دیر میں مجھے گھبراہٹ ہونے لگی‘ اس کے جسم کی گرمی اور اس کے بالوں کی مہک مجھے دیوانہ بنا رہی تھی‘ خود پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے سے علیحدہ کرنا چاہا لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ میں اس کی نفسیاتی کیفیت سے واقف تھا۔ اسے ایک سہارے کی ضرورت تھی اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے سہارا دوں گا۔

میں اس طرح نہیں کرنا چاہتا تھا‘ میں اس کی عزت کرتا تھا اس سے محبت کرتا تھا پھر بھی میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔

جب میں نے اس کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے کر کہا۔

’’تم فکر مت کرنا آسیہ! میں چند دنوں میں ممی پاپا کو لے آؤں گا اور اگر وہ نہ آئے تو بھی میں خود ہی چلا آؤں گا۔ ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنانے کو دیکھو گھبرانا مت‘ میں ضرور واپس آؤں گا۔‘‘

تو مجھے اپنے الفاظ کی صداقت پر یقین تھا۔ اپنے جذبوں پر بھروسا تھا۔ اپنی محبت پر ایمان تھا۔

یوں لگتا تھا دو ہاتھ لگے
اور ناؤ پورم پار لگی۔

مگر پھر بہت کچھ تبدیل ہوگیا۔ میں گھر پہنچا تو ممی نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

’’شکر ہے آئے ہو‘ اب جاؤ اور تیار ہو جاؤ‘ ڈنر پر کچھ مہمان آرہے ہیں اور میں کتنی دعائیں مانگ رہی تھی کہ آج رات سے پہلے تم آجاؤ۔‘‘

’’ممی میں تھکا ہوا ہوں‘ اس وقت صرف سونے کو دل چاہ رہا ہے۔‘‘ میں نے جوتے

اتارتے ہوئے کہا۔

’’کوئی بہانہ نہیں چلے گا‘ اتنے دن تم نے اپنی چلائی ہے‘ ابھی میری سنو گے۔‘‘

اسی وقت گڑیا میرے برابر بیٹھ گئی۔ ’’ایسے بھی کیا تھکے ہوئے ہو‘ ہوائی جہاز پر آرہے ہو کراچی سے یا گدھا گاڑی پر؟ اٹھو مجھے لبرٹی چلنا ہے۔‘‘

’’تمہیں لبرٹی جانا ہے تو جاؤ میری جان بخشو!‘‘

’’اتنے دن بخشے رکھی ہے تمہیں پتا ہے ناں کہ شام کو ممی اکیلے بازار نہیں جانے دیتیں‘ بہت دعائیں دوں گی تمہیں اگر اس وقت ساتھ دے دو میں جنریشن میں ایک سوٹ دیکھ کر آئی تھی وہ خریدنا ہے۔‘‘

’’ابھی؟‘‘

’’ابھی اور اسی وقت‘ بہت ضروری ہے ڈنر کے لیے میرے پاس ایک بھی ڈھنگ کا سوٹ نہیں ہے۔ تم تھکے ہوئے ہو تو میں ڈرائیو کر لوں گی بس تم ساتھ چلے چلو۔‘‘

’’گڑیا اس وقت تو بالکل دل نہیں چاہ رہا‘ اتنے کپڑے ہیں تمہارے پاس کوئی ایک نکال لو۔‘‘

’’تم کراچی سے بالکل بور ہو کر آئے ہو‘ گئے بھی خالی ہاتھ تھے واپس بھی خالی ہاتھ آئے ہو‘ اتنی لمبی لسٹ دی تھی کہ وہاں سے میرے لیے کیا کیا لانا ہے‘ تنکا تک نہیں لائے اپنے ساتھ‘ وہاں بھی یہی بوریت پھیلا رکھی ہوگی تم نے‘ اس وقت کچھ خرید لائے ہوتے میرے لیے تو کیا ضرورت تھی مجھے لبرٹی جانے کی۔‘‘

مجھے احساس ہوا کہ میں ہولے ہولے چلتی زندگی سے نکل کر پھر پرانی زندگی میں آ گیا ہوں‘ جہاں زندگی میں تیزی نہ ہو تو خود ہی مصروفیات گھڑ کر اسے تیز بنا دیا جاتا ہے۔

’’تم سے تو کوئی بات کرنی ہی فضول ہے‘ کوئی گرل فرینڈ تمہیں اپنا کام دے دے سر آنکھوں پر کرتے ہو۔ میں کوئی فرمائش کر دوں تو ایک لمحے میں بہانہ گھڑ لیتے ہو۔‘‘ گڑیا نے مجھے خاموش دیکھ کر منہ پھلا لیا۔

’’لے جاؤ سہیل‘ میں دیکھتی ہوں کہ تم گڑیا کی بات کبھی نہیں سنتے بہن ہے تمہاری بیٹا!‘‘ ممی نے مداخلت کی۔

"اچھا! اٹھو! مگر ڈرائیو خود کرنا۔" میں کھڑا ہو گیا۔

وہاں شام کتنے دھیمے دھیمے گزرتی تھی' یہاں لمحوں میں بیت گئی' گڑیا کو اپنے لیے ایک ایسا سوٹ لینا تھا جو پہلے سے اس نے دیکھ رکھا تھا۔ اس کے باوجود جب ہم واپس آئے تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کچھ گڑیا کو اپنے دس اور کام یاد آ گئے اور کچھ مجھے بھی بہت دن بعد یہ رونق دیکھ کر لطف آ رہا تھا۔ لبرٹی کا چکر لگے اور کچھ دوست نہ ملیں یہ بھی ناممکن۔ اور باہر نکل کر میں کچھ فلمیں نہ لاؤں دیکھنے کے لیے یہ اس سے بھی زیادہ ناممکن یوں بھی اتنے دنوں سے کوئی اچھی فلم نہیں دیکھی تھی کہ جہلم میں اپنے بیڈروم میں ٹی وی نہیں تھا۔

واپس گھر آنے تک میں جہلم میں گزاری زندگی کے سحر سے نکل چکا تھا اور ڈنر کے لیے تیار ہوتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیا فضول قسم کا وقت گزار رہے ہیں وہاں کے لوگ زندگی کتنی ڈل اور بور ہے وہاں نہ کوئی تیزی نہ مصروفیت جو انسان کو ہر وقت دوڑائے رکھے۔

گھر سے نکلو اور دو قدم پر بازار' وہ بھی اتنا چھوٹا سا کہ اچھی طرح سے گھومنے پھرنے کے باوجود آدھ گھنٹے میں باآسانی گھر واپس لوٹا جا سکتا ہے۔ اور گھر میں ٹی وی کے علاوہ کوئی تفریح نہیں۔ اور ہمارا ٹی وی انتہائی بور پتا نہیں کیسے یوں وقت گزار دیتے ہیں وہاں کے لوگ۔

اور اس وقت میں یہ بھول گیا تھا کہ میں بھی چند دن پہلے تک وہاں کتنا خوش اور مطمئن تھا۔ وہی زندگی اس زندگی کے مقابلے میں مجھے کتنی بہتر لگی تھی' پُر سکون مدھم مدھم سی جہاں انسان ابھی انسان تھے مشین نہیں بنے تھے' وہ وقت زیادہ دور نہیں تھا جب مشینی زندگی کا وائرس وہاں بھی پھیل جاتا' وہ لوگ بھی خود سے ہر چیز سے غیر مطمئن ہو جاتے' جب ان کے پاس دوسروں کے لیے تو کیا خود اپنے لیے بھی وقت نہ بچتا کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں اپنا سکون برباد کرتا ہے' لیکن ابھی میں نے وہاں کے لوگوں کو پُر سکون دیکھا تھا۔ مطمئن دیکھا تھا..... شاید دو سال شاید چار سال شاید دس سال یا پھر اس سے کچھ زیادہ وہ لوگ بھی یقیناً اس وائرس کی زد میں آ جاتے' ایسا وقت تو آنا ہی ہے جب زمین کے سینے پر انسانوں کی صورت والی مشینیں چلیں پھریں گی' غیر مطمئن' بے چین بے قرار کسی چیز کی تلاش میں' کس چیز کی؟ یہ انہیں بھی خبر نہیں ہو گی۔

لیکن مجھ میں برسوں پہلے یہ وائرس سرایت کر چکا تھا۔ خواب کی سی وہ کیفیت تھوڑی ہی

دیر میں ٹوٹ گئی تھی۔

نہا دھو کر اور سیاہ ڈنر سوٹ پہن کر جب میں ڈرائننگ روم میں پہنچا تو مہمان آ چکے تھے مختصر سی فیملی تھی۔ انکل آنٹی ان کا دس سالہ بیٹا فیضان اور سارہ۔

ان کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ گڑیا محض مروتاً سارہ کو کمپنی دے رہی تھی۔ وہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے دوستی کے لیے موزوں نہیں ہو سکتی تھیں۔ گڑیا میری بہن تھی مگر مجھے یہ کہنے میں کبھی عار محسوس نہیں ہوئی کہ وہ سطحی سی لڑکی تھی' جبکہ سارہ بہت مختلف تھی۔ گڑیا کی اپنی دنیا تھی۔ اور سارہ کی اپنی' گڑیا ملز اینڈ بون کے افسانوں میں رہتی تھی' جبکہ سارہ زندگی کے سنجیدہ پہلوؤں کی طرف توجہ دیتی تھی۔

گڑیا اور سارہ کی ذہنی دوری نے ہی اس ڈنر میں مجھے سارہ کے قریب کر دیا۔ کھانا کھا کر ہم باہر لان میں نکل آئے۔

سارہ میری ہم عمر تھی لیکن ہر لحاظ سے مجھ سے کہیں بہتر تھی' بچپن ہی میں وہ برطانیہ چلی گئی تھی' وہیں پڑھی پلی بڑھی اور آج کل پاکستان میں اقوام متحدہ کے دیہی ترقیاتی پروگرام کے ساتھ منسلک تھی۔ یہاں کی عام لڑکیوں سے وہ قطعی مختلف تھی بلکہ شاید وہاں کی عام لڑکیوں سے بھی بالکل مختلف تھی۔ اس کی باتیں بیکار نہیں ہوتی تھیں' زیور کپڑے اور شاپنگ کے گرد گھومنے والی' اس کے پاس بے شمار اس سے کہیں بہتر موضوع گفتگو کے لیے تھے۔

ہم لان میں ٹہلنے لگے۔ اس بات کا خیال کر کے کہ وہ ہمیشہ برطانیہ میں رہی تھی' میں اس سے انگریزی میں گفتگو کر رہا تھا۔

"انگریزی خوبصورت زبان ہے۔" اس نے اچانک اردو میں کہنا شروع کیا۔ "لیکن اردو بھی کم خوبصورت نہیں ہے۔ میں یہاں عام دیہات کے علاوہ جہاں بھی گئی ہوں میں نے محسوس کیا ہے کہ زیادہ تر لوگ اپنی زبان سے شرمندہ ہیں۔ اردو بولنا پسند نہیں کرتے۔ اردو لکھنا پسند نہیں کرتے اردو پڑھنا پسند نہیں کرتے۔ میں سمجھ نہیں سکتی کہ اس کی کیا وجہ ہے؟"

اس کی اردو اچھی تھی لیکن لہجہ انگریزی کی آمیزش لیے ہوئے تھا۔

میرے پاس اس کی بات کا کوئی اچھا جواب نہیں تھا۔ "دراصل۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کچھ ایسا سیٹ اَپ ہے کہ انگریزی کی عادت ہو گئی ہے۔ گفتگو کرتے ہوئے آسانی محسوس ہوتی ہے۔"

وہ مسکرا دی۔ ''افسوس یہ ہے کہ یہاں بہت کم انگریزی بولنے والوں کو اچھی انگریزی آتی ہے پھر بھی وہ بولنے پر مُصر ہیں اور اس سے بھی زیادہ اس بات کا افسوس ہے کہ یہاں اکثریت کی اردو بھی اچھی نہیں۔ کوئی ایک زبان تو ایسی ہونی چاہیے جس میں باآسانی اپنا مطمع نظر بیان کیا جا سکے' یہاں لوگ اپنی بات کسی بھی زبان میں اچھی طرح بیان نہیں کر سکتے۔ اور یہ میں دیہاتوں کی بات نہیں کر رہی' تعلیم یافتہ افراد کی بات کر رہی ہوں۔''

میں نے موضوع گفتگو تبدیل کرنے کی کوشش کی کیونکہ اب سے پہلے میرا خیال تھا کہ وہ صرف انگریزی اور فرانسیسی ہی روانی سے بول سکتی تھی' اب اسے اردو بھی روانی سے بولتے سنا اور پھر یہ خیالات سنے تو بہتری اسی میں دیکھی کہ کسی اور موضوع پر بات کر لی جائے۔

وہ چلی گئی تب بھی اس کا سحر قائم رہا۔ میرا واسطہ زیادہ تر گڑیا جیسی لڑکیوں سے پڑتا رہا تھا۔ اور سارہ جیسی کوئی ملی تھی تو بھی وہ کوئی لڑکی نہیں' خاتون تھی۔ اپنے اپنے شعبوں میں نمایاں بہت سی خواتین سے میری ملاقات رہتی تھی' سارہ البتہ ایسی لڑکیوں میں پہلی ہی تھی' میں رات کو دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

لاہور آئے مجھے چار دن ہو چکے تھے لیکن میں گھر میں آسیہ کے متعلق بات نہیں کر سکا تھا۔ ہر ایک مصروف تھا کبھی میرے پاس وقت نہیں ہوتا تھا اور کبھی ممی کے پاس لیکن ایک عجیب بات بھی ہوئی تھی۔ آسیہ کا خیال مجھے آتا رہتا تھا لیکن اس میں کوئی جوش یا شدت نہیں تھی۔ مجھے اس کی زندگی سے کوئی ایسی دلچسپی نہیں رہی تھی' جیسی جہلم میں رہتے ہوئے تھی۔ میں سوچتا تھا کہ کہتے ہیں۔ جدائی محبت میں اضافہ کرتی ہے۔ جبکہ یہاں حال اُلٹ تھا۔ وہ آنکھ سے دور ہوئی تھی تو دل بھی اس کے لیے پہلے کی طرح نہیں مچلتا تھا۔

میری کیفیت عجیب سی تھی' ممی سے بات کروں یا نہ کروں؟ کیا وہ اتنی اہم ہے کہ اس کے لیے سب کچھ تج دوں؟ میں سوچتا رہا اور میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ ہوتا۔

بہر حال ممی سے بات کرنے کا میں نے ارادہ کر لیا۔ اس شام اتفاق سے وہ گھر پر ہی تھیں میں ان کے پاس لان میں چلا گیا۔

''تم اسکوائش کھیلنے نہیں گئے؟'' انہوں نے مجھے گھر پر دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں' دراصل مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''ہوں۔''

''میں نے آپ کو بتانا تھا۔'' میں لان چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں پچھلے دنوں کراچی نہیں گیا تھا۔''

''کراچی نہیں گئے تھے؟'' انہیں تعجب ہوا۔ ''کراچی نہیں گئے تھے تو پھر کہاں گئے تھے؟''

''میں جہلم گیا تھا!''

ممی کو جیسے کرنٹ سا لگا تھا۔ ''جہلم گئے تھے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ جس جگہ کو میں نے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ قسم اُٹھائی تھی کہ وہاں کبھی نہیں جاؤں گی' میرے بچے وہاں کبھی نہیں جائیں گے' تم وہاں گئے؟ اور وہ بھی مجھ سے کچھ کہے مجھے بتائے بغیر۔''

''سوری ممی لیکن آپ کو بتاتا تو وہاں جا نہیں سکتا تھا اور میں زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ وہاں ضرور جانا چاہتا تھا۔''

''تمہیں معلوم ہے اس گھر میں میرے ساتھ کیا سلوک ہوتا رہا تھا؟'' ممی کو غصہ آ گیا۔

''نہیں' لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ کوئی بات بھی بہت بڑی نہیں ہو سکتی۔ اتنے دن میں اسی گھر میں رہ کر آیا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہاں کس نوعیت کے جھگڑے ہوا کرتے ہیں۔ آپ کا مسئلہ ساس بہو کے جھگڑوں سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''بس چند دن میں میرا بیٹا چھین لیا مجھ سے؟ اسی لیے میں تمہیں اس بڑھیا کے پاس نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔''

''ممی انہوں نے کچھ نہیں چھینا آپ سے' دیکھ لیں میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا ہوں۔''

''تم اگر جانتے کہ میں نے وہاں کتنی اذیت میں دن بتائے ہیں تو کبھی وہاں کا رخ بھی نہ کرتے' پہلے اچھے گھروں کی لڑکیاں بیاہ لاتے ہیں اور پھر انہیں اپنے گھروں میں دفن کر دیتے ہیں یہ لوگ' تمہاری دادی یہ چاہتی تھی کہ میں ساری عمر تمہارے پاپا سے دور اس کی خدمت کرتے ہوئے گزار دوں۔ وہ آج بھی یہاں آ جائے میں اس کی دیکھ بھال کروں گی لیکن میں کیوں خود شوہر سے دور رہتی یا اپنے بچوں کو باپ سے الگ رکھتی؟

یہی نہیں تمہاری دادی کی پوری کوشش تھی کہ میرے بچے بھی ذہنی طور پر مجھ سے دور ہو جائیں میں جو کہتی تھی وہ بڑھیا اس سے اُلٹ کرتی تھی۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوا کرتی

ہے۔ اتنی ذہنی اذیت میں نے کبھی نہیں بھگتی۔ اور تمہاری دادی کا حال تو یہ تھا کہ نالی کے اس کیڑے کو اپنے گھر میں پال رہی تھی۔ پتا نہیں کس کی گندگی کے ڈھیر کو اپنے گھر رکھ لیا تھا میں کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ میرے بچے اس لڑکی کے ساتھ ملیں جلیں لیکن ایک گھر میں رہتے ہوئے یہ کہاں ممکن ہو سکتا تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے ایک کھڑکی کھل گئی' آسیہ کواڑ تھامے کھڑی تھی۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس کے خوبصورت لمبے بال بکھر گئے۔ کیا وہ اس الزام کی مستحق تھی؟ ان الفاظ کی مستحق تھی' وہ اس لیے گندگی کا ڈھیر تھی کہ اس کے والدین کے بارے میں سب لاعلم تھے لیکن میرا تو بہت اعلیٰ خاندان تھا' باپ اعلیٰ سول سرونٹ' ماں اونچے خاندان کی تعلیم یافتہ خاتون لیکن جو کچھ چند دن پہلے آسیہ کے کمرے میں بیتا تھا اس کے بعد میں ایک گندگی کا ڈھیر نہیں تھا۔

''ممی۔'' میں نے کہا۔ ''اگر میں آسیہ سے شادی کرنا چاہوں تو؟''

''آسیہ؟ کون آسیہ؟'' ممی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے میری جانب دیکھا۔

''وہی گندگی کا ڈھیر نالی کا کیڑا۔'' میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔

ممی تو جیسے سانس لینا ہی بھول گئیں۔ ''سہیل تم اپنے حواسوں میں تو ہو؟''

''جی میں اپنے حواسوں میں ہوں' اگر میں آسیہ سے شادی کرنا چاہوں تو؟''

''اسی دادی کے پوتے نکلے' مجھے یقین تھا کہ یہ عورت ضرور میرے گھر کو تباہ کرے گی اور وہی ہوا۔ اب گندگی کا وہ ڈھیر میرے گھر میں پھینکنا چاہتی ہے میں چاہتی تھی کہ اپنے بچوں کی شادیاں اعلیٰ خاندان میں کروں' میں نے تمہارے لیے سارہ کو پسند کیا تھا لیکن تم پر بھی اپنی دادی کا ہی اثر ہوا۔ اسی گندی نالی میں پہنچ گئے تم بھی۔''

''ممی بہت ہوگئی' میں آسیہ کے متعلق ایسی باتیں نہیں سن سکتا۔ آپ سوچ لیں کہ آپ اس کے لیے رشتہ لے جائیں گی یا نہیں؟''

''مر کر بھی نہیں' جس گھر پر تھوک کر آ گئی تھی' اب وہیں جھولی پھیلا کر جاؤں' وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے لیے جس کے باپ کا بھی علم نہیں۔''

''میں بہر حال وہیں شادی کروں گا۔ آپ چاہیں تو رشتہ لے جائیں' نہ چاہیں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''اگر تم نے اس لڑکی سے شادی کی تو سمجھ لینا تمہاری ماں مر گئی' شکل مت دکھانا مجھے اپنی۔''

ہم دونوں میں تکرار ہونے لگی' یہاں تک کہ پاپا اور گڑیا بھی آ گئے۔ پہلے تو پاپا کو اس بات پر غصہ آیا کہ میں ممی سے لڑ رہا تھا پھر جب جھگڑے کی وجہ معلوم ہوئی تو ان کا پارہ اور چڑھ گیا۔

''دفع ہو جاؤ اس گھر سے اور صورت مت دکھاؤ اپنی' یہ مت سوچنا کہ اکلوتے بیٹے ہو تو اپنی مرضی چلا لو گے۔''

میں بھی غصے میں گھر سے نکل آیا۔ اس وقت میرے والٹ میں صرف سو روپے تھے' رات کا وقت تھا۔ اور ظاہر ہے میں گھر سے اپنے کپڑے یا اپنی کار بھی نہیں لا سکتا تھا۔ ویگن پر بیٹھ کر لاء کالج کے ہوسٹل پہنچا اور ایک دوست کے ساتھ اس کے کمرے میں رہنے لگا۔

اب صورت یہ تھی کہ اب تک میرا ایم اے کا رزلٹ نہیں نکلا تھا۔ بی اے کی ڈگری اور دیگر سرٹیفکیٹ گھر میں پڑے تھے' تن آسانی کی بھی عادت تھی کہ گھر میں ڈھیر سارے نوکر چاکر تھے' بہترین کھانا میری کمزوری تھا اور یہاں کا کھانا کھانا میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ چند دن تو لکشمی چوک جا کر کھانا کھاتا رہا۔ مگر باہر کا کھانا کب تک کھایا جا سکتا ہے۔ پھر جو آرام اپنے گھر کا تھا' وہ بھی یہاں میسر نہیں تھا۔ دوستوں کے کپڑوں پر گزارا ہو رہا تھا۔ انہی کی سگریٹ استعمال ہو رہی تھیں' بستر بالکل آرام دہ نہیں تھے۔ باتھ روم میری پسند کے مطابق نہیں تھے۔ دو تین دن تو فلمیں بھی سینما ہاؤس میں جا کر دیکھ لیں پھر وہ..... بھی بد مزہ محسوس ہونے لگی۔

میں سوچ رہا تھا کہ اب آگے جا کر کیا کروں؟ میرا ارادہ سول سروس کا امتحان دینے کا تھا۔ اس کے لیے کچھ تیاری کر بھی رہا تھا لیکن ابھی بہت پڑھنا تھا چھوٹی موٹی نوکریاں بھی آنکھوں کو جچتی نہیں تھی کہ شروع سے پاپا کو افسری کرتے دیکھا تھا۔ اور ابھی سے خود کو بھی افسر سمجھنے لگا تھا' کار کے بغیر یوں لگتا تھا جیسے لنگڑا ہو بیٹھا ہوں۔ دوست اچھے تھے کہ اب تک نبھا رہے تھے' مگر کب تک وہ بھی نبھاتے' اب تک میں انہیں اپنے پیسوں سے کھلاتا آیا تھا۔ اب یہ بات بھی مجھے چبھ رہی تھی کہ وہ مجھے کھلا رہے تھے۔

اس روز میں عمران کے ساتھ فیروز سنز جا رہا تھا۔ راستے میں پبلک فون بوتھ سے گھر

فون کیا۔ دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ گڑیا فون اُٹھائے۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف سے گڑیا کی آواز آئی۔

''تھینک گاڈ گڑیا تم ہو۔''

''سہیل کہاں ہو تم؟ اتنے دن ہو گئے کوئی ایسا بھی کرتا ہے بھی۔'' وہ رو پڑی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں' پلیز گڑیا تم میرا ایک کام کر دو' میری سرٹیفکیٹ والی فائل اور کچھ روپے مجھے لا دو۔ لا کر دے سکتی ہو؟''

''نہیں۔'' دوسری طرف سے پاپا کی آواز آئی اور فون بند ہو گیا۔

میں نے بھی مرے مرے انداز میں ریسیور رکھ دیا۔ اور قدم فیروز سنز کی طرف بڑھا دیئے۔

میں بے دلی سے کتابیں دیکھ رہا تھا اور موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک سارہ کی آواز سن کر چونک گیا۔

''سارہ تم؟'' اسے دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی۔

''کتابیں خریدنے آئے ہو؟''

''ہاں؟'' میں نے جھوٹ بولا حالانکہ کتابیں عمران کو خریدنا تھیں' میری جیب میں تو...... پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔

''میں بھی کتابیں لینے آئی تھی۔''

تھوڑی دیر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے' میرے ذہن میں بار بار ممی کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''میں نے تمہارے لیے سارہ کو پسند کیا تھا لیکن تم پر بھی دادی کا ہی اثر ہوا۔ اسی گندی نالی میں پہنچ گئے تم بھی۔''

اس سے باتیں کرتے ہوئے میں اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ بے شک وہ آسیہ کی طرح حسین نہیں تھی لیکن کسی سے کم بھی نہیں تھی۔ پھر اس کا اعتماد' چہرے پر پھیلی نرم نرم مسکراہٹ' اس کی تعلیم' اندازِ نشست و برخاست' لباس' اندازِ گفتگو' ہر چیز آسیہ سے کہیں زیادہ بہتر تھی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا۔

وہ چلی گئی تب بھی میرے ذہن میں اس کا خیال اٹکا رہا۔ ہوسٹل آ کر میں بستر پر سیدھا

لیٹ گیا' اور اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کا اور آسیہ کا موازنہ کر رہا تھا اور سارہ مجھے ہر لحاظ سے آسیہ سے بہتر لگ رہی تھی' اسے حاصل کر کے میں سب کچھ پا سکتا تھا۔ آسیہ کو حاصل کرنے کے لیے مجھے بہت کچھ کھونا پڑتا۔ شاید اپنا شاندار مستقبل اور کیریئر بھی۔ گھر پہلے ہی چھوٹ چکا تھا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ میری محبت بہرحال اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں دودھ کی نہر کھود سکتا۔ میں جس زندگی کا عادی تھا۔ جو تن آسانیاں میں نے ہمیشہ دیکھی تھیں' انہیں چھوڑ کر در بدر ہو جانا میرے لیے ممکن نہیں تھا' آسیہ اتنی اہم نہیں تھی' جس کے لیے میں اپنی زندگی اور مستقبل تباہ کر لیتا' مجھے سول سروس کا امتحان دینا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں اس میں کامیاب بھی ہو جاؤں گا لیکن اس طرح امتحان دینا ممکن نہیں تھا۔ اور میں محض ایک راج' مزدور یا اسکول ٹیچر بن کر اپنی زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔

سو میں گھر واپس چلا آیا۔ گڑیا مجھ سے لپٹ کر رو پڑی۔ ممی پاپا نے میری آمد کو یوں لیا' جیسے میں کہیں گیا ہی نہیں تھا اور چند دنوں میں ہی میری اور سارہ کی منگنی ہو گئی۔

منگنی کے بعد مناج میں اس کے ساتھ ڈنر کرتے ہوئے مجھے اپنے پرانے رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔

آخر حسن کے علاوہ تھا ہی کیا آسیہ میں؟ مجھے اس سے ہمدردی تھی جسے میں محبت سمجھ بیٹھا۔ اور وہ رات اور وہ لمحات محض وقتی اُبال تھے' ورنہ سارہ کے سامنے آسیہ کیا تھی۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک بیوقوف احمق لڑکی' کم تعلیم یافتہ۔ خود اعتمادی سے محروم' جس کی دنیا میری دنیا سے قطعی مختلف ہے۔

اور میں اس کی خاطر گھر چھوڑ بیٹھا تھا۔ اپنا مستقبل داؤ پر لگا رہا تھا۔ اس روز ممی سے جھگڑنے کی وجہ بھی آسیہ کی محبت نہیں صرف ان کا ایک فقرہ تھا۔

''تمہاری دادی کا یہ حال تھا کہ نالی کے اس کیڑے کو اپنے گھر میں پال رہی تھی' پتا نہیں کس کی گندگی کے ڈھیر کو اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔ میں کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ میرے بچے اس لڑکی کے ساتھ ملیں جلیں۔''

اور یہ سن کر میرا ذہن ان لمحوں میں بھٹک گیا تھا۔ جب میں بھی اسی گندگی کے ڈھیر کا ایک حصہ بن گیا تھا۔

لیکن بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تنہا نہیں تھا' وہ بھی برابر کی حصہ دار تھی۔

میں نے چاہا تھا کہ اسے اپنے سے الگ کر دوں' لیکن وہ اس پر تیار نہیں تھی۔ زیادہ قصور اس کا تھا۔ وہ مزاحمت کر سکتی تھی' میرا کیا ہے میں تو مرد ہوں۔

ممی نے پاپا کو میری منگنی کی اطلاع کسی بھی رشتہ دار کو دینے سے منع کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ آسیہ کے ساتھ شادی کے لیے مجھے ضرور دادی اماں نے کہا ہو گا۔ اس لیے وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس بات کو فوری طور پر کسی کو بتایا جائے۔

''یوں بھی ہمارا بیٹا ہے' ہم جہاں شادی طے کر دیں کسی کو کیا؟ مگر رشتہ داروں کی عادت ہوتی ہے ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کی۔'' انہوں نے کہا۔

چار پانچ مہینے اسی طرح گزر گئے۔ میں امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ فارغ وقت سارہ کے ساتھ گزرنے لگا۔ وہ ہر روز پہلے سے بڑھ کر میرے دل میں گھر کرتی تھی' اس کے ساتھ گھومنے پھرنے' باتیں کرنے میں اتنا مزا تھا' امتحان کی تیاری میں بھی وہ میری بھرپور مدد کر رہی تھی۔ کبھی میں سوچتا کہ اس کی جگہ آسیہ ہوتی تو پڑھنے کے دوران میری صرف اس قدر مدد کر سکتی تھی کہ چائے کا ایک کپ خاموشی کے ساتھ رکھ کر کمرے سے باہر چلی جائے۔ لٹریچر سارہ کا بھی مضمون تھا اور برٹش ہسٹری اسے ویسے بھی پسند تھی۔ یوں ہم دونوں مل کر کتنی دیر تک متعلقہ موضوعات ڈسکس کرتے رہتے تھے' وہ نہ جانے کہاں کہاں سے میرے لیے کتابیں لاتی تھی' کرنٹ افیئرز کے نوٹس بنانے کی ذمہ داری بھی اس کی تھی' ساتھ اس کی جاب بھی تھی۔ صبح سے شام تک وہ کام کرتی رہتی تھی۔ اور میں نے اس لڑکی کو تھکتے نہیں دیکھا تھا۔

پھر اچانک ایک روز انکل کا فون آ گیا' دادی اماں بہت بیمار تھیں' اور چاہتی تھیں کہ ہم سب ایک مرتبہ آ کر ان سے مل لیں۔

ممی نے صاف انکار کر دیا۔ ''وہ یہاں آ جائیں مجھ سے جس حد تک ہوا ان کی دیکھ بھال کروں گی' لیکن میرا وہاں جانا ہرگز ممکن نہیں ہے۔''

پاپا نے سمجھایا۔ ہم بچوں نے منت کی' لیکن ممی ماننے پر تیار نہیں تھیں۔ خاص طور پر میرا اصرار نہیں بہت کھل رہا تھا۔

''سہیل! تم اس معاملے میں بالکل مت بولو۔'' مجھے وہ صاف ڈانٹ دیتی تھیں۔

گھر میں یہ سلسلہ جاری تھا' کتنے دن بیت گئے تھے' جب انکل کا دوبارہ فون آیا۔ پاپا

نے ان سے کہہ دیا۔

''اصل میں آفس کا کام جان نہیں چھوڑ رہا۔ بہرحال کام کے سلسلے میں بائی روڈ اسلام آباد جا رہا ہوں' راستے میں تھوڑی دیر رکتا جاؤں گا۔''

ظاہر ہے ممی کی بات اور تھی' لیکن دادی اماں پاپا کی تو امی تھیں' وہ کیسے منع کر سکتے تھے اسلام آباد بھی یوں جانا ہوا تھا کہ ننھیال کے کچھ کزنز وہاں جمع تھے' پاپا کو جانا ہی تھا۔ گڑیا بھی سب کزنز کے ساتھ شامل ہونا چاہتی تھی۔ نانا' نانی راولپنڈی میں رہتے تھے' اس طرف کا پروگرام بنتا اور ممی نہ جاتیں' یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ سارہ چند دن کے لیے ڈیرہ غازی خان گئی ہوئی تھی' یوں میں بھی فارغ ہی تھا۔

بس ممی درمیان میں جہلم رکنا نہیں چاہتی تھیں۔

''میں نے کہہ دیا ہے کہ ہم رکیں گے' اس لیے وہاں رکنا ہو گا۔ چاہے صرف چند منٹ کے لیے ہی سہی۔'' پاپا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اور جب وہ اس طرح بات کرتے تھے تو پھر کسی بحث یا انکار کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔

تاہم ممی نے بھی دل میں سوچ لیا تھا کہ وہ بھی چند منٹ سے زیادہ نہیں رکیں گی۔ ویسے تو وہاں چند منٹ رکنا بھی ان کے لیے مشکل تھا۔

جس روز ہمیں جہلم جانا تھا' پاپا نے اس سے تین دن قبل ہی وہاں آنے کی اطلاع بھجوا دی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آسیہ میری منتظر ہو گی' اور مجھ سے ضرور گلہ کرے گی' اس وقت میں صورتِ حال کو کیسے قابو کروں گا۔ اسے کس طرح بتاؤں گا کہ میری تو منگنی بھی ہو چکی ہے' اور جو لڑکی میری شریکِ زندگی بننے جا رہی ہے' آسیہ تو کیا کوئی بھی لڑکی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

گوجرانوالہ ماموں کے گھر پہنچنے تک گڑیا میرے ساتھ کار میں سفر کر رہی تھی۔ جبکہ ممی پاپا دوسری کار میں تھے۔ اس نے مجھے زیادہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا' اس کی زبان مسلسل چل رہی تھی۔ گوجرانوالہ میں ہمارا ارادہ زیادہ دیر رکنے کا نہیں تھا لیکن ممی کو اپنی طبیعت خراب ہوتی محسوس ہونے لگی۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ طبیعت کی خرابی کی وجہ کیا تھی لیکن اس میں میرا بھی فائدہ تھا۔ میں آسیہ سے ملنا چاہتا تھا' لیکن زیادہ دیر کے لیے نہیں جہلم میں زیادہ دیر رکنے سے میری اور اس کی ملاقات طویل ہو سکتی تھی' جو کہ میں بالکل نہیں چاہتا تھا۔

گوجرانوالہ سے دادی اماں کی طرف جاتے ہوئے میں نے گڑیا کو ممی پاپا کی کار میں

بھجوا دیا۔ میں آسیہ اور اس متوقع ملاقات کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا' جو میرے خیال کے مطابق میری اس سے آخری ملاقات تھی۔

کار سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی' آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ساون شروع ہو چکا تھا۔ بارش کسی بھی وقت متوقع تھی۔

میں راستے بھر سوچتا رہا۔ میں نے بہرحال آسیہ سے وعدہ کیا تھا' اور وہ بیوقوف لڑکی میرا ضرور انتظار کر رہی ہوگی' جو کچھ ہمارے درمیان بیتا' اس میں میرا قصور اس قدر تھا کہ میں اس سے ہمدردی کر رہا تھا' خوامخواہ مصیبت میں پھنس گیا۔ کاش سارہ پہلے میری زندگی میں آ گئی ہوتی تو . . . . یہ سب نہ ہوتا۔ خیر اپنی عزت کی حفاظت خود اس کا کام تھا نہ کہ میرا' میری تو کوشش تھی کہ ایسا نہ ہو' اب ایسا ہو گیا تو گو کہ یہ...... افسوس ناک تھا لیکن اس میں میرا کوئی قصور بہرحال نہیں ہے۔

ہاں میں وعدہ خلافی کا مرتکب ہو رہا ہوں' جس کا تمام تر گناہ میں اپنے سر لینے کے لیے تیار ہوں' مگر یہ گناہ یقیناً بہت بڑا نہیں ہے' غلطی ہوئی ہے لیکن تلافی کی صرف ایک صورت ہے کہ اسے کچھ دے دلا کر معذرت کر لی جائے' ظاہر ہے اس کی خاطر میں اپنا مستقبل' اپنا کیریئر تو داؤ پر نہیں لگا سکتا اور پھر سارہ جیسی لڑکی کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں میں' آسیہ کو خود بھی اب تک ان باتوں کا احساس ہو جانا چاہیے۔''

رات کے تقریباً گیارہ بجے ہم جہلم والے گھر پہنچے ہمیں ہارن دینے یا بیل بجانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس سے پہلے ہی انکل نے گیٹ کھول دیا۔ دروازے سے لیونگ روم تک گھر کا جتنا حصہ تھا۔ میں نے اس میں سرسری طور پر آسیہ کو دیکھنے کی کوشش کی' مگر وہ دکھائی نہ دی۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ اچھا تھا یا برا۔

''نہیں' یہ برا ہوگا۔'' بالآخر میں نے سوچا۔ ''میں اسے کسی امید پر نہیں رکھ سکتا۔ اسے بھی معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تعلق ختم ہو چکا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ میری راہ دیکھتی رہ جائے۔ اسے بھی علم ہو جانا چاہیے' کہ یہ میری اس سے آخری ملاقات ہے۔ خود میں بھی اپنے دل پر یہ بوجھ نہیں رکھ سکتا کہ میں نے اس سے وعدہ کر کے پورا نہیں کیا۔ کچھ نہ کچھ تلافی بہرحال کرنی ہی ہوگی۔

ہمیں دیکھ کر دادی اماں رونے لگیں۔ مجھے اور گڑیا کو بے تحاشا پیار کیا۔ ممی نے البتہ کسی گرمجوشی کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

''بیٹا! میرا اتنا بڑا قصور بھی نہیں تھا' کہ اتنے سالوں میں تم لوگوں کی شکل دیکھنے آواز سننے کو بھی ترس گئی۔ میں پرانے وقتوں کی عورت ہوں' نئے زمانے کو میں کیا جانوں بس یہی گناہ تھا میرا' بہو تو ایسے گئیں کہ پلٹ کر شکل تک نہ دکھائی۔ کیسے کیسے تڑپی ہوں میں تم دونوں بچوں کے لیے۔''

وہ کہتی جا رہی تھیں' اور میں انہیں چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا' اسی دوران انکل کی آواز آئی۔

''آسیہ۔ آسیہ بیٹا!''

میں چونک گیا' گویا وہ لیونگ روم میں آئی تھی' دروازے کی سمت دیکھا' وہ وہاں کھڑی میری جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ پل کے پل ہماری نگاہیں ٹکرائیں۔

''آسیہ!'' انکل نے پھر پکارا۔

''جی۔ جی۔'' گھبرا کر اس نے نظریں ہٹا لیں۔

''بیٹا! تم جا کر آرام کرو۔'' انہوں نے اس سے کہا۔

انہیں آسیہ کے آرام یا بے آرامی سے غرض نہیں تھی' وہ تو بس اتنا چاہتے تھے کہ وہ وہاں کھڑی نہ رہے۔ شاید اس کے سامنے گھر کے مسائل پر گفتگو کرنا پسند نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔

اس کے جانے کے بعد بھی اس کا سراپا میرے ذہن میں رہ گیا۔ کتنی کمزور سی لگ رہی تھی وہ' نیلی آنکھیں کھوئی کھوئی سی تھیں' اس ایک پل میں جب اس کی اور میری نگاہیں ملی تھیں' ان آنکھوں نے مجھے پیغام دے دیا تھا۔ ان اداسیوں کی داستان بتا دی تھی۔ جن سے وہ گزر رہی تھی۔ ان آنکھوں میں جیسے انتظار کے موسم ٹھہر گئے تھے۔

میں شرمندہ ہو گیا اور خود کو ہی اپنی صفائیاں پیش کرنے لگا۔

''مگر اس میں میرا قصور نہیں ہے' جتنا قصور ہے اتنا میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں' لیکن اس سے زیادہ نہیں اسے چاہیے تھا کہ وہ خود اپنی حفاظت کرتی' ہاں وعدہ خلافی الگ بات ہے' اور میں دل سے اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں' صرف ایک لڑکی کے لیے سب کچھ چھوڑ دینا

بہت مہنگا سودا ہے۔"

ممی تھوڑی ہی دیر میں اُٹھ کر کھڑی ہوئیں۔ آنٹی نے جو کھانے پینے کے لوازمات سامنے ڈھیر کر رکھے تھے‘ ہم میں سے کسی نے ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ یوں بھی رات کا کھانا ہم کھا کر ہی چلے تھے۔ ممی یہاں آ گئی تھیں‘ یہی بہت تھا۔ ان کا کچھ کھانے پینے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ گڑیا کھانے پینے کے معاملے میں یوں بھی انتہائی احتیاط کرتی تھی۔ پاپا پرہیزی کھانوں کے علاوہ کچھ لے نہیں سکتے تھے‘ اور میرا تو دل بالکل ہی مرا ہوا تھا۔

ممی‘ پاپا اور گڑیا جانے کے لیے تیار تھے‘ مگر میں رکنا چاہتا تھا۔ میرا آسیہ سے ملنا بہت ضروری تھا‘ اس کی خاطر نہیں اپنی خاطر‘ میں اپنے ضمیر پر اضافی بوجھ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

"آپ لوگ نکلیں‘ میں آپ کو جوائن کر لوں گا‘ بس پانچ منٹ میں۔" میں نے ممی سے کہا۔

"کیا مطلب ہے پانچ منٹ رکنے کا۔ ہم پہلے ہی اتنے لیٹ ہو گئے ہیں۔ بوندا باندی شروع ہو گئی ہے‘ تھوڑی دیر میں بارش اور تیز ہو جائے گی۔" ممی نے مجھے گھورا۔

میں ممی سے اُلجھ پڑا۔ "کیا ہو گیا ہے میں بچہ تو نہیں ہوں۔ اور بارش کیا کہتی ہے‘ اتنی دیر گوجرانوالہ میں نہیں لگائی تھی ناں۔"

"میں دیکھ رہی ہوں کہ تم بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔" ان کے لہجے میں سرزنش تھی۔

میں جانتا تھا کہ وہ مجھے یاد دلانا چاہتی تھیں کہ سارہ میری منگیتر تھی‘ اور ان کا یہی خیال تھا کہ میں آسیہ کی خاطر وہاں رکنا چاہتا تھا۔ یوں بھی انہیں بہت پہلے سے یقین تھا کہ مجھے آسیہ سے شادی پر تیار کرنے میں دادی اماں کا ہاتھ تھا۔ اب شاید پھر وہ ایسی ہی کسی سازش کی بو سونگھ رہی تھیں۔

"رہنے دیں ناں ممی!" میرے کچھ کہنے سے قبل ہی گڑیا میری طرف داری میں بول پڑی۔ "ٹھیک تو کہہ رہا ہے وہ بچہ تو نہیں ہے‘ اور پانچ منٹ میں جوائن کر لے گا۔"

"پانچ منٹ سے پانچ گھنٹے لگائے گا یہ۔" ممی بولیں‘ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"میں گڑیا کو اپنی کار میں لے جا رہی ہوں‘ اور تم نے پانچ منٹ کہا ہے تو اس سے زیادہ وقت مت لگانا چلیں راشد۔"

سب ہی ممی‘ پاپا اور گڑیا کو باہر تک چھوڑنے کے لیے آئے‘ دادی اماں باہر بوندا باندی

میں نکلنے کے بجائے وہیں بیرونی برآمدے کے دروازے پر کھڑی ہو گئیں۔ چند لمحے تو میں نے ان کا ساتھ دیا پھر میں آسیہ کی تلاش میں اندر چلا آیا میرے پاس بہت تھوڑا وقت تھا اسے دینے کے لیے۔ ابھی جب آنٹی‘ انکل اور دادی اماں اندر آتے تو میری اور اس کی تنہائی میں ملاقات ممکن نہ رہتی۔

گھر کے اندر والے برآمدے میں کھڑے ہو کر میں نے اسے پکارا۔

"آسیہ آسیہ کہاں ہو؟" میری آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

اس کا جواب نہ پا کر میں کوارٹر کی طرف بڑھا۔ بالکل اچانک وہ میرے راستے میں آ گئی۔

"سہیل!" وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ "کہاں چلے گئے تھے تم‘ تم نے تو کہا تھا کہ تم چلے آؤ گے‘ مجھے ہمیشہ کے لیے اپنانے کو‘ کدھر کھو گئے تھے تم؟"

اس بات سے پریشان تھا میں اس صورتِ حال کو صرف چند لمحوں میں قابو کرنا میرے لیے انتہائی مشکل تھا۔

"آسیہ زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس تمہاری خاطر میں رک گیا تھا کہ شاید چند لمحے کے لیے ہی سہی تم سے علیحدگی میں بات ہو جائے‘ ابھی دادی اماں اندر آتی ہوں گی‘ اور آتے ہی مجھے ڈھونڈیں گی۔"

ابھی میں بات مکمل بھی نہیں کر سکا تھا کہ دادی اماں کی آواز آئی۔

"سہیل بیٹا! کہاں ہو؟"

میں نے آسیہ کو خود سے الگ کیا۔

"دادی اماں مجھے بلا رہی ہیں‘ تم یہ رکھ لو۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی ہتھیلی پر سو روپے کا نوٹ رکھ دیا۔

میرے خیال میں ایک وعدہ خلافی کا اس قدر جرمانہ کافی تھا۔ پچاس روپے بہت کم ہوتے‘ اور پانچ سو روپے اس کی حیثیت سے زیادہ ہوتے۔ سو روپے مناسب رقم تھی۔

"یہ کیوں؟" اسے جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا۔ "مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے میں....."

"سہیل۔" بڑی اماں کی آواز اس کی سرگوشی پر حاوی ہو گئی۔

"آ رہا ہوں دادی اماں۔" میں نے آسیہ کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی' اور اس سے مخاطب ہوا۔ "گڈ بائے۔"

اور اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی' میں پلٹ کر تیزی سے اندر چلا گیا۔

باہر بارش شدت اختیار کر گئی تھی۔ میں دادی اماں' انکل اور آنٹی کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ جب اُٹھنے کا ارادہ کرتا تو آنٹی بارش کی شدت کا حوالہ دے کر بیٹھ جانے پر اصرار کرتیں۔ یا پھر دادی اماں کے آنسو مجھے بیٹھ جانے پر مجبور کر دیتے۔ بالآخر ڈھائی تین گھنٹے بعد اُٹھ کھڑا ہوا۔

انکل اور آنٹی اسی بارش میں مجھے کار تک چھوڑنے آئے۔

"آپ لوگ اندر چلیں بارش بہت تیز ہے۔" میں نے کہا۔

"بیٹا! محبتوں کے بیچ میں اتنی سی چیز کہاں حائل ہوتی ہے۔" انکل نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

کار اسٹارٹ کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں آسیہ پر یہ تاثر چھوڑنے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ ہمارے درمیان جو کچھ بھی تھا وہ ختم ہو چکا۔

گیٹ سے باہر نکل کر کار کی ہیڈ لائٹس نے تاریکی میں روشنی کی لکیر سی بنا دی' اور میں چونک اُٹھا۔ وہ درخت جس پر بچپن میں ہم جھولا جھولا کرتے تھے' آسیہ اس کے تنے سے لگی رو رہی تھی۔ میں نے چاہا کہ رکوں' لیکن پھر اس خیال کو مسترد کر دیا۔

"نہیں' اسے یقین آ جانا چاہیے کہ ہم دونوں اجنبی ہیں۔ وہ محبت تھی' ہمدردی یا وقتی اُبال' اب بہرحال کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں نے کار کو چوتھے گیئر میں ڈالا' اور اس کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ تیز بارش اور اندھیرے میں اس کا سایہ بھی گم ہو گیا۔ بس ایک آواز باقی تھی' جو سناٹے کا سینہ چیرتے ہوئے میری سماعت تک پہنچ گئی تھی۔

"سہیل! سہیل رک جاؤ۔"

مگر میں وہ باب وہیں بند کر دینا چاہتا تھا۔ میرے سامنے بہت سی مصلحتیں تھیں' خواہشیں تھیں' خواب تھے' میں رک نہیں سکتا تھا' اس لمحے رک جاتا تو پھر ساری زندگی آگے قدم بڑھانے کے قابل نہ رہتا۔ گھر سے باہر اور افسری سے دور زندگی بہت مشکل تھی۔ ویسی

زندگی گزارنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اور پھر سارہ تھی جس سے میری محبت کی بنیاد ہمدردی نہیں تھی۔ وقت گزرتا ہے تو بہت کچھ بدل جاتا ہے' میں بھی اس وقت سے آگے نکل آیا تھا جب آسیہ کی میری زندگی میں اہمیت تھی۔

دو برس بعد میں نے سول سروس کا امتحان دیا' اور اس میں سے ڈیڑھ سال میں نے برطانیہ میں گزارے' وہاں میرا کام صرف اتنا تھا کہ پڑھوں لکھوں' اور جب دل چاہے تو گھومنے کے لیے چلا جاؤں۔ پاکستان آ کر میں نے امتحان دیا' اور سارہ کے ساتھ اس کے پروجیکٹ میں رضاکارانہ مدد کرنے لگا۔ اس دوران امتحان کے کتنے مراحل ہوئے' بالآخر فائنل رزلٹ نکلا' اور میں بھی منتخب ہو گیا۔ میری اور سارہ کی شادی میری ٹریننگ ختم ہونے کے بعد ہونا قرار پائی تھی۔ اس دوران پاپا کی پوسٹنگ اسلام آباد ہو چکی تھی۔ یہ تمام عرصہ اس قدر مصروفیت کا تھا کہ میں اپنے کیریئر اور سارہ کے علاوہ کچھ سوچ بھی نہیں سکا تھا۔ گھر والوں نے بھی مجھے پُرسکون ماحول دینے کے لیے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ وہ مجھ سے کوئی ایسی بات نہیں کہتے تھے' جو مجھے ڈسٹرب کرے اور میری امتحان کی تیاری متاثر ہو۔ کسی مسئلے میں نہیں اُلجھاتے تھے' میری ہر ضرورت کا خیال رکھا جاتا تھا۔

یہ بات میری اور سارہ کی شادی سے صرف ایک ہفتہ قبل کی ہے' میں لاہور سے بائی روڈ اسلام آباد جا رہا تھا جہلم کے پُل پر پہنچ کر داہنی سمت میں نگاہ ڈالی تو بہت سی تبدیلیوں کا احساس ہوا۔ ایک دم آسیہ میرے روبرو آ گئی۔

"سہیل۔ سہیل رک جاؤ۔"

کی آوازیں چاروں طرف سے مجھے گھیرنے لگیں۔ میں نے حیرت سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ چمکیلی دھوپ میں بہت سی گاڑیاں' بہت سے لوگ میرے ارد گرد سے نکل رہے تھے۔ مگر وہاں آسیہ کہیں نہیں تھی۔

چرچ کی عمارت پہلے سے زیادہ ویران لگ رہی تھی۔ وہ اسکول جس میں آسیہ پڑھتی تھی' اس کے گرد چار دیواری کا اضافہ ہو چکا تھا' ذرا آگے بڑھا تو داہنے ہاتھ سڑک کے بالکل نشیب میں کچھ مکان دکھائی دیئے۔

"سہیل۔ سہیل رک جاؤ۔"

کی آوازوں نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ گول چوک سے بالکل بے اختیاری کے

عالم میں' میں سیدھے ہاتھ مڑ گیا' اور پھر اسی طرح دائیں ہاتھ فاروق روڈ پر گاڑی موڑ لی' سامنے ہی چرچ ایستادہ تھا۔ محکمہ موسمیات کے آفس میں ہوا میں بڑا سا غبارہ چھوڑنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ بائیں ہاتھ مڑ کر میں آسیہ کے اسکول اور اس کے مقابل بی زیارت تک پہنچا۔ وہ زیارت اور اس کا کنواں ویسا ہی تھا لیکن اسکول کی عمارت تبدیل ہو چکی تھی۔ میں حیران تھا کتنی جلدی سب کچھ بدل گیا تھا۔

یونہی کتنی دیر تک میں سڑکوں پر آوارہ گھومتا رہا' اور نہ جانے کیسی لاشعوری طور پر دادی اماں کے گھر کے گیٹ پر جا پہنچا۔ ہارن بجایا تو ایک اجنبی نے گیٹ کھولا۔

ملازم بھی تبدیل ہو گئے تھے' وہ سب کتنے پرانے اور وفادار ملازم تھے' میں نے سوچا۔

''جی سر!'' اس ملازم نے میرے قریب آ کر پوچھا۔

''صاحب ہیں گھر پر؟''

''جی سر' انہیں کیا بلاؤں؟''

''میں خود اندر جا کر ان سے مل لوں گا۔'' میں نے کہا اور کار اندر لے گیا۔

گھر کا لان پہلے کی طرح پھولوں بھرا نہیں تھا۔ گھاس بھی بڑھی ہوئی تھی۔ میں اترا تو انکل مجھے گیلری میں ہی مل گئے۔

''سہیل!'' انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

میں ان کے گلے لگ گیا۔ وہ مجھے آنٹی کے پاس لے آئے۔ ان دونوں کی محبت کا رنگ کم نہیں ہوا تھا۔ آنٹی مجھے ڈرائنگ روم میں لے آئیں' جہاں فرنیچر کے نام پر ایک کرسی نما صوفہ سیٹ اور دو تپائیاں ہی پڑی ہوئی تھیں۔

''دراصل ہم یہ مکان چھوڑ رہے ہیں' بس کل صبح تک نئے مکان میں چلے جانے کا ارادہ ہے' اس لیے تمہیں اس وقت اسی صوفے پر گزارا کرنا ہوگا۔'' آنٹی نے معذرت کی۔

''نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ تو بہت اچھا مکان ہے' اسے کیوں چھوڑ رہے ہیں؟''

''بس بیٹا! اتنے بڑے مکان کا ہمیں کیا کرنا۔ اب گل افشاں کالونی میں نیا مکان بنایا ہے۔ خیر تم بیٹھو میں ابھی چائے کا کہہ کر آتی ہوں۔''

ہم چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے' لیکن میں مسلسل اُلجھن محسوس کر رہا تھا۔ وہ گھر

بہت اُجڑا اُجڑا سا لگ رہا تھا۔ اس بات کو تو خیر میں نے یہ سوچ کر ٹال دیا کہ گھر بدل رہے ہیں' سامان چلا گیا ہے' اور جو رہ گیا ہے وہ بھی کل صبح تک چلا جائے گا۔ مگر باقی گھر والے کہاں تھے' یہاں تو میں نے بہت رونق دیکھی تھی۔ گھر کے کسی نہ کسی کونے سے عرفان کے چیخنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں' کہیں ارسلان بھائی شور مچا رہے ہوتے تھے۔ رفعت بھابی کچھ نہ کچھ بڑبڑاتی رہتی تھیں۔ آسیہ کہیں نہ کہیں کام کرتی نظر آتی تھی آنٹی نوکروں کو دوڑائے رکھتی تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر دادی اماں تھیں جن کی ذات پورے گھر پر چھائی رہتی تھی۔

آج ایک عجیب سا سناٹا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔

''آنٹی! سب کہاں ہیں؟'' بالآخر میں نے پوچھا۔

''سب کون؟'' ان کے لہجے میں افسردگی اُتر آئی۔ ''بس اب تو میں ہوں اور تمہارے انکل۔''

میں کچھ نہ سمجھا۔ ''کیوں آنٹی باقی سب کہاں گئے؟''

''بیٹا! ایک وقت تو ایسا آتا ہے ناں' جب گھونسلا بنانے اور اپنے بچوں کو اُڑان سکھانے والے اپنے اسی گھونسلے میں تنہا رہ جاتے ہیں۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو اپنی اگلی نسلوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے پھلتا پھولتا دیکھتے ہیں' ہم دونوں اتنے خوش قسمت نہیں ہیں۔''

''ہم دونوں زندگی کے ساتھی ہیں اور ہم یہ ساتھ ضرور نبھائیں گے۔'' انکل نے محبت سے آنٹی کی طرف دیکھ کر انہیں تسلی دی۔

''آنٹی! پھر بھی سب کہاں گئے؟''

''اب تو دو برس ہو گئے ہیں ارسلان بیوی بچوں کو لے کر الگ ہو گیا ہے۔ یہیں جہلم میں رہتا ہے لیکن اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ماں باپ سے مل لے' اب تو عرفان کے بعد سدرہ بھی بہو کی گود میں آ گئی ہے آنکھیں ترس جاتی ہیں انہیں دیکھنے کے لیے۔'' آنٹی کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

میرے گرد نہ جانے کیوں افسردگی کی دھند چھانے لگی۔

''اور دادی اماں؟''

انکل اور آنٹی نے میری جانب قدرے حیرت سے دیکھا پھر انکل بولے۔

"تمہیں معلوم نہیں؟"

"کیا معلوم نہیں؟" میرا دل بیٹھنے لگا۔

وہ گہری سانس لے کر چپ ہو گئے۔ چند لمحوں کے بعد آنٹی بولیں۔ ان کے لہجے میں تلخی تھی۔

"تم انگلینڈ میں تھے شاید' تمہیں کسی نے اطلاع نہیں بھجوائی۔ ورنہ تمہارے ماں باپ اور بہن تو تکلفاً صبح سے شام تک کے لیے آ گئے تھے۔"

"کیا مطلب؟" میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے بدترین خدشات درست ہوں۔

"انہیں فوت ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں بہت طویل عمر پائی انہوں نے' میں کہتی ہوں کہ وہ دس سال اور زندہ رہ سکتی تھیں اگر ان کے دل پر آخری عمر میں اتنے زخم نہ لگے ہوتے۔" آنٹی رو پڑیں۔

"اوہ گاڈ۔" میں نے سر پکڑ لیا۔

آنٹی روتی رہیں۔ انکل انہیں چپ کراتے رہے' اور میں سوچتا رہا کہ میں وہاں کیوں آیا تھا۔ ابھی اتنا عرصہ بھی نہیں گزرا تھا اور یہاں زندگی کتنی تبدیل ہو گئی تھی۔ میں کیوں یہاں چلا آیا تھا' وہ شہر جو میرے خوابوں میں سکون کی علامت بن کر بستا تھا۔ یکدم تبدیل ہو گیا تھا اب زندگی کے شور اور گہما گہمی سے تھک کر میں کن خوابوں میں پناہ لوں گا۔

میں اٹھا اور خالی کمروں میں جھانکنے لگا۔ وہ آواز جو مجھے پل سے کھینچ کر یہاں تک لائی تھی۔ میرے یہاں پہنچتے ہی کہیں گم ہو گئی تھی۔ اتنے بڑے گھر میں جیسے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ سرونٹ کوارٹر میں آسیہ کا کمرا بھی بالکل خالی تھا' وہ کہیں نہیں تھی۔ وہ جو آج اچانک مجھے یہاں لے آئی تھی' میں اس جگہ پھر کبھی نہیں آنا چاہتا تھا۔ بس میرے خواب تھے جن میں کبھی کبھی میں پناہ حاصل کر لیا کرتا تھا۔ مگر جسمانی طور پر یہاں آنے کا پھر میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

اس کے کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والا دریا ریت میں منہ دیئے سو رہا تھا۔ وہ کنارا اداس تھا۔ جہاں ہم دونوں برسوں پہلے بیٹھتے تھے' اور اس نے میرے کندھے سے سر ٹکا کر مجھے اپنی سوچوں میں شریک کیا تھا' اپنے خوف تک مجھے بتا دیئے تھے۔ وہ جس کے وجود کی مہک مجھے دیوانہ بنا دیتی تھی' آج گھر کے سنسان در و دیوار کے بیچ وہ خوشبو کہیں نہیں تھی۔

یہ کمرا جہاں پہلی مرتبہ مجھے اپنے وجود اور اس کی طاقت کا احساس ہوا تھا' اس کے در و دیوار سے اس رات کی یادیں بھی جیسے کھرچ گئی تھیں۔

میں باہر نکل آیا۔ آنٹی کوارٹر کے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی تھیں۔

"اپنی منتشر ذہنی کیفیت میں' میں تمہیں تمہاری منگنی کی مبارک باد دینا تو بھول ہی گئی۔"

"جی شکریہ۔" میرا اپنا ذہن نہ جانے کہاں منتشر ہو رہا تھا۔

"شادی کب ہو رہی ہے؟"

"ٹھیک پندرہ دن بعد آپ کو اب تک کارڈ نہیں ملا۔"

"تم بہت عرصے بعد آئے ہو ناں۔ شاید پاکستان آئے بھی زیادہ دن نہیں گزرے۔" وہ آہستہ سے بولیں۔

"نہیں' اب تو کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ بس پہلے امتحانوں میں مصروف رہا' پھر ٹریننگ کے سلسلے میں گھر سے کچھ دور رہا' لیکن آنٹی! آپ کچھ چھپا رہی ہیں۔ پلیز مجھے بتا دیں' مجھے بہت الجھن ہو رہی ہے۔"

وہ چلتے چلتے برآمدے سے آنگن میں اترتی سیڑھی پر جا بیٹھیں۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے' شاید تنہائی نے مجھے تلخ بنا دیا ہے۔"

"پلیز آنٹی!"

وہ چند لمحے خاموش رہیں' پھر گہرا سانس لے کر بولیں۔ "بیٹا! دوریاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ اب شاید غیروں کی طرح بھی ہمیں تمہاری شادی کا کارڈ نہ ملے۔"

"کیا مطلب؟ کیوں؟"

"تمہاری دادی کی آخری خواہش تھی کہ ان کی اولادیں مل جل کر رہیں' پتا نہیں دل ہی دل میں کیا کیا اور کس کس کے رشتے جوڑتی رہتی تھیں۔ تاکہ آپس کا تعلق کبھی نہ ٹوٹے۔ میں ان سے کہتی تھی کہ یہ سب بے کار ہے ان کے کہنے سے کچھ نہ ہو گا۔ جب تک کہ ان کی اولادوں سے اکٹھا ہونا نہیں چاہے گی۔

تمہارا اور گڑیا کا بھی انہوں نے دل ہی دل میں رشتہ انور اور سائرہ سے جوڑ دیا تھا۔ میں گڑیا اور انور کے معاملے میں تو نہیں بولی لیکن سائرہ میری پوتی ہے' مجھے ڈر تھا کہ تمہاری ماں یہ سمجھے گی کہ ایسا وہ میرے ایماء پر کر رہی تھیں۔ اس بات سے میں نے انہیں منع کیا' مگر

انہوں نے میری ایک نہیں سنی' راشد بھائی کو بلایا مگر وہ ہمیشہ کی طرح مصروف تھے' سو ایک دن تمہارے انکل اور میرے ساتھ وہ تم لوگوں کے گھر پہنچ گئیں۔

میں جانا نہیں چاہتی تھی' پر میری مجبوری تھی' کہ میں ان کا احترام کرتی تھی' ان سے محبت کرتی تھی' اور ان کی باتوں کو حکم کا درجہ دیتی تھی۔ سو مجھے ساتھ جانا پڑا۔ راشد بھائی اور بھابی نے جب تمہاری دادی کی بات سنی تو اس وقت ہمیں بتایا کہ تمہاری تو منگنی ہوئے بھی ایک ڈیڑھ برس ہونے کو آیا تھا۔ یہ صدمہ تمہاری دادی اماں کے لیے کم نہیں تھا۔ پھر تمہاری ماں نے مجھ پر بھی اس سلسلے میں کچھ الزام لگائے تو گرما گرمی بھی ہوگئی۔ بس اس وقت تمہارے انکل نے بھی کہہ دیا کہ اب ان کا تم لوگوں سے کوئی تعلق واسطہ نہیں رہا اس کے بعد اماں جان فوت ہوئیں' تب بھی تمہارے انکل نے راشد بھائی کو فون نہیں کیا۔ اتفاق سے یوسف آیا تھا۔ اسی نے انہیں اطلاع دی۔ وہ بھی رسم دنیا نبھانے کے لیے چند گھنٹے یہاں گزار کر واپس چلے گئے۔ تب سے اب تک ہمارا ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔''

میں ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔

''چلو بیٹا' اندھیرا پھیل رہا ہے اندر چلو۔'' آنٹی نے کہا۔

''آسیہ کہاں ہے آنٹی؟'' میں نے ان کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔

''جانے دو بیٹا! ان باتوں میں کیا رکھا ہے سمجھ لو وہ بھی مرگئی۔'' انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''مرگئی۔'' میں نے زیرلب کہا۔ پھر آنٹی کو روک لیا۔ ''کیا ہوا اسے؟ کہاں ہے وہ؟ پلیز آنٹی۔''

آنٹی کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں' ''ہم نے کیا نہ کیا اس لڑکی کے لیے' مگر اس نے ہمارے منہ پر ہی کالک لگا دی۔ یہ سب سے بڑا دکھ تھا جو تمہاری دادی کو دیمک کی طرح چاٹ گیا۔ زمانہ کتنا بدل گیا ہے سہیل۔ اگلے وقتوں میں لوگ احسان کو یاد رکھتے تھے' اب جس کے ساتھ نیکی کرو' وہی جوتا سر پہ مار کر چلا جاتا ہے۔''

''مگر ہوا کیا آنٹی؟'' میرے دل میں کتنے ہی اندیشے سر اٹھانے لگے تھے۔

''ہونا کیا تھا۔ اس سے اپنی خوبصورتی اور جوانی سنبھل نہیں سکی' اور ایک دن اس نے اماں کو اپنے ماں بننے کی اطلاع دے دی۔ کیا قیامت تھی جو ہم پر اور اماں پر گزری۔''

میرے دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے۔ ''ماں بننے کی اطلاع۔'' میں نے زیرلب کہا۔

''اور پھر صبح گھر چھوڑ گئی۔ اچھا ہی کیا۔ میری اپنی بیٹی ہوتی تو ذبح کر دیتی میں اسے۔''

''اس نے باپ کا نام بتایا؟'' مجھے اپنی آواز کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

اچانک اس تاریک رات کا ایک ایک منظر واضح ہوگیا۔ جب برستی بارش میں وہ سڑک کے کنارے ایستادہ بوڑھے درخت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

''صادق پروین کا بیٹا۔'' انہوں نے بھرپور یقین اور اعتماد سے کہا۔

میرے سینے میں رکی سانس باہر نکلی۔ وہ کوئی بھی ہوسکتا تھا۔ صادق بھی اور ارسلان بھائی بھی۔ یہ ممکن تھا کہ وہ ارسلان بھائی کے ہتھے چڑھ گئی ہو' اور اب آنٹی اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے صادق کا نام استعمال کر رہی ہوں' اور وہ صادق بھی ہوسکتا تھا' جب میں آسیہ سے ملا تھا تو خوف کے باعث اس کا ایسا عالم تھا کہ اگر صادق بھی اسے نفسیاتی سہارا فراہم کرتا تو وہ اس کی جانب مائل ہوسکتی تھی۔ کم از کم میرا یہی خیال تھا۔

''اور پھر جو لڑکی ایک مرتبہ اپنی حفاظت نہ کر سکی' وہ آئندہ بھی بے بس ہوسکتی تھی۔'' میں نے سوچا۔

مگر یہ بات بہرحال افسوس ناک تھی۔

''اماں جان کے سینے پر بہت بڑا زخم لگا گئی آسیہ' بس اس کے بعد وہ سنبھل ہی نہیں سکیں۔'' آنٹی کہہ رہی تھیں۔

''اور آسیہ کی کوئی خیر خبر؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ایک دن اچانک ڈاک میں اس کی دو تصویریں آئی تھیں' ایک میں وہ دلہن بنے ہوئے تھی۔ ساتھ میں اس کا شوہر بھی تھا' اور دوسری تصویر اپنے بیٹے کے ساتھ تھی۔ اماں ہم سے چھپ کر ان تصویروں کو سینے سے لگائے رکھتی تھیں اور روتی تھیں' کبھی زیرلب کہتیں۔

''اللہ تجھے خوش رکھے آسیہ۔''

''اور بس بہت دکھ دیا اس لڑکی نے ان تصویروں کے بعد اس کی طرف سے اور کچھ نہیں آیا۔ پتا نہیں زندہ ہے یا مرگئی لیکن میرے لیے وہ اسی دن مرگئی تھی' جس دن اس نے اپنے ماں بننے کی خبر سنائی تھی۔''

''اس کی تصویریں کہاں ہیں آنٹی؟''

''اماں جان کی صندوقچی میں رکھی ہیں۔ تمہارے انکل وہ صندوقچی اپنے پاس ہی رکھتے ہیں۔''

''میں دیکھ سکتا ہوں وہ تصویریں؟''

آنٹی مجھے اندر لے آئیں۔ بیڈ روم میں بندھے ہوئے سامان کے بیچ ایک چھوٹی سی صندوقچی بھی تھی۔ آنٹی نے اس کا ڈھکن کھول دیا۔ اندر بہت سلیقے سے چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ دادی اماں کی جاء نماز تہہ کر کے سب سے نیچے بچھائی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر ان کی سفید چادر' تسبیح' سرمہ دانی' اور کنگھی وغیرہ رکھی تھیں۔ انہی چیزوں کے بیچ ایک سفید لفافے میں وہ تصویریں بھی تھیں۔ آنٹی نے نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیں۔

دلہن بنی وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی اور اس کے ساتھ اس کا خوبرو شوہر جو مسکرا رہا تھا جیسے اپنی قسمت پر رشک کر رہا ہو۔ دوسری تصویر میں آسیہ نے ایک گول مٹول ننھا منا سا گورا بچہ اٹھا رکھا تھا۔

ممتا کا نور اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے تصویر پلٹ کر دیکھی وہاں مختصر سی تحریر تھی۔

''میری پیاری بڑی اماں!''

''میرے بیٹے کامران کے لیے دعا کرتی رہنا۔''

''اسے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔''

نیچے بچے کی تاریخ پیدائش درج تھی دوسری تصویر اُلٹ کر دیکھی' اس کی پشت پر ایک لفظ بھی درج نہیں تھا۔

دونوں تصویریں واپس لفافے میں ڈال کر میں نے لفافہ واپس صندوقچی میں رکھ دیا۔

میرے دل میں ایک اطمینان ضرور تھا۔ بچے کی تاریخ پیدائش سے پتا چلتا تھا کہ...... کم از کم برسوں پہلے بیتی اس رات سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرے اندر وہ جو چھوٹا سا کانٹا تھا۔ جو کبھی کبھار چبھ جاتا تھا اب اس کی تکلیف بھی جاتی رہی تھی۔

پندرہ دن بعد سارہ سے شادی کے بعد کم از کم ایسی کوئی تلخی میری زندگی میں زہر بن کر نہیں گھل سکتی تھی۔

مگر اس کے باوجود یہ تمام تر صورتِ حال افسوس ناک تھی' دل سے ایک بوجھ ہٹ گیا

تھا تب بھی اور بہت سے بوجھ تھے میں جو ہر دم تبدیلی کا خواہاں رہتا تھا۔ اتنی اچانک اور بہت سی تبدیلیوں سے بوکھلا گیا تھا۔ اس گھر کے ویران در و دیوار میں ایک پل بھی گزارنا میرے لیے ناممکن تھا۔

اور پھر انکل آنٹی کے روکنے کے باوجود بھی میں وہاں نہیں رُکا۔ انہوں نے چاہا کہ میں ان کا نیا گھر دیکھ جاؤں' مگر میں نے بہانا بنالیا۔ ان کے نئے گھر میں میرے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ میرے بچپن کی یادیں جن اینٹوں کے ساتھ لپٹی تھیں۔ جب ان میں ویرانیوں نے ڈیرا جما لیا تھا تو اور کچھ دیکھ کر کیا کرنا تھا۔

سارہ میری زندگی میں آ گئی۔ مصروفیات میں اضافہ ہو گیا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ گھونسلا بنانے اور تنہا رہ جانے والوں کے بارے میں سوچتا۔ یا پھر بارش میں بھیگتی اس تاریک رات کا کوئی لمحہ میرا دامن پکڑتا۔ یہاں اپنے ہی بہت بکھیڑے تھے۔ بس ایک روز خبر ملی کہ انکل فوت ہو گئے ہیں۔ میں ایک انکوائری میں پھنسا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ بعد پتا چلا کہ آنٹی بھی گزر گئیں۔ ان دنوں سارہ سے بیرون ملک جانے کا بہت پرانا کیا ہوا وعدہ پورا کرنا تھا' اور یہ اطلاع جانے سے چند گھنٹے پہلے ملی تھی۔ اس کے بعد کسی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔

میں اپنے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ سارہ کی بہت خواہش تھی ماں بننے کی۔ مجھے بچوں کی کچھ ایسی جلدی نہیں تھی۔ جب خیال آیا کہ اب بچے ہو جانے چاہئیں تو ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ اس نے اطلاع دی کہ سب نارمل ہے بس اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیر ہے تو میں مطمئن ہو گیا۔

مگر ممی کو بہت خواہش تھی دادی بننے کی۔ اور وہ سارہ کے سامنے بعض اوقات اپنی خواہش کا اس طرح اظہار کرتی تھیں کہ وہ شدید ذہنی تکلیف میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ پھر بھی چپ رہتی تھی۔ سارہ سے بڑھ کر اچھی بیوی شاید کسی کو بھی نہیں مل سکتی۔ اس کے لیے اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک بہترین عورت ہے۔

جب بچوں کے لیے میری خواہش بھی بہت بڑھی اس وقت پتا چلا کہ سارہ کو کینسر ہے۔

ممی نے دوسری شادی کے لیے زور دیا مگر میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ بستر مرگ پر سارہ کو اس صدمے سے دوچار کرتا۔

اور پھر ایک دن وہ بہت خاموشی کے ساتھ مجھ سے دور چلی گئی' مجھے لگا میں پاگل ہو جاؤں گا۔

مگر کوئی کب کسی کی یاد میں پاگل ہوا کرتا ہے' میں بھی سنبھل گیا۔ پھر وہی دن رات تھے' وہی آفس تھا' گھر تھا' ہاں تنہائی اور سناٹا بڑھ گیا تھا۔

ممی کی حالت بہت بری تھی۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور انہیں یہ دکھ چین نہیں لینے دیتا تھا کہ میرا گھر ادھورا تھا۔

ایسے میں ہی ایک دن میری ملاقات راحت سے ہوئی اور اس ملاقات نے پہلے محبت اور پھر شادی کی راہ ہموار کی۔

راحت کسی بھی طرح سارہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی' پھر بھی مجھے محبوب تھی۔ میں اطمینان بھری زندگی گزار رہا تھا کہ اچانک آج آسیہ آ گئی تھی۔ یا شاید وہ آسیہ نہیں مہرنگار تھی۔ بہر حال جو بھی تھی۔ میرے سامنے ماضی کے کتنے در کھول گئی تھی۔ اور آج میں سوچ رہا تھا کہ کیا وہ سو روپے جو میں نے آسیہ کی ہتھیلی پر رکھے تھے میرے افعال' جھوٹ اور وعدہ خلافی کی تلافی ہو سکتے تھے۔

رات کتنی دیر تک اسٹڈی میں بیٹھا' میں یہی سب سوچتا رہا۔

اگلے روز میں آفس سے گھر پہنچا تو راحت کا موڈ آف تھا۔

''میں اس لڑکی مہرنگار کے قریب نہیں رہ سکتی۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

''یہ لڑکی میرے اعصاب پر سوار ہو رہی ہے اس کا دیکھنے کا' مجھ سے بات کرنے کا انداز سب میری برداشت سے باہر ہے اور پھر گھر میں وہ جس طرح مالکانہ حقوق کے ساتھ گھوم رہی ہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کا سامان اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دوں۔ تم ان لوگوں سے کہو کہ کسی ہوٹل میں شفٹ ہو جائیں۔''

''کمال کرتی ہو تم بھی وہ بچی ہے چھوٹی' اور اسے تمہارے مزاج کی نزاکت کا اندازہ بھی نہیں ہے' یوں بھی میں نے خود ایپا کو گھر پر انوائٹ کیا ہے' اب میں انہیں ہوٹل میں شفٹ ہونے کے لیے نہیں کہہ سکتا۔''

''وہ اتنی چھوٹی بچی بھی نہیں ہے' اور تم اگر ان سے ہوٹل میں شفٹ ہونے کے لیے

نہیں کہو گے' تو میں کہہ دوں گی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اسلام آباد جانا ہے۔'' وہ بولی۔

''تم ایسا کوئی کام نہیں کرو گی۔ میں نے ان کے لیے ہٹ کا انتظام کیا ہے۔ ٹھنڈیانی میں وہ دو تین دن تک وہیں رہیں گے۔ اور ہم بھی ان کے ساتھ ہی رہیں گے۔ میں نے تین دن کی چھٹی بھی لی ہے۔''

راحت کو تو آگ ہی لگ گئی۔ ''میں کہتی رہی چھٹی کا اور تم نے چھٹی نہیں لی۔ اتنی زبردست پارٹی تھی ممی کی طرف سے' کتنا کہا تھا انہوں نے آنے کے لیے' مگر تم نے صاف انکار کر دیا تھا کہ کسی صورت چھٹی نہیں کر سکتے' اب تین دن کی چھٹی لے لی۔''

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ جب اس نے مجھ سے چھٹی لینے کے لیے کہا تب میں واقعی چھٹی نہیں لے سکتا تھا۔ اور اب بھی میں اس کے بغیر چھٹی نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ ٹھنڈیانی جانے کا فائدہ یہ تھا کہ اول تو میں ایپا سے اس بارے میں ذکر کر چکا تھا اور دوسرے کچھ عرصہ کے لیے میں سکون چاہتا تھا۔ جو یہاں آفس میں یا اسلام آباد کی پارٹیوں میں ملنا ممکن نہیں تھا۔

''اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی بوڑھا مت کرو۔'' راحت نے صاف کہہ دیا۔

اور بات یہاں تک پہنچی کہ وہ میرے بغیر ہی اسلام آباد کے لیے نکل گئی۔ اسے بھی ضد ہو گئی تھی کہ میں ایپا اور مہرنگار کے ساتھ ٹھنڈیانی کیوں جا رہا تھا اور اگر میں اس کی بات کو نظر انداز کر سکتا تھا تو وہ بھی میری بات کو نظر انداز کر سکتی تھی۔

ایپا کے سامنے میں نے بات بنائی۔

''دراصل راحت کی ممی کچھ بیمار تھیں' وہ معذرت کر گئی ہے' اگر جلدی آ سکی تو ہمیں ٹھنڈیانی میں جوائن کر لے گی۔''

''اوہو تم بھی چلے جاتے ہماری وجہ سے بندھ گئے ہم کسی ہوٹل میں رہ لیتے۔'' ایپا نے کہا۔

''کیسی باتیں کرتی ہیں ایپا۔ کتنی مدت کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ راحت بھی آ جائے گی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

ٹھنڈیانی کے پہاڑ برف سے ڈھکے ہوئے تھے اور ابھی مزید برفباری بھی ہونی تھی۔

جس ہٹ کا انتظام میں نے کیا تھا' الگ تھلگ سا تھا۔ چھوٹا اور آرام دہ ہم جیپ میں سامان

لے کر وہاں پہنچے' صفائی وغیرہ پہلے ہی ہو چکی تھی' ایک ملازم بھی موجود تھا۔

سارا راستہ مہر نگار خاموشی کے ساتھ جیپ سے باہر نظارہ کرتی رہی تھی۔ جبکہ میں اور اپیا محوِ گفتگو رہے تھے' مجھے اس کے نہ بولنے سے الجھن ہو رہی تھی' جیسے آسیہ کے خاموش رہنے سے ہوا کرتی تھی۔

آتش دان کے سامنے بیٹھ کر ہم کافی پی رہے تھے مہر نگار کافی کا مگ ہونٹوں سے لگائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

''بیٹا! آپ کیوں اتنی چپ چپ رہتی ہیں؟'' میں نے اسے بھی گفتگو میں شامل کرنے کے لیے کہا۔

اس کے ہونٹ بھنچ سے گئے۔ اور وہ کافی کا مگ میز پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ کے حق میں میرا خاموش رہنا ہی اچھا ہے۔'' اس نے انگریزی میں مجھے مخاطب کیا' اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں حیرت سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اپیا ایک دم پریشان ہو گئیں۔

''تم مائنڈ مت کرنا' مہر نگار ذرا ڈسٹرب ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

ہٹ زیادہ بڑا نہیں تھا اور مہر نگار اپیا کے ساتھ بالکل قریبی کمرے میں تھی۔ اپیا کی آواز مدھم تھی مگر مہر نگار کی آواز میں اپنی جگہ بیٹھ کر بھی بخوبی سن سکتا تھا۔

''ممی مجھے لگتا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ اس شخص سے کہیں کہ مجھے بیٹا' بیٹی جیسے کسی لفظ سے مت پکارے۔'' وہ شدید غصے میں کہہ رہی تھی۔

اپیا نے پھر کچھ کہا۔ جواباً مہر نگار کی آواز بھی مدھم ہو گئی۔

اس کے رویے نے مجھے حیران بھی کیا تھا اور سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کا کہنا۔

''آپ کے حق میں میرا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔''

کیا معنی رکھتا تھا؟ میرا اس کا کیا واسطہ تھا کہ اس کی خاموشی یا گفتگو مجھ پر اثر انداز ہوتی؟ اور پھر میرے ایسے اندازِ تخاطب میں کیا برائی تھی کہ وہ اس قدر غصے میں بھری پڑی تھی؟

میری چھٹی حس مجھے کچھ بتا رہی ہے' وجدان کچھ کہہ رہا تھا' جسے میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اپیا کمرے سے آ گئیں۔ وہ واضح طور پر مضطرب اور پریشان تھیں آتے

کے ساتھ انہوں نے مجھ سے مہر نگار کے رویے کے بارے میں معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں بچے تو کرتے ہی ہیں اس طرح' ان کے اپنے مزاج ہوتے ہیں ممکن ہے میری کوئی بیٹی ہوتی تو وہ بھی کبھی اسی طرح ناراض ہو جاتی۔'' میں نے اس طرح کہا جیسے مہر نگار کا یہ رویہ کسی خصوص توجہ کا مستحق نہ ہو۔

اپیا نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر لمحہ بھر کو آنکھیں موند لیں۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولیں۔ ''میرے لیے مہر نگار سب سے اہم ہے۔''

اس لمحے مجھے شدت سے احساس ہوا کہ اپنی اولاد کے بغیر میرے اندر کتنا خلا تھا۔ وہ محبت جو اپیا کے لہجے میں مہر نگار کے لیے تھی۔ میری اولاد ہوتی تو شاید' اپنے بچوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے میرے لہجے میں بھی اس کی ہلکی سی آنچ اتر آتی مگر شاید محبت کا یہ رخ میری قسمت میں نہیں تھا۔ میں نہیں کہنا چاہتا تھا مگر رہ نہیں سکا۔

''اپیا آپ خوش قسمت ہیں کہ اتنی پیاری بیٹی کی ماں ہیں۔ اولاد بہت بڑی خوشی ہوتی ہے۔'' میرے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی حسرت کا رنگ نمایاں ہو گیا تھا۔

''سہیل! کچھ لوگ واقعی بدقسمت ہوتے ہیں' مگر زیادہ تر ایسے ہوتے ہیں' جو اپنے ہاتھوں سے قسمت کا دروازہ خود پر بند کر دیتے ہیں۔''

میں ان کی بات سمجھ نہیں پایا تھا لیکن میں نے کریدا نہیں۔

مہر نگار اپنے بیڈروم میں ہی تھی' ہم کھانا کھانے بیٹھے تب بھی وہ باہر نہیں آئی۔ اپیا مجھ سے معذرت کر کے اس کے لیے کھانا بیڈروم میں ہی لے گئیں۔

میں کھانا کھاتے ہوئے سوچتا رہا کہ کوئی بات ضرور تھی جسے اپنے ذہنی انتشار کے باعث میں سمجھ نہیں پا رہا تھا یا پھر اسے نظر انداز کر دینا چاہتا تھا کہ اسی میں بھلا تھا۔ میں اپیا سے مہر نگار اور آسیہ کے درمیان موجود حیرت انگیز مماثلت کے بارے میں استفسار کرنا چاہتا تھا۔ مگر تہذیب کے تقاضوں کے باعث کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ خود بتا دیتیں یہ الگ بات تھی' مگر اس بارے میں کریدنا انتہائی غیر مہذب بات تھی۔

میرے ذہن میں بار بار آسیہ کی وہ تصویر آ رہی تھی۔ جس میں اس نے اپنے بیٹے کامران کو اٹھا رکھا تھا۔ اور اس پر درج تاریخ پیدائش کے مطابق بچے کو بارہ سال کا ہونا چاہیے تھا۔ پھر دادی اماں کی تاریخ وفات کا خیال آ رہا تھا۔ آنٹی نے بتایا تھا کہ انہوں نے

آسیہ کے ماں بننے کی خبر کا ایسا زخم اٹھایا تھا کہ پھر وہ سنبھل نہیں سکیں۔ ان کی تاریخ وفات اور کامران کی تاریخ پیدائش قریب قریب ہی تھیں۔ میں یہ نہیں پوچھ سکا تھا کہ آسیہ نے یہ بات دادی اماں کو کب بتائی تھی۔ مگر میرا قیاس تھا کہ ایسا دادی اماں کی وفات کے قریب قریب ہی ہوا ہوگا۔ کہ یہی صدمہ ان پر اس قدر اثر انداز ہوا کہ وہ زندگی سے بھی روٹھ گئیں۔

یہ باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن مہر نگار کی آسیہ سے غیر معمولی مشابہت نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

میں نے دانستہ مہر نگار کو نظر انداز کر دیا۔ اس بارے میں میں زیادہ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ میرا وجدان کہہ رہا تھا کہ اس بارے میں کچھ نہ کر پانا' کچھ نہ جاننا ہی میرے لیے بہتر تھا۔ وہ خاموش رہتی تو میں کبھی اسے گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ وہ کھانا نہیں کھاتی تھی تو بطور میزبان بھی میں اس سے اصرار نہیں کرتا تھا۔

لیکن نہ جانے کیوں میں اس کے لیے اپنے دل میں ایک عجیب سی محبت محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ محبت میرے لیے بالکل نئی تھی' اور اس کا مفہوم بالکل جدا تھا۔ ایک عجیب سی کشش تھی اس میں' میرا شدت سے دل چاہتا تھا کہ میں اسے پیار کروں اور اس کا خیال رکھوں' وہ مجھ سے فرمائش کرے' اور میں اس کی فرمائش پوری کروں۔ اسے وہ سب دوں جو ایک باپ اپنی بیٹی کو دے سکتا ہے۔

اپنی اس محبت پر مجھے حیرت بھی ہوتی تھی۔ آخر گڑیا کے بچے بھی تو تھے اور میں ان سے بہت محبت بھی کرتا تھا لیکن ایسی محبت نہیں۔ پھر مہر نگار میں ایسی کیا بات تھی؟ جب میری سوچ یہاں تک پہنچتی تھی' اسی وقت میں اپنی توجہ کسی دوسری جانب مبذول کر دیتا تھا۔ اس سے آگے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا وجدان مجھے خوف زدہ کر رہا تھا۔

مہر نگار نہا کر نکلی تو بہت نکھری نکھری لگ رہی تھی' لمبے خوبصورت بالوں سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ سیاہ جینز اور سیاہ کھلے سے سویٹر میں ملبوس ہونے کی وجہ سے اس کی گوری رنگت زیادہ نمایاں ہو رہی تھی۔ میں ایپا کے ساتھ ان کے بیڈ روم میں داخل ہوا تو وہ بستر پر ڈھیر ساری جیولری بکھیرے اس میں سے کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

''ممی! میرا بلیک پرلز والا بُندا نہیں مل رہا۔'' اس نے مجھے نظر انداز کر کے ایپا کو مخاطب کیا۔

''بیٹا! تم اپنی چیزیں دھیان سے نہیں رکھتیں۔ دیکھو جیولری بکس میں ہی تو نہیں رہ گیا!'' ایپا نے کہا۔

''نہیں' وہ تو میں نے سارا اُلٹ دیا تھا۔ یہاں۔''

''پھر بیگ میں دیکھ لو وہاں نہ ہو۔''

''وہاں بھی نہیں ہے۔ وہ میرے لیے پاپا کتنے پیار سے لائے تھے۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

میرے اندر خلا بڑھنے لگا۔ بیٹیاں والدین سے کس قدر محبت کرتی ہیں' کاش میری بھی کوئی بیٹی ہوتی جو اس طرح میرا ذکر کرتی' اور جس کے لیے میں اسی طرح محبت سے کچھ لاتا۔ یہ خلش اس قدر بڑھی کہ بالکل بے اختیاری میں' میں اس کے قریب ہی بستر پر جا بیٹھا اور بولا۔

''میں بھی تلاش کرتا ہوں ممکن ہے مل جائے۔''

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا' مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ میں اس کی جیولری ترتیب سے رکھنے لگا۔ میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ مگر میں نے خود کو یونہی تسلی دی۔

''دراصل اب اولاد کے لیے میرا دل اس شدت سے مچلنے لگا ہے کہ مہر نگار اپنی بیٹیوں کی طرح لگنے لگی ہے' ورنہ میرا اور اس کا کیا واسطہ یہ صرف میرے اندر کا خلا ہے' جو اس کے لیے پدرانہ محبت کے جذبات اُبھارتا ہے۔''

سیاہ موتیوں کا ایک بُندا مجھے ان ڈھیر سارے زیوروں میں نظر آیا۔ میں نے اُٹھالیا۔

''یہ تو نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو ہے دوسرا نہیں مل رہا۔'' اس نے کہا۔

''رہنے دو پھر۔ شاید لاہور میں ہی رہ گیا ہو' نہ ملا تو تمہارے پاپا نیا دلوا دیں گے۔'' ایپا نے کہا۔ ''ابھی کچھ اور پہن لو۔''

ایپا بات کر رہی تھیں کہ میری نگاہ سونے کی ایک بھاری سی چین پر پڑی۔ مہر نگار کے زیوروں میں وہ الگ سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے زیور جدید تھے اور نازک' جبکہ وہ زنجیر لمبی بھی تھی اور بھاری بھی میں نے اسے اُٹھالیا۔ اس چین میں کچھ تھا' جو چند لمحے مجھے یاد نہ آ سکا۔ پھر اچانک جیسے ذہن میں جھماکہ سا ہوا۔

''یہ تو وہی چین ہے' جو میں نے آسیہ کو دی تھی۔'' میں نے سوچا۔

بے اختیار میری نگاہ مہر نگار کی طرف اُٹھی' وہ ایک ٹک میری جانب دیکھ رہی تھی۔

''یہ آپ کی چین ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری ماں کی ہوئی' میری ہوئی' ایک ہی بات ہے۔'' اس نے میری جانب ویسے ہی دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہاری ماں کی؟'' میں نے مدھم سی آواز میں کہا۔

کتنے خدشے' کتنے وہم' کتنے سوال اور کتنے خیال میرے ذہن میں اُبھرنے لگے۔

''آپ کو اچھی لگی ہو تو بے شک لے لیں۔'' وہ یقیناً میرے ردِعمل کا جائزہ لے رہی تھی۔

''نہیں' شکریہ۔'' میں نے چین واپس بستر پر رکھ دی' اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

اپیا ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے مضطرب سی ہماری جانب ہی دیکھ رہی تھیں۔

میں دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ تو وہ بھی میرے ساتھ ہی آ گئیں۔ میرا ذہن پریشان ہو گیا تھا' وہ چین رہ رہ کر میرے ذہن میں چبھ رہی تھی اور پھر میرے سوال پر مہر نگار کا دیا ہوا جواب۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ وہی چین تھی جو میں نے آسیہ کو دی تھی۔

''یہ میرے وعدے کی نشانی اور میری محبت کی گواہی ہے۔ مجھ پر اعتبار کرنا۔'' میں نے اس کے گلے میں وہ چین ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

کافی دیر کے بعد مہر نگار بھی اپنے بیڈروم سے نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں کہانی کی کوئی کتاب تھی۔ صوفے پر ٹانگیں اوپر کر کے وہ کتاب پڑھنے میں مگن ہو گئی۔ اپیا مجھے اپنے باقی بہن بھائیوں اور ان کے بچوں کے بارے میں بتانے لگیں۔ میں بھی بظاہر پوری توجہ سے ان کی باتیں سن رہا تھا لیکن میرا ذہن مہر نگار اور آسیہ میں ہی بھٹک رہا تھا۔ میرے اندر سے آواز آ رہی تھی کہ مجھے اس بارے میں کریدنا نہیں چاہیے' سوچنا نہیں چاہیے۔ اور میں زبردستی خود کو روکے ہوئے تھا۔ ذہن میں آنے سوالات کے ہجوم کو پیچھے دھکیل رہا تھا۔ سوچوں پر پہرے بٹھا رہا تھا۔

''امی اور ابا جی کے بعد ہم نے اس مکان کا کیا کرنا تھا۔ ارسلان ہی جہلم رہتا تھا سو اسی

کو دے دیا۔ اس کے بچے بھی ماشاءاللہ بڑے ہو گئے ہیں۔'' اپیا بتا رہی تھیں۔

اسی وقت مہر نگار نے کہانی کی کتاب پٹخ دی۔

''کیا ہوا مہر؟'' اپیا گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ممی! بہت گھٹن ہے یہاں۔'' اس نے کہا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت سخت اَپ سیٹ تھی۔

پھر اس سے قبل کہ اپیا کچھ کہتیں اس نے اُٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ ہوا کا ایک ٹھنڈا تیز جھونکا کمرے میں آیا اور اس کے سنہری مائل بھورے بال بکھر گئے۔

اپیا نے تیزی سے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ ''مہر بیٹا! بیمار ہو جاؤ گی۔ چلو میرے ساتھ کمرے میں۔''

وہ اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئیں۔ آپس میں ان کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی' لیکن میری سماعت تک کوئی لفظ بھی نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ حالانکہ میں وہ تمام تر گفتگو سننا چاہتا تھا۔ پھر چند لمحوں بعد مجھے اندازہ ہوا کہ مہر نگار رونے لگی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا رونا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی دل چیر رہا ہو۔

وہ اَپ سیٹ تھی' مجھے یاد تھا کہ جب میں جہلم گیا تھا تو آسیہ بھی بہت اَپ سیٹ تھی' اور میرا دل دعا کر رہا تھا کہ ان دونوں کی پریشانی کی وجہ ایک سی نہ ہو۔

اس رات میں دیر تک اسی اذیت کا شکار رہا۔ آخر مہر نگار کی گھٹن کی وجہ کیا تھی۔ اور وہ روتی تھی۔ پریشان ہوتی تھی تو میرے دل کی کیفیت ایسی کیوں ہو جاتی تھی' اسے دیکھ کر میرے اندر کا خلا کیوں بڑھنے لگتا ہے' اور وہ مجھ سے اتنی اُکھڑی اُکھڑی کیوں رہتی ہے؟ اور پھر وہ چین اس کے پاس کہاں سے آئی تھی؟ اس کی اور آسیہ کی حیرت انگیز مشابہت کی وجہ کیا تھی؟

اور کتنا کچھ تھا سوچنے کے لیے' میں کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتا تھا لیکن کتنی ہی سوچیں جونک کی طرح میرے ذہن سے چمٹی ہوئی تھیں' اور میں کسی ایک پر بھی اپنی توجہ مرتکز نہیں کر رہا تھا۔ اس عمر میں نجات کا ایک ہی ذریعہ ہوتا ہے' نیند کی گولی' سو میں بھی ویلیم لے کر سو گیا۔

اگلے روز مجھے کچھ کام سے ایبٹ آباد جانا پڑ گیا۔ وہ یوں بھی ٹھنڈیانی میں ہمارا آخری دن تھا۔ اگلے روز صبح ہمیں واپس چلے آنا تھا۔ کام نمٹاتے اور واپس ٹھنڈیانی آتے ہوئے

مجھے شام ہونے لگی تھی۔

ہٹ میں پہنچا تو وہاں کچھ اہتمام دکھائی دیا۔ درمیانی کمرے میں چائے کے کچھ لوازمات سجے ہوئے تھے اور سب سے نمایاں بلیک فارسٹ کیک تھا۔

ایپا بھی اچھے طریقے سے تیار تھیں' اور مہرنگار تو ہمیشہ سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ ویلویٹ کی سیاہ بغیر آستینوں والی قمیص اور تنگ گھیر والی شلوار میں بال کھولے نازک سے زیور پہنے وہ وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔

''آج تو بہت اہتمام کیا ہے' کوئی خاص وجہ ہے کیا؟'' میں نے بیٹھتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔

''مہر کی سالگرہ ہے آج۔ ہم ہمیشہ ہی مناتے ہیں۔'' ایپا نے کہا۔

''تو پھر... یہ منہ بسورے کیوں بیٹھی ہے۔'' میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ منہ پھیر کر بالوں کی لٹ کو انگلی پر لپیٹنے لگی۔

''اس کے پاپا نہیں ہیں ناں یہاں۔'' ایپا کے لہجے میں عجیب سے وہم تھے۔

''تو بیٹا! میں تو ہوں۔ اگر میری کوئی بیٹی ہوتی تو آپ کی طرح ہی پیاری سی ہوتی۔ تھوڑی دیر کے لیے آپ میری بیٹی بن جائیں۔'' میرے اندر کی حسرت خود ہی بول پڑی۔

مہرنگار نے میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ نیلی آنکھوں میں نمکین پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ بہت ضبط کر رہی تھی۔

میں سمجھا کہ وہ اقبال بھائی کو مس کر رہی تھی' ماحول کو بہتر بنانے کے لیے میں نے کیک اپنے قریب کھسکا لیا۔

''ہوں۔'' میں اس کے اوپر لکھا فقرہ پڑھ رہا تھا۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو می۔ مہر

''یہ کیک مہر نے خود بیک کیا ہے۔'' ایپا نے بتایا۔

''پھر تو بہت ہی لذیذ ہوگا۔ اور آج آپ کتنے برس کی ہوگئیں؟''

''پندرہ۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

میں نے اس بات پر کوئی زیادہ توجہ نہیں دی۔ ''آپ نے بتایا ہوتا میں آپ کے لیے کوئی تحفہ ہی لے آیا ہوتا۔''

''آپ کے دیئے تحفے میری ماں کے حوالے سے مجھے مل گئے ہیں۔'' آنسوؤں کا گولہ

سا اس کے حلق میں پھنسا ہوا تھا۔

میرے دل میں پھر خدشات اور وہم سر ابھارنے لگے۔

''نہیں' جو میں سوچ رہا ہوں وہ ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے خود کو مضبوط بناتے ہوئے سوچا۔

آنسو اس کے گال پر ڈھلک آئے تھے' میں نے ایپا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے بے بسی سے منہ پھیر لیا۔

''نہیں' جو میں سوچ رہا ہوں۔ وہ بالکل غلط ہے۔'' میں نے خود کو پھر دلاسا دینا چاہا مگر میں ایک لمحے میں اندر سے کمزور ہونے لگا تھا۔ ''پندرہ سال یعنی بارہ دسمبر 1980ء یعنی بہت برس بیت گئے تھے' مگر پھر اچانک مجھے وہ دن وہ تاریخ سب یاد آ گئے۔ دل ہی دل میں جلدی جلدی حساب لگانے لگا۔

وہ اپنے صوفے سے اٹھ کر میرے قریب آ گئی' اور میرے بالکل سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنی ہتھیلی میرے سامنے پھیلا دی' سونے کی وہ زنجیر اور سو روپے کا پرانا ٹیپ لگا نوٹ اس کی گوری ہتھیلی پر پڑے ہوئے تھے۔

میں بے یقینی سے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ وہ دونوں چیزیں دیکھ رہا تھا' میرے بدترین خدشات درست ثابت ہوگئے تھے۔

''یہ وہ چیزیں ہیں جو دکھائی دیتی ہیں' کچھ وہ تحفے بھی ہیں جو دکھائی نہیں دیتے وہ زخم جو آپ لوگوں نے مجھے دیئے اور جنہیں میں کسی کو دکھا بھی نہیں سکتی۔'' وہ اب بھی ضبط کرنا چاہ رہی تھی۔

''مہرنگار میری بیٹی۔'' میرے ہونٹوں سے سرگوشی کی صورت میں الفاظ ادا ہونے۔ اس لمحے میں سب کچھ بھول گیا تھا یہ کہ میں کون تھا' میرے اردگرد کوئی تھا کہ نہیں۔ بس اس وقت میرے لیے صرف میری بیٹی ہی میرے جذبات تھے' میرے اندر کی تڑپ اور خلا تھا۔

میں نے چاہا کہ اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھا لوں' اسے اپنے ساتھ لپٹا لوں' اسے پیار کروں وہ جو میری اپنی بیٹی تھی کتنی تشنگی تھی میرے اندر۔

لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔

''نہیں۔'' اس کے انداز میں وحشت تھی۔ ''میں تھوڑی دیر کے لیے آپ کی بیٹی نہیں بنا

چاہتی۔ کیا آپ ہمیشہ کے لیے مجھے اپنی بیٹی بنائیں گے؟ سب کے سامنے کہیں گے کہ میں آپ کی بیٹی ہوں؟ مجھے اپنے گھر میں جگہ دیں گے۔''

اپیا نے مہرنگار کو کندھوں سے پکڑ لیا۔ ''تم جو کچھ مانگ رہی ہو' وہ تمہیں کوئی نہیں دے سکتا' میری بات سمجھو مہر۔ تمہیں وہی زندگی گزارنی ہے جو تم گزارتی آ رہی ہو' کیا میرے اور اقبال کے پیار میں' ہماری محبت میں کوئی کمی ہے؟''

اپیا بھی رو پڑیں' مگر مہرنگار اب بھی سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اپنی بیٹی کو اپنے آغوش میں چھپا کر اس کا برسوں کا دکھ ختم کر دوں۔ اپنی تشنگی مٹا دوں۔ میں جو اولاد کے لیے ترس رہا تھا کتنا بے خبر تھا۔ میری بیٹی اپیا کے گھر تھی۔ اور میں یہ تک نہیں جانتا تھا کہ کہیں اس دنیا میں میری اپنی بیٹی بھی ہے۔

میں کہنے لگا تھا۔ ''ہاں' تم میری بیٹی ہو' میں سب کے سامنے یہ اظہار کر سکتا ہوں۔ سب کو بتا سکتا ہوں' کہ یہ گڑیا سی لڑکی میری بیٹی ہے' میری اپنی بیٹی ایک گھر کیا میرا سب کچھ تمہارا ہے' میں کتنا بدقسمت تھا کہ تمہارے وجود سے اب تک بے خبر رہا۔''

لیکن اسی لمحے دماغ نے روک دیا۔ میری سوشل اسٹینڈنگ (Social Standing) میرا عہدہ' ترقی کے خواب' راحت' حلقہ' احباب' یہ سب میرے راستے میں آ گئے۔ وہ ایک رات جس پر اب تک تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ میرے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ جاتا' جسے میں کبھی بھلا نہیں سکتا تھا' سب کو کیا کہتا میں؟ اس رات اور ان لمحات کا کیا حوالہ دیتا میں۔ لوگوں کی تمسخرانہ نگاہیں' سوشل سرکل کی گوسپ اور بہت کچھ تھا جس نے مجھے روک دیا۔ میں سب کے سامنے کیسے اپنے گناہ کا اقرار کر لیتا۔ یہ پتھر بہت وزنی تھا۔ جسے اٹھانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

مہرنگار ایک تک میری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں مایوسی اتر آئی۔

''کہہ دوں یا نہیں کیا حرج ہے یہ کہہ دینے میں آسیہ بھی منہ سے کچھ نہیں بول سکی تھی۔

مگر جواب پھر بھی مجھ تک پہنچ گیا تھا۔''

اپیا نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''بیٹا!'' میں نے کہنا شروع کیا تو مجھے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔ ''میں تمہارا باپ ہوں اور میں یہ مانتا ہوں' میں تم سے ملنے' تمہیں دیکھنے آتا رہوں گا۔ یہ رشتہ تو کسی

صورت نہیں ٹوٹ سکتا۔''

''نہیں۔ کسی بھی صورت نہیں میں اب کبھی تمہاری صورت نہیں دیکھوں گی۔''

''میری بات سنو بیٹا!''

''کہنے کو اب تمہارے پاس کیا ہے' میں یہاں آنے والی تھی تو کتنا کچھ سوچا تھا میں نے' کتنے سوال' کتنے خواب' کتنی حسرتیں تھیں میرے اندر' آج سب کچھ ختم ہو گیا۔ بس ایک سوچ باقی ہے' یہ کہ میری کوئی شناخت نہیں' میں صرف چند سیاہ لمحوں کی نشانی ہوں۔ اس سے آگے کچھ نہیں لیکن یاد رکھنا تم بھی آج اسی لمحے مر گئے ہو قدرت کوئی سزا تو تمہیں بھی دے گی ناں۔ تم بھی میری طرح ہمیشہ بے شناخت رہو گے۔ اولاد ہوتے ہوئے بھی ترستے رہو گے اور ساری عمر ان سیاہ لمحوں کا ماتم کرتے رہو گے' جن کا ماتم میں کر رہی ہوں۔

آہستہ آہستہ میں بھی زندگی اور اس کی خوشیوں کی طرف پلٹ آؤں گی۔ یہ زندگی ہے اسے یونہی گزارنا ہے' میرے زخم میرے اپنے ہیں' میرے دکھ صرف میرے ہیں' میں ان کے ساتھ زندہ رہوں گی' کیونکہ مجھے اپنی مما' پاپا کے لیے زندہ رہنا ہے' خوش رہنا ہے' وہ جن سے میرا کوئی رشتہ نہیں پھر بھی وہی میرے لیے سب کچھ ہیں۔ جب میرے باپ اور میری ماں کے سامنے مصلحتیں آڑے آ گئیں تب بھی ممی' پاپا ثابت قدم رہے' کتنے دکھ برداشت کیے انہوں نے میری خاطر' کتنی طعنے ملے پھر بھی مجھے خود سے جدا نہیں کیا۔ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں اس معاشرے کا بوجھ اور سیاہ دھبہ ہوں۔''

☆======☆======☆

میں نے اپنی زندگی کا وہ باب بند کر دیا جس کی تلاش میں' میں نکلی تھی' اپنی زندگی کے وہ ورق پڑھے جو میری کتاب زندگی کا حصہ ہوتے ہوئے بھی میری نگاہوں سے اوجھل تھے۔ میں نے سوچا۔

''مہر بیٹا! گھر آنے والا ہے اُٹھ جاؤ۔''

ممی نے پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ان کا خیال تھا کہ میں سو رہی تھی۔ میں سیدھی ہو بیٹھی۔ ہم گرجا چوک سے طفیل روڈ کی طرف مڑ رہے تھے۔ میں نے کار کے شیشے سے باہر جھانکا ٹریفک رواں دواں تھی۔

اسی وقت میری نگاہ ٹریفک کے بہاؤ میں چلتی موٹر سائیکل پر پڑی۔ جس پر شناسا

چہرے ہنستے مسکراتے ہمارے قریب سے گزر کر چلے گئے۔

''اسد' سعدیہ''میں نے زیرلب کہا۔

ہاں وہ اسد ہی تھا جو کل میرے قریب تھا' آج اس کے قریب سعدیہ ہے' میری کلاس فیلو۔

شاید کوئی اور وقت ہوتا تو میرے دل کو ٹھیس پہنچتی' لیکن آج یہ ایک عام سا واقعہ تھا۔

بھولی بسری ایک بات اچانک یاد آ گئی تھی۔ ممی نے کہا تھا۔

''تم دیکھنا ہنسی میں شریک ہونے والے لوگ بے شمار ہوتے ہیں لیکن جب تم دکھی ہوگی تو تمہارا درد بانٹنے کوئی دوست نہیں آئے گا۔ اس وقت صرف تمہارے ممی' پاپا ہوں گے جو تمہارا سہارا بنیں گے۔''

ٹھیک کہا تھا انہوں نے' میری خوشیوں اور میرے دکھ درد میں وہی میرے لیے سب کچھ تھے۔ میں نے اپنا سر ممی کے کندھے سے ٹکا دیا۔

☆=====ختم شد=====☆